قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2022 قیمت 15₹

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

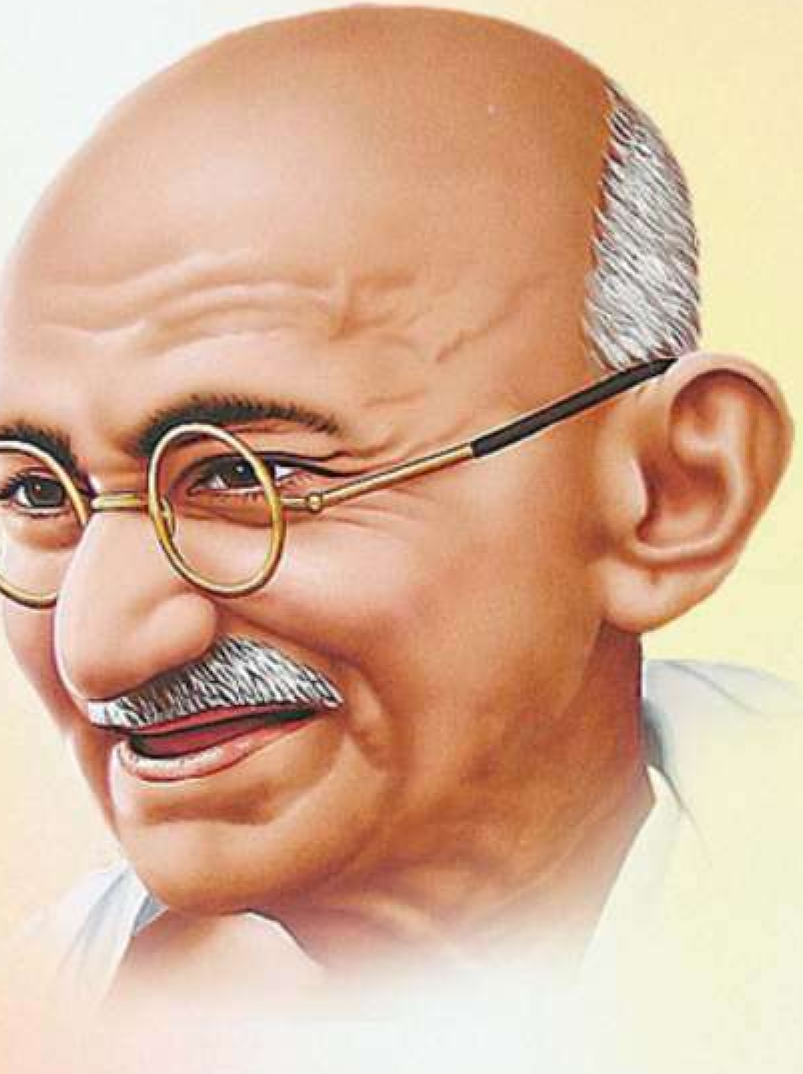

وقار مادرِ ہندوستاں تھے گاندھی جی

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

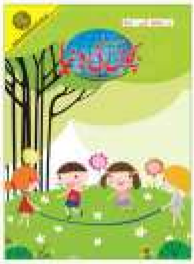

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 24، شمارہ: 10، اکتوبر 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات

بیسویں صدی میں اردو کے اہم سفرنامے — محمد معظم الدین 7

نفسیاتی تنقید، ردو قبول کی میزان پر — نصرت جہاں 11

مرد ادیبوں کی تنقید میں تانیثی رجحان — غزالہ فاطمہ 14

حنیف نقوی کی تذکرہ شناسی کے نمایاں پہلو — عائشہ ضیا 17

شمس الرحمٰن فاروقی کی سفارشات لغات روزمرہ کے حوالے سے — محمد نسیم 21

لعل و گہر

زندہ کلاسک اور زبیر شفائی کی شاعری — شعیب نظام 24

جدید غزل کا ایک معتبر نام فضا ابن فیضی — آفتاب احمد منیری 26

بچوں کے شفیع الدین نیر — محمد ارشد انصاری 28

صحرائے جمالیات کا تنہا قیس تکلیل الرحمٰن — انظر نبی ڈار 30

جہانِ دارا شکوہ

متصوفانہ اقدار اور دارا شکوہ کی شاعری — عبدالواسع 33

داراشکوہ اور اس کے ہمعصر صوفیا — فیاض احمد 37

زبان اور زمینی صورت حال

رسم الخط ہی زبان کی شناخت ہے — امیر نہٹوری 40

یاد گاندھی

نذیر بنارسی کی شاعری میں ذکر گاندھی — تمنا شاہین 43

خراج عقیدت

کرامت علی کرامت: ایک ہمہ جہت شخصیت — سعید رحمانی 45

تصوف

برصغیر ہند کی اولین خانقاہ اور اس کے کتبہ کی تاریخی اہمیت — محمد مظفور الحق انصاری 48

یادیں باتیں

دو ہمدم فرزانہ — عبدالحق 51

سلسلۂ صحافت

امداد صابری: حیات و خدمات — محمد مظاہر 53

سائنس

بیرونی سیاروں کی دریافت کس طرح کی جاتی ہے — انیس الحسن صدیقی 56

زبان و تعلیم

نظریہ تعمیریت اور سماجی علوم کی تدریس — شیخ وسیم شیخ شبیر 58

اعتراف کمال

بھارتی ڈاک ٹکٹ اور اردو قلمکار — اسمٰعیل وفا 61

عالمی ادبیات

گلستان سعدی — عتیق الرحمٰن 66

خصوصی گفتگو

اظہر عنایتی سے مکالمہ — ساجد جلال پوری 68

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 72

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ 85

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 86

ہماری بات

تحریک آزادی ہند کی تاریخ میں موہن داس کرم چند گاندھی کا نام امر رہے گا کہ انھوں نے برطانوی استعمار سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ انھوں نے بہت ساری اذیتیں، صعوبتیں، مشقتیں برداشت کیں۔ پھر بھی ان کے دل میں آزادی کا جذبہ موجزن رہا۔ انھوں نے آزادی کے لیے تلوار یا تشدد کا سہارا نہیں لیا بلکہ عدم تشدد کا راستہ اختیار کر کے انگریزوں کو اس ملک سے بھاگنے پر مجبور کردیا۔ یہی وہ فلسفہ تھا جس کی وجہ سے گاندھی جی کو پوری دنیا میں مقبولیت ملی۔ انھوں نے ستیہ اور اہنسا کا جو تصور دیا تھا وہ آج بھی ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

گاندھی جی کا وژن بہت وسیع تھا۔ چاہے اس کا تعلق سماج سے ہو، سیاست سے ہو، ثقافت سے ہو یا زبان سے ہو۔ ان کے نظریے میں کسی طرح کی محدودیت نہیں تھی بلکہ ان کا تصور آفاقیت پر مبنی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے برسوں کے باوجود گاندھی جی کے افکار و تصورات زندہ ہیں۔ کیونکہ ان کے افکار کی بنیادیں نہ صرف منطقی اصولوں پر مبنی ہیں بلکہ نہایت مضبوط اور مستحکم بھی ہیں۔ انھیں ہندوستان کی عظیم ترین تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، سماجی روایت کا گہرا ادراک تھا۔ اس لیے وہ ہندوستانی وراثت کے تحفظ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ گاندھی جی ہر طرح کے مذہبی، طبقاتی، تعصبات اور تحفظات کے سخت خلاف تھے۔ وہ ہمیشہ ہندوستان کے تمام طبقات کے درمیان اتحاد اور یکجہتی کی تبلیغ کرتے رہے اور اس کا اثر ہندوستانی عوام پر بھی پڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر مذہب سچائی کا راستہ دکھاتا ہے۔ اسی لیے مذہبی بنیاد پر اختلاف یا تنازعے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ وہ قطعاً نہیں چاہتے تھے کہ زبان، مذہب یا ثقافت کی بنیاد پر ہندوستانی قوموں کے درمیان نااتفاقی ہو۔ اس لیے وہ مذہبی، لسانی، تہذیبی اتحاد کی باتیں کرتے رہے۔ انھیں یہ پتہ تھا کہ ہندوستان ایک کثیر لسانی و ثقافتی ملک ہے۔ یہاں بہت ساری بھاشائیں ہیں اور ان میں ہمارے عظیم ملک ہندوستان کا علمی و ادبی سرمایہ محفوظ ہے۔ انھوں نے زبان کی بنیاد پر کسی بھی تفریق کو پسند نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے سنسکرت، تمل، عربی، فارسی، ہندی اور دیگر تمام زبانیں سیکھنے کی اس لیے ترغیب دی تاکہ ہندوستان کے تمام طبقات ایک دوسرے سے قربت محسوس کریں۔ وہ ہندوستان کو لسانی اور تہذیبی سطح پر ثروت مند بنانے کے خواہاں تھے اسی لیے انھوں نے زبان اور تہذیب کی سطح پر اتحاد کی وکالت کی۔ انھوں نے اپنے اخبار میں یہ لکھا تھا کہ ''ہر پڑھے لکھے ہندوستانی کو اپنی بھاشا ہندو کو سنسکرت، مسلمان کو عربی، پارسی کو فارسی اور سب کو ہندی جاننی چاہیے۔ کچھ ہندوؤں کو عربی اور کچھ مسلمانوں اور پارسیوں کو سنسکرت سیکھنی چاہیے۔ اُتر اور پچھم میں رہنے والے ہندوستانی کو تمل سیکھنی چاہیے مگر سارے ہندوستان کے لیے ہندوستانی ہونی چاہیے۔'' ایک جگہ اور بھی انھوں نے لکھا تھا کہ ''اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتا ہے تو انھیں اردو پڑھنی چاہیے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمانوں کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیے۔''

گاندھی جی نے اردو اور ہندی کی خلیج کو ختم کرنے کے لیے ہریجن سیوک کا اردو ایڈیشن جاری کیا تھا اور جب اردو ایڈیشن بند کرنے کی بات چلی تو انھوں نے ہندی ایڈیشن بھی بند کردیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی بھی زبان کے ساتھ تفریق یا تعصب روا رکھا جائے۔ خود گاندھی جی کا رویہ اس باب میں بہت وسیع تھا کہ وہ ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں دستخط کیا کرتے تھے اور اکثر اردو والوں کے خطوط کا جواب اردو ہی میں لکھا کرتے تھے۔ گاندھی جی ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی ترقی کے خواہاں تھے۔ ان کے نزدیک راشٹریہ بھاشا کا مطلب ہندی + اردو = ہندوستانی تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے ہندوستانی پرچار سبھا بھی قائم کیا تھا جس کے تحت وہ اپنے نظریۂ ہندوستانی کو رائج کرنا چاہتے تھے۔ زبان کے تعلق سے گاندھی جی کا نظریہ واقعی بہت اہم تھا کیونکہ زبان صرف اور صرف تبادلۂ خیالات اور ترسیل معلومات کا ایک ذریعہ ہے تاکہ مختلف مذہبوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ جذبات و احساسات کا اظہار اپنے طور پر کرسکیں۔

شیخ عقیل احمد

ربط و التفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

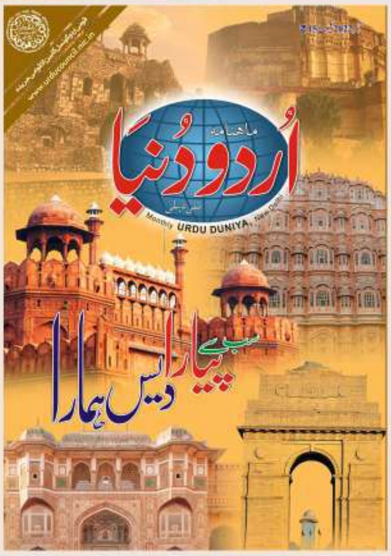

✍ قومی اردو کونسل کے اس بین الاقوامی جریدے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان ابھی سہاگن ہے، پہلے پڑوسی ملک سے 'رابطہ' اور 'فاصلہ' اس انداز میں نکلتے تھے مگر وہ بیرون ممالک میں چھپتے تھے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' یقیناً اردو دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ سرورق تاریخی عمارتوں سے مزین ہے اور اس پر یہ الفاظ سب سے پیارا دیس ہمارا۔ 'ہماری بات' میں آپ نے خوب توجہ دلائی۔ آپ نے لکھا:

''بچوں کے شاعر شفیع الدین نیر نے بھی اس ترنگے کو یوں سلام کیا۔ سب سے اچھا سب سے نیارا/ رنگ ترنگا پیارا پیارا/ قوم کی امیدوں کا سہارا/ دیس دلارا جگ اجیارا/ دل کی ٹھنڈک آنکھ کا تارا— پورے ملک میں جشن آزادی کا نظارہ واقعی قابل رشک تھا۔''

آج ایسی نظموں کو نصاب میں شامل کریں اور اردو رسالوں میں شامل کریں۔ بچوں کو جنگ آزادی پر پروجیکٹ دیں۔ تاکہ ان کے اندر حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوسکے۔ مشمولات میں 13 عناوین کے تحت 42 سے زیادہ مضامین کو 15 صفحات میں قید کیا گیا ہے۔ ادب زاویے اور جہات کے تحت دس مضامین ہیں اور ہر مضمون ادب کا شاہکار ہے۔ ہر زاویے سے ان مضامین کا تجزیہ ہے۔ خاص طور پر اختر الایمان کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ، ماہیا، ثلاثی اور تروینی، اردو میں سائنسی ادب اور عصری تقاضے اور فکر تونسوی کی نظم نگاری قابل تعریف ہے۔ 'یادیں باتیں' میں عربی زبان کے مایہ ناز استاد پروفیسر محمد راشد ندوی پر عبدالماجد قاضی نے بڑے ہی سلجھے انداز میں ان کے شب و روز کا تجزیہ کیا۔ 'لعل و گہر' کے تحت چار ادب نوازوں کو بھرپور خراج عقیدت ہے۔ اس کے بعد سلسلۂ صحافت میں ندوۃ المصنفین اور اس کے مشہور رسالے پر مختصر مگر خوب لکھا۔ صحافت میں اس رسالے کی اہمیت ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور سب رس کی ادبی خدمات مضمون خوب ہے مضمون نگار نے حقائق کا اظہار کیا مگر بعض جگہ چوک گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کے انتقال پر 1962 ماہ اکتوبر، نومبر دسمبر نمبر شائع کیا۔ آخر میں سب رس کے خاص شمارے اور خصوصی نمبرات وخصوصی گوشے میں لکھتے ہیں زور نمبر اکتوبر تا دسمبر 1963۔ ان دونوں میں ایک سال کا فرق ہے، صحیح کیا ہے۔ پروفیسر ایس اے شکور نے جب سے ادارت کے فرائض کی ذمے داری سنبھالی انھوں نے سب رس کو حقیقی معنوں میں دکن کا ترجمان بنادیا۔ یہاں بھی مضمون نگار نے بے اعتدالی سے کام لیا۔ لکھا کہ ان کی ادارت میں چند شمارے شائع ہوئے جب کہ بیگ احساس صاحب کے انتقال کے بعد سے لے کر تاحال ان ہی کی ادارت میں پرچہ نکل رہا ہے اور آئندہ بھی نکلتا رہے گا۔

'زبان و تعلیم' کے تحت اساتذہ کی تعلیم میں ابھرتے ہوئے رجحانات اور چیلنجز میں اساتذہ کی تعلیم میں ابھرتے ہوئے رجحانات، تدریس کے جدید طریقے اور ان پر آنے والے نئے چیلنجز پر اچھا تجزیہ کیا ہے۔ دوسری زبانوں سے جو ترجمے کیے گئے ہیں، بہت ہی اچھے انداز میں ہیں۔ مترجم کو زبان پر عبور ہے اس سے ہمیں نیا ادب پڑھنے کو ملتا ہے۔ 'خصوصی گفتگو' میں اردو میں انگریزی کی آمیزش سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا انٹرویو ہے جس سے مختلف گوشے وا ہوئے ہیں۔ 'تحریک آزادی اور ہماری فلمیں' انیس امروہوی میں 1896 سے جائزہ لیا۔ انھوں نے فلم گاندھی پر صحیح تنقید کی اور کہا کہ یہ ہندوستانی فلم نہیں کہلا سکتی۔ فلم پر خواجہ احمد عباس اور عورت کی تصویر کشی سے معراج احمد نے عباس کی فلموں کا اچھا تجزیہ کیا۔ 'نیا آسماں نئے ستارے' میں محمد علوی کی شاعری کی مخصوص لفظیات اور نیاز فتح پوری کی رومانی افسانہ نگاری کے کچھ نئے گوشے وا ہوئے ہیں۔ 'تبصرہ و تعارف' میں تبصرے خوب ہیں۔ مجموعی طور پر 100 صفحات میں ادب کا وہ گنجینہ مل جاتا ہے جو ذہن کو کھول دیتا ہے اور ادب کو نئی راہ دیتا ہے۔ اس رسالے کو پڑھ کر یہی کہوں گا کہ ؎

لگا رہا ہے مضامین نو کے پھر انبار

ڈاکٹر م ق سلیم: صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج، تلنگانہ

✍ 'اردو دنیا' اگست 2022 نظر نواز ہوا۔ سرورق پر آزادی کے متوالوں کی قربانی کی یاد دلائی گئی ہے۔ یہ ان ہی کی قربانیاں تھیں جو رائیگاں نہیں گئیں اور ان کے بعد کی نسلیں

آزادی کا پھل پا رہی ہیں۔ اس کے مشمولات میں 12 شہ سرخیاں قائم کی گئی ہیں۔ 'اداریہ' میں اعادہ کیا گیا ہے کہ تحریک آزادی ہند کے تعلق سے اردو زبان میں نہ صرف یہ کہ بیش بہا سرمایہ موجود ہے بلکہ یہ محبت کی زبان بھی ہے اس میں جہاں اخوت و بھائی چارے کا پیام دیا گیا ہے وہیں یہ ظلم واستبداد کے سامنے سینہ سپر ہوگئی ہے اس کی نظم ونثر وصحافت نے فرنگیوں کے دانت کھٹے کردیے تھے۔ تب جاکے یہ آزادی نصیب ہوئی ہے۔ 'ربط والتفات' میں کوئی چار تاثراتی خطوط درج ہیں۔ 'آزادی کا امرت مہوتسو' میں تحریک آزادی ہند پر لکھی ہوئیں 72 کتابوں کی ایک فہرست اور آٹھ مضامین شامل ہیں۔ ان میں پہلا مضمون 'جدوجہد آزادی میں اردو صحافت کا کردار' دیا گیا ہے، جس میں دراصل آزادی کی لڑائی کے دوران اردو صحافت کی مختصر سی تاریخ درج کی گئی ہے، جس کے ساتھ ساتھ فرنگیوں کی زیادتیوں کی تاریخ بھی چلتی رہی ہے۔ دراصل اردو صحافت کی 200 سالہ سالگرہ پر ملک کے کئی جرائد نے 'صحافت نمبر' شائع کیے ہیں۔ کچھ کچھ میں نئی باتوں سے روشناس کرایا گیا ہے۔ 'ادب: زاویے اور جہات' میں چھ مقالات شامل ہیں۔ پہلا مقالہ رونق دکنی سیمابی پر توصیفی تعارف سا لگتا ہے۔ البتہ منٹو کے متعلق بدلتے ہوئے نظریات بہت عمدہ مضمون ہے جس میں تحقیقی وتنقیدی دونوں پہلوا جاگر ہیں، جنھیں مناسب تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ پیش کش معقول ومنطقی ہے جسے کہ ذہن قبول کرلے۔ 'اردو تبصروں کا ابتدائی دور' کی شروعات بہت سلیقے سے کی گئی ہے کہ پہلے تبصرے کو بڑی خوبی سے سمجھایا گیا ہے پھر اس کے تاریخی ادوار پر دل خوش کن زبان وبیان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یعنی مصنف کو زبان وبیان پر مکمل گرفت حاصل ہے۔ مضمون قدرے تفصیلی ہے پر قاری ایک بار پڑھنا شروع کردے تو پھر آخر میں ہی دم لے۔ بقیہ مضامین بھی اچھے ہی ہیں۔ 'عربی ادبیات' میں محض ایک مقالہ 'ناصر الدین الاسد.......' درج ہے جس میں عربی زبان میں تحقیق کی روداد درج ہے۔ عربی کے طلبہ کے لیے یہ مضمون مناسب رہے گا۔ 'خصوصی گفتگو' میں بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب نورالحسنین سے لیا گیا انٹرویو شامل ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ 'نگرنگر اردو' کے ذیل میں 'سیوان' میں اردوغزل کے ارتقائی سفر اور 'کوٹہ' کے علمی وادبی پس منظر کو اجاگر کیا گیا ہے جبکہ 'لعل وگہر' میں ہندی شاعر دشینت کمار اور تنویر احمد علوی کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' کے ذیل میں مشہور شاعر امجد حیدرآبادی کی شعری انفرادیت کے تحت ان کے حالاتِ حیات اور صنفِ رباعی میں ان کی انفرادیت پر مع امثال بڑی ہی عمدگی سے قلم اٹھایا گیا ہے۔ مضمون کی پیش کش زبان وبیان میں بڑی عمدگی وسلیقے کو دخل ہے۔ اردو طلبہ واساتذہ کے لیے نہایت ہی مفید مضمون ثابت ہوگا۔ 'کتابوں کی دنیا' میں کوئی گیارہ مطبوعات پر تبصرے شامل ہیں تاکہ آپ اپنی پسند کی کتابیں منتخب کرسکیں۔ عالمی اردو نامہ میں اُردو کے تعلق سے چیدہ چیدہ خبریں دی گئی ہیں۔ 'خبرنامہ' کے تحت قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں، اردو تعلیم کے متعلق قومی اور علاقائی خبریں شامل ہیں۔ اس طرح اس شمارے میں ہر وہ ادبی کاوش شامل ہے جس کی آپ کو تلاش ہوسکتی ہے۔

مصطفی ندیم خاں غوری: بی11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

✍ سرورق پر ذرا یاد کرو قربانی کے تحت جدوجہد آزادی کی تصویر شائع کی گئی ہے۔ تحریک آزادی ہند کے متعلق کتابوں کا اشاریہ دیا گیا ہے، جس میں 72 کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ مدیر صاحب نے ہماری بات میں سچ کہا ہے کہ ''یہ اردو زبان الفت کی زبان ہے۔ اردو صحافت نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ حب الوطنی کے جذبات وتصورات پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو میں تحریک آزادی کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اس کی حفاظت ناگزیر ہے۔ آئندہ نسلوں کے لیے آزادی ادب ثمر آور ثابت ہوگا۔'' اسد رضا نے 'جدوجہد آزادی میں اردو صحافت کا کردار' میں تفصیل سے جن اخبارات، میگزین، ماہناموں نے حصہ لیا ہے ان کے کردار کو پیش کیا ہے۔ اے کے علوی نے 'آزادی کی جنگ اور روہتاس' میں آزادی کے سورماؤں کے کارنامے اور جدوجہد کو پیش کیا۔ امیر حمزہ نے '1857 کی بغاوت میں اردو اخبارات کا کردار' اخباروں کے کارناموں اور مدیروں کی آزادی کے لیے جدوجہد کی ترجمانی کی ہے۔ مضمون جدید معلومات سے مزین ہے۔ تحقیق میں سودمند ثابت ہوگا۔ مسرت نے 'تحریک آزادی اور اردو فکشن' میں اردو افسانوں اور ناولوں میں جنگ آزادی اور جدوجہد آزادی کے تصورات، رول وکردار پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے سوز وطن، گریز، شکست، لندن کی ایک رات، ٹیڑھی لکیر کا تجزیہ کیا ہے اور تحریک آزادی کے کردار کی نشاندہی کی ہے۔ عبدالسمیع نے 'تحریک آزادی میں اردو زبان کا کردار' پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ مہر فاطمہ نے 'تحریک آزادی اور اردو شاعری' میں بھکتی تحریک سے بات شروع کی اور اردو زبان وادب میں نظم کا جو کردار آزادی کے لیے تھا اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے علاوہ اس شمارے میں شامل غلام علی اخضر، عقیلہ، کرامت علی کرامت، محمد نہال افروز، راہین شمع، عادل احسان، دانش کمال، محمد عادل، فیصل نذیر، ریشا قمر، ارشاد احمد، محمد فہیم احمد، ایم اے کنول جعفری، عمران احمد اور حارث حمزہ لون کے مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

✍ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

✍ ستمبر 2022 کا تازہ شمارہ وقت پر موصول ہوا، اس عنایت کے لیے شکریہ۔ ربط والتفات کے 'عنوان' سے بزم سلام وپیام، مکتوبات، یا خطوط کہہ لیجیے اس سلسلے کو توانائی عطا کرنے کا کام ڈائرکٹر قومی اردو کونسل پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کیا ہے۔ موصوف نے خط لکھنے والوں کے جذبات کا احترام کیا جو ہم جیسوں کی خوش نصیبی ہے۔ متین اچل پوری کی شکایت عبدالودود انصاری کے مضمون 'ہندوستان میں بچوں کا سائنسی ادب' سے متعلق ہے، یہ شکایت بے جا نہیں ہے۔ ان کے خط سے مجھے بھی حوصلہ ملا تو یہ خط ارسال ہے۔

عبدالودود انصاری صاحب کا مطالعہ ہوسکتا ہے محدود ہو۔ مارچ 2022 میں 'ٹیکنالوجی دے گی زبان' بچوں کی دنیا میں شامل ہے۔ اس بنیاد پر مجھے یہ کہنے میں کچھ بھی قباحت نہیں کہ ان کی نظر میں پابندی سے بچوں کی دنیا، بچوں کا ماہنامہ امنگ، اور جہاں نما، یا بہار اردو اکادمی کا زبان وادب نہیں آتا، اگر یہ رسائل مطالعے کا حصہ بنتے تو انھیں میری بھی سائنسی نظمیں دیکھنے کو مل جاتیں، اور تذکرہ ضرور کرتے، بہت سے نام ان کے مضمون میں جگہ پانے سے رہ گئے ہیں، یہ بحث کا مدعا نہیں۔ بنگال ہی نہیں ہندوستان کے سیکڑوں ادب اطفال پر لکھنے والوں سے مجھ خاکسار نے بذریعہ خطوط اور موبائل وانٹرنیٹ ای میل رابطہ کیے، تین سال کی مدت میں تکمیل کیے گئے اپنے پروجیکٹ 'بچوں کے ادب میں سائنس کی عکاسی' کو میں مثال کے طور پر پیش کرسکتا ہوں۔ جسے مایہ ناز ادارے قومی اردو کونسل نے اپنے تعاون سے انجام دلایا۔

مہیمنہ خاتون کا مضمون 'بچوں کے ادب کی اہمیت' عمدہ اور فکرمند ہونے کا تقاضا کرتا ہے، جس مقصد سے یہ مضمون لکھا گیا ہے وہ مقصد پانے میں مہیمنہ خاتون کامیاب ہوئیں۔ ہلال احمد گنائی اپنے مضمون 'اردو میں ادب اطفال' کو اور بھی وسعت دے سکتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے جس کتاب سے استفادہ کیا ہے اس میں ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی کی کتاب 'بچوں کے ادب کی تاریخ' کا نام بھی ہے۔ کل ملا کر اردو دنیا ملک وقوم کی بہتر طور سے رہنمائی کرنے میں کامیاب ہورہا ہے۔

ڈاکٹر حبیب سیفی: پہلی منزل، E1251B، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی

■

بیسویں صدی میں اردو کے اہم سفرنامے

محمد معظم الدین

سفرنامہ قوموں اور ملکوں کی جغرافیائی صورت حال، تہذیب و ثقافت، رہن سہن، آدابِ معاشرت، رسم و رواج اور اخلاق و عادات کا مرقع ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کو جتنی خوبی، وسعت اور ذمے داری کے ساتھ جگہ دی جاتی ہے وہ سفرنامہ اتنا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ ایک کامیاب سفرنامہ تاریخ کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کی حوالہ جاتی حیثیت ہو جاتی ہے۔

سفر آج ہماری زندگی کا ناگزیر عمل بن چکا ہے۔ زندگی کے مختلف اوقات میں ہم مختلف طرح کا سفر کرتے ہیں۔ کبھی یہ مختصر ہوتا ہے اور کبھی طویل۔ اس میں طرح طرح کے تجربے اور مختلف مشاہدات سے ہم دوچار ہوتے ہیں۔ یہی مشاہدے اور تجربے جب اس لائق ہوجاتے ہیں کہ ان میں دوسروں کو بھی شریک کیا جائے تو اسے ہمیں تحریر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح سفر کو ایک دستاویزی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے اور دوسروں کی دلچسپی اور ضرورت کا سامان بن جاتا ہے۔

سفرنامہ سراسر بیانیہ نثری صنف ہے۔ اس کے خدوخال ابھی تک متعین نہیں ہوسکے ہیں۔ یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس میں اسی قدر تنوع دیکھنے کو ملتا ہے جتنا سفرنامہ نگار میں ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ سفر کرنے والے کی اکتسابی صلاحیت، تجربات، مشاہدے، ذاتی محسوسات، وسعتِ معلومات، زبان پر گرفت اور اندازِ پیش کش پر منحصر ہوتا ہے۔ یعنی کامیاب سفرنامے کا انحصار اس بات پر ہے کہ سفرنامہ نگار نے ان عناصر سے کام لے کر اسے کس قدر دلچسپ بنایا ہے۔

سفرنامہ قوموں اور ملکوں کی جغرافیائی صورتِ حال، تہذیب و ثقافت، رہن سہن، آدابِ معاشرت، رسم و رواج اور اخلاق و عادات کا مرقع ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کو جتنی خوبی، وسعت اور ذمے داری کے ساتھ جگہ دی جاتی ہے وہ سفرنامہ اتنا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ ایک کامیاب سفرنامہ تاریخ کی سرحد میں داخل ہوجاتا ہے اور اس کی حوالہ جاتی حیثیت ہوجاتی ہے۔

سفرنامے میں سفرنامہ نگار کے لیے لازم ہے کہ جو کچھ اس کے مشاہدے میں آئے اسے مِن وعَن پیش کرنے کی سعی کرے۔ اس میں اس کی ذاتی پسند وناپسند کا دخل تو ہوسکتا ہے لیکن اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا مناسب نہیں ہے۔ یہاں سب سے اہم چیز پیش کش ہے یعنی جو کچھ نظروں سے گزرا ہے وہ کس قدر ہمارے شعور کا حصہ بنا ہے اور صفحۂ قرطاس پر کس قدر اس کی ترجمانی ہوسکی ہے۔ سفرنامہ نگار کا مقصد قارئین کو اپنے ساتھ لے کر چلنا ہے یعنی انھیں اپنے شعور کا حصہ بنانا ہے۔ وہ سارے مناظر، واقعات، مقامات جو اس کی نظر سے گزرے ہیں، ہو بہ ہو اس کی تصویر قاری کے سامنے آجائے۔ سفرنامہ نگار اپنے تاثرات، نظریات، تجربات سے اسے دلچسپ بنا سکتا ہے لیکن یہاں لفاظی، تخلیقی اندازِ بیان، بے جا قیاس اور مبالغہ آرائی کی گنجائش نہیں ہے۔ ان سے سفرنامے کا فن مجروح ہوسکتا ہے۔ سفرنامہ نگار کے لیے اس صداقت کا بھی احساس ضروری ہے کہ ناول، افسانہ اور رپورتاژ وغیرہ انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے پانچویں عشرے کے اواخر میں اردو سفرنامے کی جو ابتدا یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے 'تاریخ یوسفی' معروف بہ 'عجائباتِ فرنگ' سے ہوئی تھی اس نے انیسویں صدی کے اختتام تک ایک مستحکم روایت قائم کرلی تھی۔ تقریباً اس نصف صدی میں جو اہم سفرنامے منظرِ عام پر آئے ان میں نواب کریم خاں کا سیاحت نامہ، فدا حسین کا تاریخ افغانستان، مرزا ابوطالب خاں اصفہان کا سفرِ فرنگ، مولوی مسیح الدین علوی کا تاریخ انگلستان (سفرنامۂ لندن)، سرسید کا مسافرانِ لندن اور سفرنامۂ پنجاب، مرزا نثار علی بیگ کا سفرنامۂ یورپ، رامپور کے نواب محمد حامد علی خاں کا سیر حامدی، نواب محمد عمر خاں کے چھوٹے بڑے سات سفرنامے زادِ سفر، زادِ غریب، آئینۂ فرنگ، سفرنامۂ رئیس، نیرنگِ رنگون، نیرنگ چین، فرہنگِ فرنگ اور قندِ مغربی، ڈاکٹر شاہ علی سبزواری کا خوف ناک دنیا، شبلی نعمانی کا سفرنامۂ روم ومصروشام، محمد حسین آزاد کا سیر ایران اور وسط ایشیا، محمد جعفر تھانیسری کا کالا پانی، مولوی عبدالرحمان امرتسری کا سفرنامۂ بلادِ اسلامیہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

یہ بھی سفرنامے نہ صرف مختلف ملکوں اور قوموں کے جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، اقتصادی تنوع کو ظاہر کررہے ہیں بلکہ ان سے سفرنامہ نگار کے تجربات، مشاہدات، تاثرات، احساسات، نظریات، وسعتِ معلومات اور اندازِ پیش کش اور ان کے اسالیب کے تنوع کا بھی پتا چلتا ہے۔

سفرنامے کا سفر جس طرح آگے بڑھتا رہا اس کے مواد، اسلوب اور زبان و بیان میں بھی جاذبیت پیدا ہوتی گئی۔ لہٰذا قاری سے اس کا رشتہ دن بہ دن استوار ہوتا گیا۔ جغرافیائی اور تاریخی معلومات کی فراہمی، غیر جانب داری، سادہ اندازِ بیان، قوموں اور ملکوں کی سیاسی، سماجی، اقتصادی، ثقافتی صورتِ حال وغیرہ کی معلومات اس دور

کے سفرناموں کی اہم خصوصیات ہیں۔ واقعات کو صحیح تناظر میں دیکھنے اور بیانیہ اندازِ بیان سے یہ سفرنامے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سفرناموں میں سفرنامہ نگار نے اپنی ذات سے کم اور واقعات وحقائق سے زیادہ سروکار رکھا ہے۔

یہ سبھی سفرنامے کسی نہ کسی مقصد کے تحت لکھے گئے ہیں۔ یہ مقاصد زیادہ تر علمی اور اصلاحی تھے۔ ان سے قوم وملک کی حالتِ زار کو بہتر بنانے اور نئی نئی سائنسی ایجادات سے اہلِ ملک کو واقف کرانا تھا تاکہ وہ تیز رفتار بدلتے ہوئے معاشرے کو مثبت غور وفکر عطا کر کے ترقی کی راہ پر گامزن کرسکیں۔ کچھ سفرنامے سیر وتفریح کی غرض سے بھی لکھے گئے ہیں جو نئے ملک کی چکا چوند روشنی اور احساسِ مرعوبیت سے گراں بار ہیں۔

اردو سفرنامے کے اس پس منظر کے ساتھ جب ہم بیسویں صدی میں قدم رکھتے ہیں تو اس کی رفتار یہاں کچھ زیادہ تیز دکھائی دیتی ہے۔ یہ صدی جہاں ایک طرف تاریخ، سوانح، تنقید، ناول، افسانہ، خطوط اور انشائیہ وغیرہ کے لیے ساز گار تھی وہیں اردو سفرنامے کا سفر بھی پوری توانائی سے جاری تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مالی آسودگی، سفر کے ذرائع میں بہتری، مختلف علوم کی ترقی، شوقِ سفر و ذوقِ جستجو میں اضافے نے اسے مزید مہمیز کیا۔ لہٰذا اس صدی میں سفرناموں کی تعداد سو سے تجاوز دکھائی دیتی ہے یعنی اوسطاً سال میں ایک۔ تقسیم ہند سے پہلے لکھے گئے سفرناموں کی تعداد تقریباً چالیس ہے اور تقسیم کے بعد اس سے زیادہ۔ ظاہر ہے مختصر مقالے میں سب پر گفتگو ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا چنندہ سفرناموں کو ہی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں 'پیسہ' اخبار لاہور کے مدیر منشی محبوب عالم کے دو سفرنامے 'سفرنامۂ یورپ' اور 'سفرنامۂ بغداد' دستیاب ہیں۔ اول الذکر میں انھوں نے فرانس، انگلستان، روم، شام اور مصر کی سیاحت کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ان ممالک کے اسفار ایک مصلح کی حیثیت سے کیے تھے۔ سرسید کی طرح انھوں نے بھی ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو بہتر بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ ان کے نزدیک سفر وسیلۂ ظفر تھا۔ وہ دیگر ممالک کی علمی ترقیوں سے اپنے وطن کی سماجی اور معاشی زندگی کو بہتر بنانے کے خواہش مند تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے تجربے اور مشاہدے میں دوسروں کو شریک کرنا ضروری خیال کیا اور اپنی سیاحتی فتوحات کو خطوط اور ڈائری کی مدد سے مرتب کر کے عوام کے سامنے پیش کیا۔

'سفرنامۂ یورپ' معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جس میں یورپ کی سماجی، ثقافتی، معاشرتی اور علمی و ادبی احوال وکوائف کو جملہ خصوصیات اور جزئیات کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔ اس میں 'مشرق سے ہو بے زار نہ مغرب سے حذر کر' کے اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انھوں نے ایک غیر جانب دار سیاح کی طرح حالات اور واقعات کو قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ پروفیسر خالد محمود اس کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...اس سفرنامے میں ہر چیز کو اس کی تمام باریکیوں کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی ایسی کوشش کی گئی ہے جو اس سے قبل لکھے گئے سفرناموں میں خال خال نظر آتی ہے۔ یہی خوبی 'سفرنامۂ یورپ' کی انفرادیت اور اس کے مطالعے کا سب سے بڑا جواز ہے۔''

(اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص 162)

خواجہ حسن نظامی کے چار سفرناموں سفرنامۂ ہندوستان، سیر دھلی، سفرنامۂ مصرو فلسطین و شام وحجاز اور سفرنامۂ افغانستان میں مؤخر الذکر دو خصوصیت سے قابلِ ذکر ھیں۔ 'سفرنامۂ مصرو فلسطین و شام و حجاز' سے ان کے صوفیانہ مزاج اور ادیبانہ شان دونوں کی ترجمانی ھوتی ھے۔ انھوں نے اپنے سفرنامے میں مزارات اور مرقدوں سے متعلق تفصیلات فراھم کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی حالات، آدابِ معاشرت، تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات اور رسم و رواج پر بھی روشنی ڈالی ھے۔ حسبِ ضرورت ان کا موازنہ اور تجزیہ بھی کرتے گئے ھیں۔

سرسید کے رفیقِ کار نواب محسن الملک نے اس سفرنامے سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''سرسید احمد خاں کے سفرِ یورپ کے بعد کبھی اس قدر دلچسپی سے میں نے یورپ اور بلادِ اسلامیہ کی کیفیت نہیں پڑھی تھی۔''

(مقدمہ سفرنامۂ یورپ، ص 3، بحوالہ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص 163)

منشی محبوب عالم کا دوسرا سفرنامہ 'سفرنامۂ بغداد' ہے۔ اس سفر کا نادر موقع اس وقت ہاتھ آیا جب حکومتِ وقت نے انھیں انڈین پریس ڈیپوٹیشن کا ایک معزز رکن منتخب کر کے عراق وعرب کو عالمی جنگ کے خطرات سے باخبر کرنے اور وہاں کے سیاسی وسماجی حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ اس میں بھی تقریباً اول الذکر سفرنامے جیسی خوبیاں موجود ہیں اور سفرنامہ نگار کا وہی جذبہ کارفرما ہے جو پہلے سفرنامے کا طرّۂ امتیاز ہے۔ اس میں عراق وعرب کی تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ تاریخ اور جغرافیہ کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ دونوں سفرناموں کی زبان سادہ اور دل چسپ ہے۔ اندازِ بیان میں بے تکلفی اور حیرت واستعجاب کی فضا برقرار ہے۔

خواجہ غلام الثقلین نے اپنے سفرنامے 'روزنامچہ سیاحت' میں روس، قسطنطنیہ، عراق، ایران، عرب (مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ) وغیرہ ممالک کے سفر کا حال بیان کیا ہے۔ سماجی علوم پر خواجہ صاحب کی گہری نظر تھی اور اپنے اسفار میں انھوں نے ممالک کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مظاہرِ فطرت کو قلم بند کرتے وقت انھوں نے تاریخی شعور اور جغرافیائی مطالعے سے بڑی مدد لی ہے۔ انھوں نے معمولی اور چھوٹے واقعات کی تصویر کشی اس طرح کی ہے کہ دلچسپی کا عنصر خود بہ خود پیدا ہو گیا ہے اور قاری اسے اپنی زندگی سے بہت قریب پاتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کو مصورِ فطرت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ایک بے باک صحافی، بے مثل ادیب اور صاحبِ طرز انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ صوفیِ باصفا اور وسیع القلب انسان تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی سفر کیے اور ہر سفر کی روئداد تاریخ وار روزنامچے کی صورت میں محفوظ کرتے گئے۔ بعد میں اسے سفرناموں کی شکل میں مرتب کر کے عوام کے سامنے پیش کر دیا۔ اس طریقۂ کار سے واقعات کی صداقت، پس منظر اور زمان ومکان کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بے جا قیاس آرائی اور تخیل آفرینی سے اپنے فن کو مجروح ہونے سے بچا لیا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے چار سفرناموں سفرنامۂ ہندوستان، سیرِ دہلی، سفرنامۂ مصر وفلسطین و شام وحجاز اور سفرنامۂ افغانستان میں مؤخر الذکر دو خصوصیت سے قابلِ ذکر

ہیں۔ 'سفرنامۂ مصر و فلسطین و شام و حجاز' سے ان کے صوفیانہ مزاج اور ادیبانہ شان دونوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے سفرنامے میں مزارات اور مرقدوں سے متعلق تفصیلات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی حالات، آدابِ معاشرت، تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات اور رسم و رواج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ حسبِ ضرورت ان کا موازنہ اور تجزیہ بھی کرتے گئے ہیں۔ حج بیت اللہ سے شرف یابی کے دوران جب مدینۂ منورہ میں حضور پاکؐ کے روضۂ اقدس کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تو اپنی دلی کیفیت کا بیان اس طرح کیا ہے:

''خوش نصیب ہیں یہ آنکھیں جو آپؐ کے روضۂ اطہر کو دیکھ رہی ہیں۔ نصیب والا ہے یہ ہاتھ جو اس نورانی جالی کو تھامے ہوئے ہے اور زبان کی عزت پر تو جس قدر رشک کیا جائے کم ہے کہ وہ اس زندہ اور زندہ کرنے والے کے وجود سے کلام کر رہی ہے جس کے آگے سارے جہان کی زبانیں گنگ ہیں۔''

(سفرنامہ مصر و فلسطین و شام و حجاز، ص 7، بحوالہ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص 171)

خواجہ حسن نظامی کا دوسرا قابلِ ذکر سفرنامہ 'سفرنامۂ افغانستان' ہے جس میں ستر دنوں کے احوال کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اس میں افغانستان کی تاریخ، جغرافیہ، معاشرت، اقتصادیات، عقائد اور خاص طور پر روحانی تاریخ کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کے نزدیک اس سفر کا خاص مقصد بزرگوں کے مزارات پر حاضری تھا۔ خواجہ صاحب نے اس میں شاہ افغانستان غازی محمد نادر شاہ کے سفرنامے کے اردو ترجمے کی تلخیص بھی شامل کر لی ہے جس سے اس کی افادیت دو چند ہوگئی ہے۔ اس سفرنامے میں خواجہ صاحب نے افغانی قوم کے مزاج، عادات و اطوار، اخلاق و معاملات اور عقائد و مسالک کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے اور بے لاگ تبصرہ بھی شامل کیا ہے۔

مولوی محمد علی قصوری کا 'مشاہداتِ کابل و یاغستان' آپ بیتی کے انداز میں لکھا ہوا سفرنامہ ہے۔ انھوں نے یہ سفر والیِ افغانستان امیر حبیب اللہ خاں کے دورِ حکومت میں حکیم اجمل خاں، مولانا آزاد اور مولانا عبید اللہ سندھی کے مشورے پر کیا تھا۔ یہ ایک سیاسی نوعیت کا سفر تھا جو امیر حبیب اللہ خاں کو انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے آگاہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس سفرنامے میں افغانستان کے سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی اور اقتصادی معاملات نیز رسم و رواج پر بڑے موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ بادشاہِ وقت کے ذاتی مشاغل کی شمولیت سے یہ سفرنامہ اور بھی دل چسپ ہوگیا ہے۔ اگرچہ مولوی محمد قصوری کا یہ سفر ناکام رہا لیکن انھوں نے جملہ حالات اور واقعات کو ایک غیر جانب دار سیاح کی نظر سے دیکھا ہے جو اس وقت کے افغان قبائیلوں کے اخلاق و عادات اور رہن سہن سے حقیقی واقفیت حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ معروضی انداز میں لکھے گئے اس سفرنامے کی زبان سادہ، رواں اور دل چسپ ہے۔ بقول خالد محمود ''اس سفرنامے میں حرکت کم اور حرارت زیادہ ہے۔''

(اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص 181)

'کابل میں سات سال' مولانا عبیداللہ سندھی کا تحریر کردہ ایک مشہور سفرنامہ ہے۔ یہ سفر بھی خالص سیاسی نوعیت کا تھا جسے مولانا عبیداللہ سندھی نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے بار بار اصرار کرنے پر کیا تھا۔ شیخ الہند کی خواہش تھی کہ کابل کی حکومت ہندوستان سے انگریزی اقتدار کو بے دخل کرنے میں معاونت کرے اور خود افغانستان ایک مضبوط اسلامی حکومت کے طور پر قائدانہ کردار ادا کرے۔ چنانچہ یہی جذبہ لے کر وہ افغانستان کے سفر پر آمادہ ہوگئے۔ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیت، سیاسی بصیرت اور مومنانہ فراست سے بہت جلد اکابرینِ سلطنت کا اعتماد حاصل کر لیا اور انھیں بہترین مشوروں سے نوازا۔ اس ملک میں ان کے لیے پریشانیاں بھی کم نہیں تھیں۔ انگریزوں کی سازشوں سے بچنے کے لیے وہ پہلے روس گئے۔ وہاں سے بلادِ اسلامیہ کا سفر کرتے ہوئے حجازِ مقدس آگئے اور یہاں کچھ عرصے قیام کے بعد ہندوستان واپس آگئے۔

مولانا سندھی نے اپنے وسیع تجربات، گہرے مشاہدات، بلند خیالات اور دل چسپ تاثرات سے اس سفرنامے کو وقار عطا کیا ہے۔ وہ اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل میں اس قدر کوشاں رہے کہ افغانستان کو غیر سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ چنانچہ اس سفرنامے میں افغانستان کی تہذیب و معاشرت اور تاریخ و جغرافیہ جیسے موضوعات پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ مجموعی طور پر اس سفرنامے کو ایک سیاسی ڈائری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس کا اندازِ بیان خودنوشت سوانح عمری جیسا ہے۔

مولانا حسرت موہانی کی بیگم نشاط النسا صاحبہ مولانا کے ہر دکھ درد میں برابر کی شریک رہی ہیں۔ مولانا کے ساتھ انھیں بھی حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی اور عراق کا بھی سفر کیا۔ ان دونوں اسفار کے احوال و کوائف کو انھوں نے 'سفرنامۂ حجاز' اور 'سفرنامۂ عراق' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اول الذکر سفرنامہ حج بیت اللہ شریف سے متعلق ہے اور ان کی عقیدت و ارادت کے اظہار کی بہترین مثال ہے۔ موخر الذکر میں انھوں نے عراق کی تہذیب و معاشرت بالخصوص خواتین کے شوق، رہن سہن، طور طریق، آرائش و زیبائش اور تعلیم و تربیت کو عورت کی نفسیات اور جذبات کے نقطۂ نظر سے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ بیگم حسرت موہانی نے عراق کی معاشرت کو حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ زبان کی سادگی، نسوانی لب و لہجہ اور بے ساختہ اندازِ بیان ان کے سفرناموں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کا 'سفرنامۂ شیخ الہند' ایک اہم سفرنامہ ہے جس میں ان کے رفیقِ سفر مولانا حسین احمد مدنی نے ان تمام حالات و واقعات کو ایک سچے اور چشم دید گواہ کی حیثیت سے قلم بند کر دیا ہے جن سے وہ دورانِ سفر و اسیری دوچار ہوئے تھے۔ اس میں سیاسی اور تاریخی کوائف کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سفر ممبئی سے شروع ہو کر جدہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ ہوتا ہوا مصر و مالٹا میں اسیری اور رہائی پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں جزئیات کی فراوانی کے ساتھ حالات اور واقعات کا تجزیہ اور موازنہ بھی شامل ہے۔ یہ سفرنامہ روئدادِ سفر بھی ہے اور اپنے عہد کے سیاسی نشیب و فراز کی داستان بھی۔

'طوفان سے ساحل تک' ایک نومسلم محمد اسد کا بے مثل سفرنامہ ہے جس میں بقول پروفیسر خالد محمود ''سفرنامہ نگار نے جسمانی اور ذہنی دونوں سطحوں پر سفر کیا ہے اور ذہنی سطح کا سفر جسمانی سطح سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ہے۔''

(اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص 215)

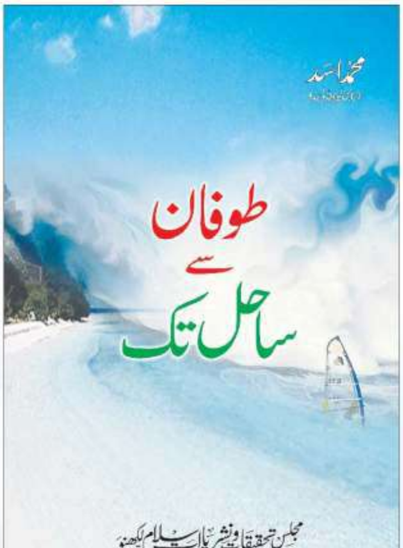

محمد اسد ایک ایسے یہودی گھرانے کے چشم و چراغ تھے جو عالموں، پادریوں اور مذہبی رہنماؤں کا معزز خاندان تھا۔ ان کا پرانا نام لیوپولڈ ویس (Leopoldwes) تھا۔ فلسفہ، تاریخ، منطق اور ادبیات کا وسیع اور گہرا مطالعہ کرنے نیز عالمی سیاست اور فنون لطیفہ سے شغف رکھنے کے باوصف راہِ حق کی تلاش میں برابر سرگرداں رہے۔ بالآخر مذاہبِ عالم کے مطالعے نے انھیں اسلام کی طرف راغب کیا اور وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ یہ نعمت خداوندی انھیں کشاں کشاں حجاز مقدس کی طرف لے گئی۔ یہ سفرنامہ اسی سفر کی روئداد پر مشتمل ہے۔ اسے آپ بیتی کے انداز میں تحریر کیا گیا ہے جس میں مشرف بہ اسلام ہونے کی روئداد اور سفر حجاز کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ سفرنامہ محمد اسد کی انگریزی کتاب The Road to Mackka کا اردو ترجمہ ہے جو معروف اسلامی اسکالر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی معروف بہ علی میاں کے ایما پر ہوا۔ آپ کے تعارفی کلمات کی شمولیت سے اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اپنے مخصوص طرزِ فکر، انداز بیان اور لب و لہجے کے اعتبار سے بھی یہ سفرنامہ اپنی انفرادی شناخت رکھتا ہے۔

مولانا حسن الدین خاموش کا 'مرقعِ حجاز' اردو کے اہم سفرناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں انھوں نے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور طائف وغیرہ کے ڈیڑھ سالہ سفر کی روئداد کچھ اس خوبی سے قلم بند کی ہے کہ گویا وہاں کی سیاسی، تہذیبی، معاشی اور مذہبی زندگی کو گویائی مل گئی ہو۔ یہ سفرنامہ روزنامچے کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور خامیوں اور کوتاہیوں کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن خلوص کی کارفرمائی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ حجاز مقدس سے وابستہ ان کی محبت و ارادت قارئین کو بھی اپنا ہم سفر بنالیتی جو اس کی مقبولیت کی بین دلیل ہے۔

مذکورہ بالا سفرنامے تقسیم ہند سے پہلے لکھے گئے۔

تقسیم کے بعد ان کی رفتار مزید تیز ہوگئی۔ ایک ہی ملک میں رہنے والے افراد اب ذہنی طور پر کم لیکن جسمانی طور پر دو ملکوں کا حصہ ہو گئے۔ دونوں ملکوں میں سفر کرنے والے افراد کے ذہنوں میں تقسیم کا کرب بھی نمایاں تھا جس کا اندازہ ان کے سفرناموں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ بلادِ یورپ اور بلادِ اسلامیہ کا بھی سفر جاری رہا۔

آزادی کے بعد مقبولیت حاصل کرنے والے سفرناموں کی تعداد خاصی ہے۔ الگ الگ مقاصد کے تحت لکھے گئے یہ سبھی سفرنامے موضوعات کے تنوع، اندازِ فکر، طرزِ پیش کش اور زبان و بیان کے اعتبار سے اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ اس دوران جو اہم سفرنامے معرض وجود میں آئے

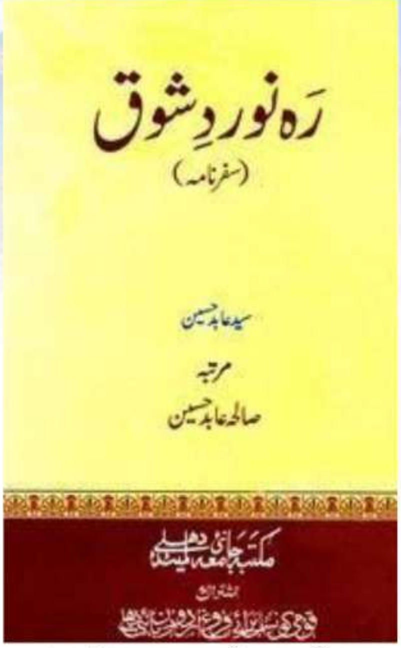

ان میں ڈاکٹر سید عابد حسین کا رہ نوردِ شوق، صالحہ عابد حسین کا سفر زندگی کے لیے سوز و ساز، سید احتشام حسین کا ساحل اور سمندر، ڈاکٹر ثریا حسین کا پیرس و پارس، ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک، سید ابوالحسن علی ندوی کا ترکی میں دو ہفتے، کابل سے یرموک تک اور شرق وسط میں کیا دیکھا، مسعود احمد برکاتی کا دو مسافر دو ملک (بچوں کے لیے)، مرزا ادیب کا ہمالہ کے اس پار، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا سفر آشنا، خواجہ غلام السیدین کا دنیا میرا گاؤں، مدیر نقوش محمد طفیل کا مسافرانہ، جگن ناتھ آزاد کا جنوبی ہند میں دو ہفتے، مدیر اوراق وزیر آغا کا بیس دن انگلستان میں، محمود نظامی کا نظر نامہ، اختر ریاض الدین کا دھنک پر قدم، جمیل الدین عالی کا دنیا مرے آگے، تماشا مرے آگے، مستنصر حسین تارڑ کے چار سفرنامے نکلے تری تلاش میں، اندلس میں اجنبی، خانہ بدوش اور ہنزہ داستان، قرۃ العین حیدر کے دو سفرنامے جہانِ دیگر اور دکھلائیے لے جا کے اسے مصر کا بازار، قدرت اللہ شہاب کا اے بنی اسرائیل اور تو ابھی رہ گزر میں ہے، ممتاز احمد خاں کا جہاں نما، عطاء الحق قاسمی کا شوق آوارگی، ذوالفقار احمد تابش کا جوار بھاٹا، ڈاکٹر وحید قریشی کا چین کی حقیقتیں اور افسانے، نجمہ افتخار راجا کا سایونارا، ڈاکٹر صغریٰ مہدی کا سیر کر دنیا کی غافل خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اور بھی سفرنامے اس فہرست میں شامل ہونے کے متقاضی ہیں نیز اپنی رائے کی تائید اور تائید مزید کے لیے مذکورہ سفرناموں سے اقتباسات کی شمولیت بھی ضروری ہے لیکن خوفِ طوالت مانع ہے۔

یہ سبھی سفرنامے صرف روئدادِ سفر کو ہی پیش نہیں کرتے بلکہ یہ جملہ معلومات کا بیش بہا مرقع ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہم مختلف ملکوں کی تاریخی، جغرافیائی، سیاسی، ثقافتی، معاشی اور معاشرتی معلومات نیز وہاں کے رسم و رواج، اخلاق و عادات اور تعلیم و تربیت سے گھر بیٹھے آگاہ ہو سکتے ہیں اور بہت سے ملکوں کی سیاحت سے بے نیاز بھی۔ علوم جدیدہ سے واقفیت، تجربے کی ندرت و جدت، زمان و مکان، مقاصد، تجربے اور مشاہدے، اخذ و قبول، پیش کش اور اندازِ بیان کے افتراق کی وجہ سے یہ سبھی سفرنامے اپنی انفرادی شناخت اور جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول کے سفرناموں میں مختلف قسم کی معلومات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ سفرنامہ نگار نے اپنی پسند اور ناپسند کو بھی موقع دیا۔ اپنے تجربے اور مشاہدے کی وسعت کے علاوہ جزئیات اور جذبات نگاری کے فیضان سے بھی اس میں دل چسپی اور حیرت کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اندازِ بیان میں نسبتاً ادبی طریق کار کو روا رکھا ہے۔

تقسیم کے بعد لکھے گئے سفرناموں میں درج بالا خصوصیات کے علاوہ ماضی میں سفر کرنے کا رجحان بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ بعض سفرنامہ نگاروں نے یادوں کے وسیلے سے سفر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے خیالات، تاثرات، نظریات اور احساسات کو زیادہ اہمیت دے کر سفرنامے کو دل چسپ بنانے کی سعی کی ہے۔ بعض سفرناموں میں سفرنامہ نگاروں کی ذات خود مرکزی کردار بن کر رہ گئی ہے جس سے سفرنامے کے فن پر بھی حرف آیا ہے۔ عجلت پسندی نے بھی بعض سفرنامے کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا یہ سفر سفرنامے کا موضوع ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے مقصد کا تعین بھی ضروری ہے۔

بہر کیف بیسویں صدی میں اردو سفرنامے کی ایک صحت مند روایت کا سلسلہ پوری توانائی اور آب و تاب سے جاری رہا۔ یہ سفر نئی منزلوں کی تلاش میں اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکا ہے۔ موجودہ دور میں سفرناموں کی نوعیت قدرے تبدیل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اب جزئیات نگاری اور صنف نازک کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے۔ قیاس آرائی بھی کسی قدر راہ پا گئی ہے۔ معمولی واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا رجحان بھی روز افزوں ہے۔ سفرنامے کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جدت سے کام لینا کوئی مضائقہ نہیں لیکن فطری حالات و واقعات، بے ساختہ انداز بیان اور صداقت نگاری سے ہی سروکار رکھا جائے تو بہتر ہے۔

(یہ مضمون اردو اکادمی کے ایک سمینار میں پڑھا گیا ہے)

Prof. Mohd Moazzamuddin (Alig.)
DEL,NCERT
New Delhi - 110016
Mob.:9868469267

نصرت جہاں

نفسیاتی تنقید

ردو قبول کی میزان پر

تنقیدی نظریات اس وقت ادب و تنقید سے وابستہ ہوئے جب مختلف مکتبہ فکر کے لوگوں نے مختلف نظریات کی حمایت و مخالفت میں اپنے دلائل پیش کیے اور اسے ان نظریات پر حامل فن کی کسوٹی پرپرکھا۔ ایسی صورت میں تنقید کے نظریات فن تنقید کے پیرایۂ بیان بنے۔ ایسے میں تنقید نگار کی ذمے داری بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ وسعت نظری سے فن تنقید کے تقاضے نئی توانائی اور نئی توقعات کے طلب گار بن جاتے ہیں اب یہ تنقید نگارپر منحصر ہے کہ وہ معروضیت سے کام لیتے ہوئے فن پارے کا جائزہ لے اور غیر جانب داری برتتے ہوئے اس پر اظہار خیال کرے۔

نفس ہے وہم و گمان اور یقین
نفس ہے انسان کی فطرت کا امین
نفس نہ ہو تو مقدر ہے شکست
نفس کی قید میں ہے فتح مبین

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ادیب یا فن کار بظاہر ایک فرد ہوتا ہے لیکن یہ باطن کائنات کا سرچشمہ ہے یعنی جب وہ خود کو اپنے فن یا تخلیق کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے تو اس کی حیثیت فرد کی نہیں رہ جاتی۔ سماجی و معاشی محرکات اور لاشعور بہ یک وقت اس میں مدغم ہو کر ایک وسیع دنیا آباد کر لیتے ہیں جہاں تخیل کی کارفرمائی شامل حال رہتی ہے ممکن ہے اس کی یہ ذہنی اپج اس کے لاشعور کی دین ہو۔ لیکن نہ تو شعور کی منزل کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی جذبات شدت یا جمالیات کی طرف اس کے جھکاؤ کو تحلیل نفسی کی بنیاد مانا جا سکتا ہے۔ یہ نکتہ ادب کی ہر صنف پر لاگو ہوتا ہے اور تنقید بھی اس سے مبرا نہیں ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ادب کو زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ زندگی سے براہ راست وابستگی نے ادب کو ایک مقام عطا کیا ہے۔ ادب جہاں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتا ہے وہیں اس کا تجزیہ اور پرکھ جو ایک معروضی عمل ہے تنقید کی بنیاد بنتا ہے۔ اسی لیے تنقید کو ادب کا ایک جز قرار دیا گیا ہے۔ ادب دراصل افکار و خیالات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جسے فنی دراکی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس عمل میں حیات و کائنات کی پیچیدگیوں کا فن کارانہ اظہار ہی تنقید کے وجود کا احساس دلاتا ہے۔

لیکن ہمیں اس بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ فن کار یا ادیب بذات خود نقاد ہوتا ہے جو اپنی تخلیق کو فنی نقطہ نظر کی روشنی میں اور تخیل کی بنیاد پر اسے جذبات کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ تخلیق کے اس عمل میں اسے بارہا شعور و لاشعور کی تکرار سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور تب تخلیق وجود میں آتی ہے۔ لہٰذا ادب یا فن انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نہ صرف ترجمانی کرتا ہے بلکہ اس کی تخلیق جذبات تاثرات، فکر کی منتقلی کے ساتھ اس کی شعوری نیم شعوری اور لاشعوری ذہنی پیچیدگیوں کے ساتھ ہوتی ہے وہیں تجزیہ جو ایک معروضی عمل ہے تنقید کی بنیاد بنتا ہے اور پھر تنقید نگار تخلیق کی پرکھ اپنے نظریے کی روشنی میں کرتا ہے اور اسے مختلف زاویوں سے جانچتا ہے ادب اور فن اگر تنقید کی منازل سے نہ گزریں تو ان کی ارتقائی صورت منجمد ہوتی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ادب اور فن کے ساتھ ساتھ تنقید کا وجود بھی مسلم ہے۔ بہ الفاظ دیگر فن تنقید کے مراحل سے گزر کر اپنی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے اور اس کی اہمیت سے انکار مشکل ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ تنقید کا کام ادب و فن کی قدر کو متعین کرنا ہے جب کہ تنقیدی نظریات فن پاروں کی روشنی میں مرتب ہوتے ہیں اس لیے ان کی راہ نمائی اس بات کو طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کون سی تخلیق فن پارہ ہے اور کون سی تخلیق فن پارہ نہیں۔

تنقیدی نظریات اس وقت ادب و تنقید سے وابستہ ہوئے جب مختلف مکتبہ فکر کے لوگوں نے مختلف نظریات کی حمایت و مخالفت میں اپنے دلائل پیش کیے اور اسے ان نظریات پر حامل فن کی کسوٹی پر پرکھا۔ ایسی صورت میں تنقید کے نظریات فن تنقید کے پیرایہ بیان بنے۔ ایسے میں تنقید نگار کی ذمے داری بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ وسعت نظری سے فن تنقید کے تقاضے نئی توانائی اور نئی توقعات کے طلب گار بن جاتے ہیں اب یہ تنقید نگار پر منحصر ہے کہ وہ معروضیت سے کام لیتے ہوئے فن پارے کا جائزہ لے اور غیر جانب داری برتتے ہوئے اس پر اظہار خیال کرے۔

مختلف ادوار میں مختلف تحریکات اور نظریات نے جہاں تخلیقات اور تخلیق کاروں کو نئے زاویہ نگاہ فراہم کیے وہیں فن تنقید کو نئے رخ عطا کیے۔ عالمی سطح پر یونانی مفکر ارسطو کی 'بوطیقا' تنقید کی پہلی کتاب قرار پاتی ہے اور اردو میں حالی کی 'مقدمہ شعر و شاعری' کو اردو کی پہلی تنقیدی کتاب قرار دیا جاتا ہے۔ دونوں جگہ ہی فن کے اصول متعین کیے گئے ہیں اور نظریات سے بحث کی گئی ہے۔ تنقید کے مختلف نظریات میں ایک اہم نظریہ نفسیاتی تنقید کا ہے۔ نفسیاتی تنقید کے بنیاد گزاروں نے نفسیاتی تنقید کے تعلق سے اپنے اپنے طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ افلاطون نے اخلاقی نظریہ عام کیا۔ جب کہ اس کے شاگرد ارسطو نے المیہ پر توجہ صرف کی اور پھر اس کے نظریات کی مختلف شاخیں پھوٹنے لگیں۔ کولرج نے رومانیت پر زور دیا اور تخیل کو ادب میں کلیدی حیثیت گر دانا۔ اس کا خیال ہے کہ تخیل کا سرچشمہ لاشعور سے پھوٹتا ہے۔ فرائڈ اور یونگ نے تحلیل نفسی اور آرکی ٹائپ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ شعور، لاشعور اور تحت الشعور کے نظریے کو

ادب سے جوڑنے کا عمل فرائڈ اور یونگ سے شروع ہوا جن کا سارا زور انسانی نفسیات پر تھا اور یہی نظریے نفسیاتی تنقید کی بنیاد ٹھہرے۔ ادب میں نفسیاتی تنقید کا عمل ان ہی کے نظریات کی روشنی میں دیکھے گئے۔

ادب میں ذات اور کائنات میں شعور کا اظہار ہوتا ہے اور اظہار میں نفسیاتی تحرک کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موضوع کی مناسبت سے اس بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ تخلیق کار ہو یا تنقید نگار، خیالات کے اظہار میں اپنی ان نفسیات سے ضرور کام لیتا ہے جو اس کے شعور، تحت الشعور یا پھر لاشعور میں موجود رہتی ہے۔ تخلیق کار تخلیقی عمل کے دوران اپنی نفسیات کو بروئے کار لاتا ہے اور نقاد فن پارے میں موجود فن کار یا تخلیق کار کے نفسیاتی پہلوؤں کو منکشف کرتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ تنقید میں اندازِ فکر اور اندازِ نظر دونوں کی اہمیت ہوتی ہے اور یہی فکر و نظر فن پارے کے متضاد پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔ یہ نقاد کی عمیق نگہی پر منحصر ہے کہ وہ جس مکتبہ فکر کا داعی ہوگا اسی تناظر میں اس فن کو آنکے گا۔ نقاد تخلیق کے بطن میں داخل ہو کر اسے سمجھنے کی سعی کرتا ہے جہاں فن کار کے شعور وآگہی کی قوت یعنی شعور و لاشعور کا امتزاج، تجربات و مشاہدات اضطراری عمل اظہار کا درجہ پاتے ہیں یہ ایک غیر متوقع عمل ہے جہاں نفسیات کی تہیں خارجی تجربات اور باطنی تغیرات سے ہم آہنگ ہوتی ہیں، جس میں دماغ کی لاکھوں خلیوں کی کڑیاں جڑی رہتی ہیں۔ اگر ان کا توازن بگڑ جائے تو بغاوت سر ابھارتی ہے اور اس طرح یہ تعمیری عمل بھی اعصابی خلل قرار پاتا ہے اور ردعمل اور ذہنی کشا کشی اس عمل میں نفسیات کا بڑا دخل ہوتا ہے جہاں نفسیاتی الجھنیں اور ذہنی محرکات جذبات کے اظہار میں رکاوٹ بنتے ہیں اور جہاں سے فراریت کی راہ نجات نظر نہیں آتی۔ فن پارے کو جذبات سے مبرا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نقاد پر بھی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ فن کار کے جذبات کا ایماندارانہ تجزیہ کرے۔ ڈیوٹ ڈیشز (David Daiches) نے جذبات کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جذبات اور ان کی پرداخت انسان کے لیے متبدل نہیں کیونکہ ہمارے یہ جذبات متبدل نہیں بلکہ حصول علم کے لیے ایک ذریعہ ہیں۔''

یہی جذبات رومانیت کی اساس قرار پائے جس نے رومانی تنقید کو راہ دی۔ جرمن رومانیت نہ صرف یورپ کی پہلی رومانی تحریک ہے بلکہ اس میں وہ انتہا پسندی ذرا کم ہے جو فرانس اور بعد میں انگریزی رومانیت Great movement of Phlosopher eitchen میں نمایاں ہوئی۔ جرمن میں (Fichye Sechiller) فیشے شیلر، شیلنگ، شلیگل اور ہیگل، فرانس میں Rosseav، Voltaine ڈی ڈیرو اور انگلستان میں ورڈز ورتھ، کولرج اور کرافٹ کے نام نمایاں ہیں۔ ان تینوں جگہوں پر رومانی تنقید تین الگ الگ نظریات کی نمائندگی کرتی ہے۔ جرمن میں فلسفیانہ، فرانس میں سیاسی اور انگلستان میں سماجی عوامل برسر پیکار رہے۔ ان تمام بحث کا مطلب یہ ہے کہ نفسیاتی رجحانات کا عمل دخل رومانی شاعری و رومانی تنقید پر سب سے زیادہ رہا۔ جہاں مسرت، حسن اور جذبات رومانیت کی اساس قرار پائے اور اسی نے نفسیاتی تنقید کو جلا دی۔

نفسیاتی پہلو ہر قسم کے افکار میں خواہ وہ شخصی ہو یا ذاتی رجحانات، جذبات اور احساسات کا تجزیہ بن کر یا تخلیقی پیرایہ بیان کا عنصر بن کر داخل ہوجاتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ احساس ایک خارجی امر ہے اور اپنے وجود کے لیے اعصاب کا محتاج ہے یہ احساس تحت الشعور میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے جسے ہم جذبے کے انتشار کی صورتوں کا نام دیتے ہیں۔ شاعری میں شعر کی مدد سے شاعر کی نفسیات کا تجزیہ یا ڈرامے میں کردار کی نفسیاتی الجھنوں کو خود ڈراما نگار کی ذاتیات سے جوڑ کر فیصلہ کرنا ناجائز نہیں۔ شیکسپیئر کے ڈرامہ ہیملٹ (Hemlet) کے کردار کے سلسلے میں کہا جاتا رہا ہے کہ شیکسپیئر خود ایڈیپس کا شکار تھا لیکن بعد کے نقادوں نے اسے غلط قرار دیا۔

نفسیاتی تنقید کی در اصل کئی منزلیں ہیں۔ بعض اوقات تنقید نگار مصنف کی سوانح عمری کی روشنی میں اس کی تخلیقات کو پرکھتا ہے اور زماں و مکاں کی قید اس کی شخصیت اور تخلیق کی جلوہ گری کا سبب گردانتا ہے اور کبھی شعور، لاشعور و تحلیل نفسی کی پیچیدگیوں میں اس تخلیق کا جواز تلاش کرتا ہے یا پھر سماجی محرکات اور اجتماعی لاشعور کی روشنی میں اس کی تخلیق کا پیمانہ طے کرتا ہے لیکن مظاہر فطرت و سائنسی تجربات کو ایک ہی پیمانے میں نہیں تولا جا سکتا اور یہی تنقید کا اصول بھی ہے۔ تنقید نگار اپنی پرکھ کو ادب کے جس پیمانے میں تولتا ہے اس میں اس کے شعور کی کارفرمائیاں شامل رہتی ہیں۔ نفسیاتی رجحانات کا عمل دخل رومانی شاعری و رومانی تنقید پر سب سے زیادہ رہا۔ جہاں مسرت، حسن اور جذبات، رومانیت کی اساس قرار پائے اور انہیں کی موجودگی میں نفسیاتی تنقید اپنا تجزیاتی عمل قائم رکھنے میں کامیاب رہی۔

نفسیات والوں کے پیش نظر سب سے بڑا مسئلہ 'اندر' کی وہ سلوٹیں ہیں جنھیں اگر دور نہ کیا جائے تو انسان نفسیاتی بحران کی شدت سے بعض اوقات پاگل پن کی زد پر آجاتا ہے۔ ان سلوٹوں کو ہموار کرنے کے لیے نفسیات والوں نے دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ تخلیقی عمل کو بھی بہت اہمیت بخشی۔ جہاں تک نفسیاتی بصیرت کا سوال ہے اس کا تعلق کسی عہد، طبقے یا فرد سے نہیں بلکہ یہ وہ ذہنی کیفیت ہے جس کا تعلق تخیل اور تخلیق سے ہے خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ ایک مصور اپنی نفسیاتی بصیرت کا اظہار آڑی ترچھی لکیروں سے کرتا ہے۔ جب کہ ایک ادیب یا شاعر تحریروں کے ذریعے اپنی نفسیاتی بصیرت کا اظہار کرتا ہے۔

جدید نفسیات سے کہیں پہلے کولرج نے نفسیاتی ادبی مباحث کی بنیاد ڈالی تھی۔ گرچہ کولرج رومانی تنقید کا علمبردار تھا لیکن کولرج کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس نے پہلی دفعہ ادبی تنقید کو محض فن پاروں کے اچھائی و برائی کے نقطہ نظر سے بلند ہو کر اس کی فلسفیانہ گہرائی کو مدنظر رکھا۔ اس کے مطابق شاعری کی طرح تنقید کا سرچشمہ بھی روحانی قوت اور الہام ہے۔ تنقید در اصل فن پارے میں شاعر کے تخیل کی کارفرمائیوں کی منفرد صورتوں کا جائزہ پیش کرنا ہے اور یہی نقاد کا اصل منصب ہے۔ دونوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ شاعر تخلیق کرتا ہے جو ایک نزاع کا امتزاج ہے جب کہ نقاد تنقید کرتا ہے جو ایک طرح کی تحلیل ہے، کولرج، ورڈز ورتھ اور شیلے تینوں ہی نے حسن، مسرت، اور جذبات پر زور دیا ہے۔ Lionell trilling نے اپنی کتاب Liberal Imagination میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انیسویں صدی میں جب رومانی ادب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اس کی ایک انتہائی صورت تحلیل نفسی تھی۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں تحلیل نفسی کو فروغ حاصل ہوا۔ تحلیل نفسی نے نفسیات کو نئی وسعت اور گہرائی دی چنانچہ زندگی اور فن کی دیگر صورتوں کی مانند ادبی تنقید بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی، لیکن کوئی خاص رہنمائی بھی نہ ہو سکی۔ تحلیل نفسی کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ ادب میں فرد کی شخصیت، سماجی اور عمرانی حقائق کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔

سماج میں انتشار اور تشویش کا پہلو ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا۔ یہ وہاں کے حالات، مخصوص سماجی نظام اور فلسفیانہ نظام فکر پر منحصر ہے لیکن اس کا اثر نوع انسانی پر یکساں پڑتا ہے۔ فرائڈ کے نظریات بھی انھیں نکات پر مبنی ہیں۔ دراصل فرائڈ نے انیسویں صدی کے وسط (1856) میں آسٹریا میں آنکھیں کھولیں۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ میں سرمایہ داری نظام زوال پذیر تھا اور اس کے اثرات عام لوگوں کی زندگی پر پڑ رہے تھے۔ انتشار کے اس ماحول میں ذہنی نا

آسودگی اور جذباتی تسکین دونوں ہی موضوع بحث تھے۔ اس کے پیش نظر فرائڈ شخصیت کو تین حصوں ID، Ego اور Super Ego میں تقسیم کرتا ہے۔ ID کو وہ شدت پسندی کی اس رو سے تعبیر کرتا ہے جو سماجی زندگی میں نا پسندیدہ اور غیر مہذب قرار دی جاتی ہیں۔'اڈ' (ID) فرد کی نمائندہ ہے۔ Ego اور Super Ego کو وہ سماجی زندگی سے تعلق رکھنے والے مہذب رشتے سے تعبیر کرتا ہے۔

جہاں ایک بچہ اپنی جائز و ناجائز خواہشوں کو بظاہر والدین کی پھٹکار سمجھ کر قبول کر لیتا ہے لیکن 'انا' کی یہ جنگ اسے SuperEgo کی سمت لے جاتی ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں فرائڈ انسان کی دو فطری جبلتوں کا ذکر کرتا ہے، یعنی جبلت حیات اور جبلت موت۔ 'انا' کی فتح، ذہنی آسودگی اور خواہشات کی تسکین اسے جبلت حیات کی طرف لے جاتی ہے اس کے برخلاف پیدا شدہ صورت حال اسے جبر وتشدد، ایذا رسانی اور خود اپنی ذات کو اذیت دے کر لذت کرنا جبلت موت کی ترغیب دیتی ہے کیونکہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے پورا ہونے کے عمل میں رکاوٹ، رد عمل کے طور پر جارحانہ رجحان کو فروغ دیتی ہے۔ فرائڈ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ

"ہر شعوری فعل کی تہہ میں لاشعور کی کارفرمائی ہوتی ہے، یہ لاشعور جبلی زندگی کا سر چشمہ اور نسلی ورثہ کا گودام ہے۔"

جنسیات کو فرائڈ نے ایک مبہم اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے، جو بچپن سے سن بلوغ تک پہنچنے کے دوران وقوع پذیر ہوتی ہیں اور جب ہماری شعوری زندگی کے معیار سے ٹکراتی ہیں تو اظہار میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ فرائڈ نے ذہنی اور جنسی ہیجان کے تشفی بخش اور غیر تشفی بخش ہونے کا سبب جنسی عدم مساوات کو مانا ہے اور کہتا ہے کہ اسی بنا پر سماج میں عورتوں کو ثانوی درجہ حاصل ہے۔ سماج میں عورت کی نابرابری ایک الگ موضوع بحث ہے جس کے کئی جواز ہیں۔ سائنسی نقطہ نظر، مذہبی نقطۂ نظر اور سماجی نقطہ نظر۔ یہی وجہ ہے کہ فرائڈ کا نظریہ لاشعور اور تحلیل نفسی کا نظریہ اب بھی متنازعہ فیہ ہے۔

یہاں ایک بات بتاتی چلوں کہ فرائڈ اور ایڈ لیرو یونگ کے نظریے کا بنیادی فرق یہ ہے کہ فرائڈ خواب کو لاشعور میں پوشیدہ خواہشات کے مظاہر مانتا ہے جب کہ یونگ اسے ابدیت سے تعبیر کرتا ہے اور خواب میں گزرے ہوئے واقعات، علامات اور اشارات کو Archetype کہتا ہے جو نسل در نسل قوم کا ورثہ بن جاتے ہیں اور جسے وہ اجتماعی لاشعور کا نام دیتا ہے اور یہ بھی کہ ہر قسم کے تنقیدی افکار میں خواہ وہ شخصی ہوں یا ذاتی، نفسیاتی پہلو ذاتی رجحانات اور جذبات و احساسات کا تجزیہ بن کر یا تخلیقی پیرایۂ بیان کا عنصر بن کر داخل ہو جاتے ہیں۔ خاص کر اظہار جذبات میں نفسیاتی بصیرت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موضوع کی مناسبت سے اس بات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ تخلیق کار ہو یا تنقید نگار خیالات کے اظہار میں اپنی ان نفسیات سے ضرور کام لیتا ہے جو اس کے شعور تحت الشعور یا پھر لاشعور میں موجود رہتی ہیں۔ تخلیق کار اپنے فن کی وجودیت کے لیے اس کو بروئے کار لاتا ہے۔ جب کہ نقاد شخصیت کی ارتقا کے لیے اس کا سہارا لیتا ہے۔

اردو ادب میں جدیدیت کے ابتدائی دور میں جن نقادوں نے مغربی اثرات قبول کیے اور اسے مشرقی افکار و نظریات کے امتزاج سے اپنی تنقید کا حصہ بنایا اور بعض نئے تصورات و خیالات پیش کیے حتیٰ کہ ادب کی قدر و قیمت متعین کی۔ ان میں آزاد، حالی اور شبلی کا نام نمایاں ہے۔ گرچہ ان کے تذکرے اور تحریریں نظریاتی تنقید کا نمونہ پیش کرتی ہیں، لیکن اظہار خیال میں نفسیاتی بصیرت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ غیر شعوری طور پر ہی سہی لیکن ان کی تحریروں میں نفسیاتی تنقید کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ وحید الدین سلیم اور مرزا رسوا کی تحریریں بھی نفسیاتی تنقید سے متاثر نظر آتی ہیں۔ دونوں حضرات نے اس نظریے سے متاثر ہو کر چند مضامین لکھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے یہاں تک کہ وہ ترقی پسند نقاد جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک خاص نظریے کے حامی اور سماجی، معاشی، تاریخی و فلسفیانہ پہلوؤں سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں ان کے یہاں بھی سماجی بے ضابطی، داخلی کشمکش اور طبقاتی فرق کی تلاش، فرد کی نفسیات میں ہی نظر آتی ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کہ اردو میں نفسیاتی تنقید کا باقاعدہ ارتقا عہد جدید میں ہوا جس میں مغربی افکار و نظریات شامل رہے۔ نفسیاتی تنقید کو باضابطہ طور پر متعارف کرانے کا سہرا میراجی کے سر ہے۔ نفسیاتی الجھنیں میراجی کی نظموں کا خاص موضوع ہیں۔ میراجی نے مغربی اثرات سے متاثر ہو کر آزاد نظم نگاری کے ساتھ جنسی اور لاشعوری علامتوں کے استعمال سے اردو شاعری میں ایک نئی تحریک کو جنم دیا۔ میراجی نے ساری زندگی ذہنی کشمکش اور نفسیاتی الجھنوں میں بسر کی۔ غم حیات، عشق میں ناکامی، جنسی نا آسودگی ان کی شاعری میں صاف نظر آتی ہے۔ ان کے مضامین میں "مشرق و مغرب کے نغمے" نفسیاتی تنقید پر مبنی ہیں۔ میراجی کے بعد نفسیاتی تنقید نگاروں میں حسن عسکری، رفیع الزماں، ریاض احمد، سلیم احمد، سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر محمود الحسن رضوی، شکیل الرحمٰن وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ جو فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی کے حامی ہیں۔ جب کہ وزیر آغا یونگ کے اجتماعی لاشعور کے نظریے سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ اس کی بنیاد وہ ثقافتی جڑوں کی تلاش کو مانتے ہیں جو تقسیم وطن کی پیدا کردہ ہیں۔ تقسیم وطن اور فسادات کے بعد بہت سے عوارض پھیلے جن کی عکاسی اس زمانے کے ادب میں کی گئی۔ احتشام حسین کے اس اقتباس کو پیش کرتے ہوئے میں نفسیاتی تنقید کی اہمیت کو مزید واضح کرنا چاہتی ہوں۔

"اعلیٰ ادب ادیب کی شعوری قوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسے اس کے معمولی اور وقتی ہیجان کا نتیجہ قرار دے کر نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اچھا ادب وقت کی چیز ہوتے ہوئے بھی ہر وقت کی چیز ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں انسانی شخصیت کی جو بالیدگیاں اور امکانات چھپے ہوئے ہیں انھیں بھی دیکھنا چاہیے اور ان حالات کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے بلکہ زندگی اور انسانی فطرت کو اس کی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ سمجھنا چاہیے۔ روایت اور تغیر کا تاریخی احساس رکھنا چاہیے اور رائے دینا چاہیے کہ کسی مصنف یا ادیب نے کہاں تک زندگی کو مسرتوں سے معمور کیا ہے۔"
(اصول نقد کا تعین، پروفیسر احتشام حسین، نگار، فروری - مارچ 1946، صفحہ 29)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فن پارہ اور فن کار کی صلاحیت کی حقیقت اور اصلیت کو نفسیاتی تنقید کی میزان پر نہیں تولا جا سکتا۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ تعین قدر کا مسئلہ نقطۂ نظر پر موقوف ہوتا ہے۔ نہ کہ نقطۂ صفات پر نقاد کا بنیادی کام تعین قدر ہے۔ جب تک نقاد کا نقطۂ نظر واضح نہیں ہوگا فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین ممکن نہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اردو میں نفسیاتی تنقید نے نفسِ انسانی کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ فن کار کی شخصیت اور اس کے کردار کے مختلف پہلوؤں اور ادبی رجحانات کو اجاگر کیا ہے لیکن اس کی یہ کوشش تشریح و تعبیر تک محدود رہی۔ لیکن نفسیاتی تنقید نے فن پارے کی روشنی میں فن کار کی نفسیاتی کشمکش اور ذہنی پیچیدگیوں کو سامنے لانے میں اہم رول تو ضرور ادا کیا لیکن انہی فنی بندشوں کے سبب قدر و قیمت اور اصول وضع کرنے میں معاون ثابت نہیں ہوئی اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی نفسیاتی تنقید کو جدید اردو تنقید میں خاص مقام دینے میں پس و پیش ہے۔

■

Dr. Nusrat Jahan
75, Phears Lane
Kolkata - 700073 (West Bengal)
Mob.:9433108905

مرد ادیبوں کی تنقید میں تانیثی رجحان

غزالہ فاطمہ

'تانیثی تنقید' کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد کے دور کو مانا جاتا ہے۔ عالمی سطح پر بیسویں صدی کے وسط سے 'تانیثیت کی تحریک' کا فروغ ہونے لگا تھا اور تحریک کے اثرات سماجی نظام کے مختلف شعبوں میں نظر آنے لگے تھے۔ اس تحریک سے وابستہ مفکرین نے تمام شعبہ ہائے حیات میں 'نسائی فکر و احساس' کی عدم موجودگی اور خواتین کے تجربات اور ان کے فکری کارناموں پر عدم توجہ کی نشان دہی کی نیز علم و ادب اور تعلیم و تحقیق کے شعبوں میں نسائی فکر و احساس کی عدم شمولیت پر سخت تنقیدیں کیں۔ ان کی شمولیت پر کافی زور دیا۔ بلکہ نسائی نقطہ نظر سے، تاریخی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی سیاق کے مطالعے کو سماج کے لیے ناگزیر قرار دیا۔

اردو میں تانیثی تنقید بھی دیگر جدید تنقیدی نظریات کی طرح مغربی افکار کی دین ہے اگرچہ مغربی زبانوں کے ادب میں تانیثی نظریات یا نقد ادب کے سلسلے میں تانیثی نقطہ نظر کی شروعات کو عرصہ ہو گیا تاہم اردو میں 'تانیثی تنقید' کے باقاعدہ آغاز کو دیکھیں تو وہ ہمیں پچھلے تقریباً تین دہوں پر محیط نظر آتا ہے۔ اردو میں تانیثی تنقید کے رجحان کو مابعد جدیدیت کے دور میں فروغ ملا۔ مابعد جدیدیت کے دور میں وسائل و فکر کے حوالے سے 'مرکزیت' کے تصور کو ختم کیا گیا جس کے نتیجے میں سماج میں حاشیائی حیثیت کے حامل افراد کی طرف توجہ مبذول ہوئی اور ان کے علمی، عملی و فکری کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کی کوششیں تیز ہونے لگیں۔ چنانچہ کسی حد تک خواتین کے ادب پر بھی توجہ دی جانے لگی اور ادب کو تانیثی نقطہ نظر سے جانچنے کے رجحان کی ابتدا ہوئی۔

اردو زبان کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ہندوستان میں 'تانیثی تنقید' پر کوئی باقاعدہ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ ابھی نظر نہیں آتا ہے۔ البتہ پاکستان میں اس نظریہ تنقید پر بے حد اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ 'فیمنزم اور ہم، خاموشی کی آواز، ادب کی نسائی ردتشکیل، عورت خواب اور خاک کے درمیان، عورت زندگی کا زنداں وغیرہ چند ایک قابلِ ذکر نام ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب میں آج بھی تانیثی تنقید کو شجر ممنوعہ سمجھنے کا رجحان غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں تانیثی تنقید اب تک آزادی سے پھل پھول نہ سکی۔ مستقبل میں تانیثی تنقید کی سمت و رفتار کیا ہوگی اور منظر نامہ کس نوعیت سے تبدیل ہوگا یہ کہنا ابھی مشکل ہے۔ تاہم اس ضمن میں چند وسیع النظر افراد کی تحریروں کے پیشِ نظر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ادب کے حوالے سے عورت کو انسان کی حیثیت سے قبول کرنے اور اس کے اظہار ذات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوششیں امید افزا ہیں۔ یقیناً آئندہ یہ رجحان اردو میں ایک جدید نظریہ تنقید کی حیثیت سے اپنا گہرا رشتہ بنا لے گا۔

تانیثیت اور تانیثی تنقید کی انفرادیت تب متعین ہوئی جب اس نے اپنے عہد کے، سماجی، سیاسی، لسانی اور تھیوری کے متعلق فلسفوں سے روشنی حاصل کرنی شروع کی۔ مثلاً مارکسی تھیوری، ساختیات، پس ساختیات، فلسفہ لسان، نفسیات، سماجی، سائنسی، تحلیل نفسی، تاریخ وغیرہ کے علوم سے تانیثیت پسندوں نے استفادہ کیا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ ان علوم میں عورت کو کس طرح پیش کیا گیا ہے یا انھیں جہاں بھی نظرانداز کیا گیا ہے تو کیوں؟ The second sex(1949) میں ہی پہلی مرتبہ بین العلومی طریق کاروں سے مصنفہ نے کام لیا تھا۔ 1960 میں ہیلین سسکوس اور جولیا کرسٹوا نے تانیثی تنقید کا ایجنڈا اپنایا۔ ہیلین کے مطابق زبان کے اندر موجود جوڑے دار ضدین جو پدرانہ نظام پر مبنی ہیں ایک خاص طرح کے معنی کی تشکیل کرتے ہیں اور اس مرد معاشرے نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت عورت کو معروف کے بجائے مجہول قرار دے دیا ہے۔

اردو میں تانیثی تنقید کا ایک اہم سنگ میل 2000 میں شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں منعقدہ سمینار ہے۔ اس سمینار کا عنوان 'بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب' تھا۔ سمینار کا انعقاد پروفیسر عتیق اللہ کی کوششوں سے عمل میں آیا تھا۔ پیش کیے گئے تمام مقالات کو کتابی شکل میں 2000 میں شائع کیا گیا، جن میں تانیثی ڈسکورس پر مکمل بحث کی گئی۔ اس میں تانیثی نظریہ تنقید کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مغربی زبانوں کے مفکرین کے 'تانیثی تنقید' سے متعلق خیالات کو اردو میں متعارف کرانے والے نقادوں میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کو اولیت حاصل ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مباحث کے ساتھ ساتھ انھوں نے مغرب کے حوالے سے اردو تانیثی تنقید کو بھی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ 'بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب' میں تینتیس مقالے شامل کتاب ہیں جس میں زیادہ تر مرد ادیبوں اور ناقدین کے مقالے ہیں۔ چند خواتین کے مقالے بھی شامل ہیں۔ اس باب میں ہم برصغیر کے چند اہم مرد ادیبوں کی تنقید میں تانیثی رجحان کا جائزہ لیں گے۔ یوں تو اردو میں بہت سے ادیبوں کی تنقید میں تانیثی رجحان موجود ہے۔ اردو کے جن ادیبوں کی تنقید میں تانیثی رجحان ملتا ہے ان میں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ، سید عقیل احمد، دیوندر اسّر، ابوالکلام قاسمی، قاضی افضال حسین، نظام صدیقی، محمود شیخ، یوسف سرمست، ظہیر الدین، عقیل احمد صدیقی، خالد اشرف، علی احمد فاطمی، سلیم شہزاد، حقانی القاسمی، مشتاق احمد وانی، ناصر عباس نیر، اکرم کنجاہی، ریاض صدیقی، انیس ناگی، وارث میر، نعیم صدیقی، منیر احمد، امین حسن، یاسر جواد، ضمیر علی بدایونی عبدالعزیز ہاشمی، ڈاکٹر مولا بخش اور ڈاکٹر ندیم احمد، وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا شمار اردو زبان کے قد آور ناقدین میں ہوتا ہے۔ تنقید کے میدان میں انھوں نے جو کچھ لکھا بے باک لکھا۔ مختلف اصناف کی تنقید پر ان کی تقریباً آدھا درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جسے اردو تنقید میں قابل قدر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اسلوبیاتی، لسانیاتی اور صوتیاتی نظریے کو پیش نظر رکھا جس سے ادب کی تفہیم میں مدد مل سکے۔ وہ تنقیدی افکار کسی

سے مستعار نہیں لیتے بلکہ اپنے افکار خود قائم کرتے ہیں۔

تانیثیت کی تفہیم کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی کا ماننا ہے کہ تانیثیت کے دو بنیادی تصورات ہیں۔ پہلا: بنی نوع انسان، دو طبقے مرد اور عورت میں بٹا ہوا ہے۔ دونوں اپنے اپنے طبقے میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی کرتے چلے آرہے ہیں۔ مرد و عورت دونوں طبقے کے باہمی تعلقات کی آویزش کا مطالعہ جنس (Gender) کے اصطلاحی لفظ کے تحت ہوتا ہے۔ جنس اور صنف یعنی Gender اور Sex دونوں کے تصور مختلف ہیں۔ اس کی تفصیل کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''عورت اور مرد کے درمیان صنفی اختلاف کی بنیاد پر کسی طبقے کو کم تر یا بہتر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یعنی یہ کہنا غلط ہے کہ عورت بطور صنف نازک مرد کے مقابلے میں کمزور یا کم عقل ہے۔ یہ بھی کہنا غلط ہے کہ بعض خصوصیات مثلاً نازک دلی، رقیق القلبی، شرم و حیا، ضد وغیرہ عورتوں میں مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں عورتوں کے بارے میں تصورات معاشرے میں رائج ہیں وہ اصلاً اور اصولاً معاشرہ کے وضع کردہ ہیں حقیقی نہیں''

(تانیثیت کی تفہیم، شمس الرحمٰن فاروقی، مشمولہ کسوٹی جدید نسائی ادب نمبر ص 13)

شمس الرحمٰن فاروقی نے تانیثیت کے چند اصول بیان کیے ہیں جو کہ اوپر بیان کیے اصولوں کی روشنی میں متعین ہوتے ہیں۔

1 متن کی قرأت کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک مردوں کا دوسرا عورتوں کا اور دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔

2 مردوں کے تخلیق کردہ متن میں عورتوں کے خلاف شعوری یا غیر شعوری تعصب ضرور ہوگا۔

3 ادب کی تاریخ پر بلکہ تمام تاریخ پر ہمیشہ سے مردوں کا غلبہ رہا ہے اس لیے ادب کی دنیا سے تانیثی نقطہ نظر اور ادبی متون کی فہرست سے عورتوں کے متون کا شعوری یا غیر شعوری طور پر اخراج کیا جاتا رہا ہے۔

4 نام نہاد زنانہ جذبات کا اظہار تانیثی ادب کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ تانیثیت اس کی نفی کرتی ہے لیکن اس بات کی توثیق بھی کرتی ہے کہ عورت کی اپنی شخصیت ہے اور اسے الگ سے پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

5 مارکسی اور سرمایہ داری تصور کی روشنی میں طبقات کی جو سماجی اور معاشی تقسیم کی جاتی ہے تانیثیت اس سے انکار کرتی ہے۔ کیونکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ مارکسی نظریے کی رو سے مجبور یا محکوم مرد بھی عورت کے معاملے میں اتنا ہی ظالم جابر ہو سکتا ہے جتنا کوئی ظالم مالک اپنے نوکر یا مزدور کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لیے شمس الرحمٰن فاروقی کی نظر میں تانیثی طبقاتی شعور ہی اصل طبقاتی شعور ہے۔

6 تانیثی تنقید، ادب میں عورت کو نہ صرف اس کا صحیح مقام دلانا چاہتی ہے بلکہ گزشتہ اور موجودہ ادب میں عورت کے نقطہ نظر کے اظہار کی کمی کی تلافی بھی کرنا چاہتی ہے۔ تانیثیت کا یہ دعویٰ ہے کہ عورت کے بنائے ہوئے متن کو مرد پوری طرح سمجھ نہیں سکتے۔

ان اصولوں کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تانیثیت کو نسائیت یا زنانہ پن کہنا تانیثیت کے تمام اصولوں کی نفی کرتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے یہاں تانیثیت مارکسی نظریہ و فکر کو نہیں مانتی کیونکہ مارکسی فکر عورت کے الگ وجود کو طبقاتی تقسیم میں جگہ نہیں دیتی ہے۔ تانیثیت اور تحلیل نفسی فکر میں بھی کوئی خاص ہم آہنگی نہیں ہے کیونکہ فرائڈ کی فکر تمام انسانی معاملات و تعلقات کو مرد کی جنسیت سے جوڑ دیتی ہے۔ بعض ناقدین نے تانیثیت، مارکسیت اور تحلیل نفسی کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس پر شمس الرحمٰن فاروقی نے بہت ہی اہم سوال اٹھائے ہیں کہ کیا کوئی فکر اس اجتماع سے پیدا ہو سکتی ہے؟ یا نہیں۔

اردو میں ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات کے اہم بنیاد گزاروں میں گوپی چند نارنگ کا نام آتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے وابستہ تصورات کی جو تشریح کی ہے یا نظریات پیش کیے ہیں اس نے کئی دہائیوں تک مختلف نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ ان کا مطالعاتی دائرہ شاعری، فکشن، نظری تنقید، لسانی مباحث، اسلوبیات، ہیئتی نظریات اور تہذیبی مطالعات تک پھیلا ہے۔ کلاسیکیت سے ان کی فطری وابستگی ہے۔

گوپی چند نارنگ کو مغربی مفکرین کے خیالات جو تانیثی تنقید سے متعلق ہیں۔ اردو میں متعارف کرانے والے نقادوں میں اولیت حاصل ہے۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت کے مباحث کے ساتھ ساتھ انھوں نے مغربی ناقدین ایلین شووالٹر، ژاک دریدہ، جولیا کرسٹیوا وغیرہ کے تانیثی افکار کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اردو میں تانیثی تنقید جو بہت پیچھے ہے اس بارے میں وہ اظہار افسوس کرتے ہیں:

''ہم ابھی بیدار ہو رہے ہیں اس ضمن میں کنڑ زبان اور اس کا ادب سب سے آگے ہے۔ ملیالم جہاں صوفی صد خواندگی ہے وہ بھی اس سے بہت آگے ہے۔ بنگالی، ہندی، گجراتی، پنجابی، مراٹھی وغیرہ زبانوں میں نیا ڈسکورس Femnism کے نام سے شروع ہو چکا ہے۔ ترقی پسندوں کی ایک باقیات الصالحات یہ بھی تھی کہ عورتوں کا ادب مردوں سے الگ نہیں اس بات پر زاہدہ زیدی اور ساجدہ زیدی بھی اصرار کرتی ہیں۔ جیلانی بانو نے تو ہلکا سا اشارہ کیا کہ اگر عورت کا ادب علیحدہ ہے تو ایک سمینار مردوں کے ادب پر بھی ہونا چاہیے۔''

(بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب، عتیق اللہ، ص 27)

مغربی تنقید اور عالمی سطح پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس کا بہت وسیع مطالعہ رکھنے والوں میں ایک اہم نام پروفیسر عتیق اللہ کا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ بنیادی طور پر نظری تنقید ان کا میدان ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے کچھ نئے تجربے بھی کیے ہیں جیسے ماحولیاتی تنقید کا ہمارے یہاں کوئی رجحان نہیں تھا۔ عتیق اللہ نے اس میدان میں قدم رکھا اور اسے اردو میں متعارف بھی کروایا ہے۔ اردو میں نظری مباحث کے حوالے سے عتیق اللہ کا نام بہت نمایاں ہے۔ خاص طور پر تانیثی تنقید کے تمام نظریوں کو وہ پیش نظر رکھتے ہیں۔

''تانیثی تنقید اپنی اکثر صورتوں میں ایسے ہر مطالعے کے رد کا نام ہے جس کا اصرار مرد وزن جیسے کرداروں کی علاحدہ علاحدہ متعصّبانہ تخصیص پر ہے۔ بشریات کی تاریخ کی روشنی میں یہ تو مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے کہ کسی خاص دور میں یا ماضی میں نسوانی کرداروں کا مطالعہ کسی حد تک صحیح یا غلط ہوا؟ اس کی وجوہ کیا تھیں؟ تنقید نگاری کی قدر شناسی کی کسوٹی کیا تھی؟ گذشتہ تصورات ہی کی اس نے توثیق یا توسیع کی ہے یا اپنی بصیرت کا بھی استعمال کیا ہے؟ وہ کون سے تعصّبات ہیں جو صحیح قدر شناسی کی راہ میں پہلے بھی حائل تھے اور اب بھی ہیں؟''

(بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب، عتیق اللہ، ص 27)

تانیثیت پر ان کے دیگر مضامین موجود ہیں جن کے مطالعے سے ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تانیثیت اور تانیثی تنقید پر ان کے اہم مضامین میں تانیثیت ایک تنقیدی تھیوری، خواتین کی نظموں میں فکر کے اسالیب، تانیثی جمالیات کا تعین: شہادت و امکانات، تانیثیت ایک مطالعہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تانیثی تنقید پر ان کے مضامین رسالوں کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ تانیثی جمالیات کے تعین میں عتیق اللہ لکھتے ہیں:

''تانیثیت ایک سماجی سیاسی اور اقتصادی سیاق ہے۔ دوسرا وہ تناظر ہے جس کا تعلق ادب سے ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل ہی میں تانیثیت نے ایک مزاحمتی کردار کے طور پر فرانس اور امریکہ کی حدود سے نکل کر یورپ کے کسی دیگر ممالک میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ سماجی طور پر تانیثی تحریک نے اس پدرانہ تفوق کو نسوانی انا کی آزادہ روی، ذات کی من مانی نفسیاتی

تشکیل اور اقتصادی آزادی کی راہ میں انسانی فطرت کے خلاف گردانا جو اخلاقی اور تہذیبی اصول سازی اور قوانین سازی میں ہمیشہ مرد اساس رہا ہے۔''
(تانیثیت ایک مطالعہ، عتیق اللہ، مشمولہ کسوٹی جدید نسائی ادب نمبر 2014 ص24)

ابو الکلام قاسمی کا شمار عصر حاضر کے ایسے نقادوں میں ہوتا ہے جن کی تنقید نگاری میں توازن اور انفرادیت جھلکتی ہے۔ تنقیدی اصول ونظریات پر انھوں نے جو بھی گفتگو کی ہے اس میں کہیں بھی الجھاؤ یا ابہام نہیں ملتا ہے بلکہ موضوع وموقف پر ایسا ارتکاز ملتا ہے کہ بعض اوقات ان کے موقف سے اختلاف کے باوجود قاری ان کی سلیقہ مندی کا قائل ہو جاتا ہے۔ 'تانیثی ادب کی شناخت اور تعین قدر' قرۃ العین حیدر اور نسائی حسیت کا رجحان' وغیرہ ان کے ایسے مضامین ہیں جن کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان موضوعات پر ابو الکلام قاسمی نے اس وقت قلم اٹھایا جب بہت کم ادیبوں نے ان کی طرف توجہ دیا اور نو آبادیاتی فکر کو اردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی سے ہم آہنگ کرنے نیز تانیثی ادب کی اطلاقی صورتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''تانیثی ادب کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو، مغرب کی زبانوں کے مقابلے میں اردو کا معاملہ زیادہ افراط وتفریط کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے معاشرتی نظام کے زیر اثر ادب میں بھی پدری نظام کی بالادستی شعوری سے کہیں زیادہ تحت الشعوری گہرائیوں میں پیوست ہے، کہ خود عورتیں بھی عموماً جنسی تفریق پر قائم اپنے ادبی سرمائے پر قانع ہیں اور ان کے رویے اپنی محکومیت کے رجحان کو تقویت دینے میں کچھ کم معاون نہیں۔''
(تانیثی ادب کی شناخت اور تعین قدر، ابوالکلام قاسمی، بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب، عتیق اللہ، ص62)

قاضی افضال حسین کو مابعد جدید ناقدین میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ بطور خاص تانیثیت، مابعد نوآبادیاتی تنقید کے علاوہ تازہ ترین عالمی رجحانات ادب پر ان کی نظر ہے۔

قاضی افضال کا مضمون 'متن کی تانیثی قرأت' ان کی گہری بصیرت اور شعور کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یہ مقالہ 2000 میں دہلی یونیورسٹی میں منعقدہ سمینار 'بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب' میں پیش کیا گیا تھا۔ اس مقالے میں قاضی افضال نے متن کی تانیثی قرأت پر مدلل بحث کی ہے اور اسے مثالوں کے ساتھ سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ عورت کے استحصال کی تمام صورتوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے قاضی افضال حسین لکھتے ہیں:

''مبادلے کی اس روایت میں عورت کے استحصال کی تمام شکلیں شامل ہیں۔ چنانچہ بہ قول Gayle Rubin عورت شادی میں دان کی جاتی ہے، جنگ میں جیتی جاتی ہے، بدلے میں پیش کی جاتی ہے۔ اپنا کام نکالنے کے لیے بطور رشوت دی جاتی ہے اور انھیں خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ Rubin مزید کہتی ہے کہ خریدے اور بیچے تو غلام بھی جاتے ہیں بلکہ شاعر، موسیقار، مصور اور کھلاڑیوں کے مبادلے کی بھی متعدد شکلیں ہیں لیکن ان کی تجارت ان کے اوصاف اور مخصوص صلاحیتوں کی بنیاد پر ہوتی ہے جب کہ عورت صرف عورت ہونے کے سبب مال تجارتی بن جاتی ہے۔''
(متن کی تانیثی قرأت، قاضی افضال حسین، مشمولہ کسوٹی جدید نسائی ادب نمبر ص 32)

عورت کے مبادلے کی مختلف صورتوں کو قاضی افضال نے مثالوں کے ساتھ بہترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے کہ ناول امراؤ جان میں امراؤ جان کی داستان اگرچہ صیغہ واحد حاضر میں بیان کی گئی ہے۔ جس کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمام واقعات کو امراؤ جان ایک عورت کے نقطہ نظر سے بیان کرتی ہیں لیکن چونکہ نسائی تشخص ضرور ناول میں شامل ہے لیکن ناول لکھنے والا تو ایک مرد ہی ہے اسی لیے نسائی تشخص کے باوجود بھی راوی انھیں اقدار کا حامل ہے جو اصلاً مرد اساس ہیں۔

علی احمد فاطمی کی نظریاتی وابستگی بہت صاف طور پر مارکسزم، اشتراکیت، کمیونزم اور ترقی پسندی سے ہے۔ تانیثیت کو وہ مارکسزم سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ تانیثی نقطہ نظر سے ان کا مضمون 'ممتاز شیریں... اپنی نگریا سے میگھ ملھار تک' اہمیت کا حامل ہے جس میں انھوں نے تانیثیت کے مختلف پہلوؤں کا عملی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ تحریک نسواں اور سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے تانیثیت پر بحث کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ممتاز شیریں کی تخلیقات کو تانیثیت اور ترقی پسندی سے جوڑ کر دیکھنے کی سعی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود شیخ تانیثی تنقید کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تنقید، جدید تنقید کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے وہ جدید تانیثیت کے خلاف ہیں وہ مدلل انداز میں اس کی پر جوش مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ان کے مضامین ادبی تانیثیت چند معروضات، نئی ادبی تاریخیت، نثری ادب میں خواتین کی زبان وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے محمود شیخ کے ادبی اور تنقیدی رویے کی گہرائی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ شاعری میں جو جدید تانیثی رجحان ملتا ہے محمود اس کے خلاف ہیں۔ وہ فہمیدہ ریاض اور ترنم ریاض کی شاعری جو تانیثیت کے حوالے سے ہیں اسے نام نہاد قرار دیتے ہیں اور اس پر سخت تنقید بھی کرتے ہیں۔ کشور ناہید کی بھی بعض تحریروں کو محمود شیخ نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور اس نام نہاد جدید تانیثیت کی پول اپنے مدلل انداز سے کھولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی تنقید میں ہمیشہ توازن برقرار رہتا ہے۔ اسی طرح ترنم ریاض کی تانیثیت کے زیر اثر لکھی گئی نظم کو بھی انھوں نے نشانہ بنایا ہے۔

جدید تانیثی شاعری میں جنسی اور مادی ناآسودگی پر مبنی خیالات کو محمود شیخ نے سخت ناپسند کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے افسانے اور ناولوں کو بھی اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔

مشتاق احمد وانی نے تانیثی ادب کا نہایت گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ تانیثیت کے حوالے سے ان کی تصنیف 'اردو ادب میں تانیثیت' ہے۔ جس میں تانیثیت سے متعلق مختلف موضوعات ونوعیت کے مضامین شامل ہیں۔ پوری کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں تانیثیت کی مکمل وضاحت کی گئی ہے۔ یہ بات واضح کرنے کوشش بھی کی گئی ہے کہ تانیثیت نہ صرف عورتوں کے حقوق اور برابری کے لیے ہی آواز اٹھاتی ہے بلکہ رشتے میں پائداری اور استحکام بھی چاہتی ہے اور خودی و عرفان ذات کے اظہار کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ اسی باب کے ذیلی عنوانات میں عورت سے متعلق قدیم نظریات اور مذہب و قانون کے رویے پر بھی بحث کی گئی ہے۔ ہندوستانی سماج میں عورت کا کیا مقام ہے اور موجودہ صورت حال میں اس کے سامنے کیا کچھ مسائل ہیں؟ ان سبھی سوالوں کے جواب تاریخی، سیاسی اور سماجی پس منظر میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تانیثی تحریک چونکہ مردوں کی بالا دستی عورتوں کی حق تلفیوں اور استحصال کے خلاف ایک شدید ردعمل ہے جو مغربی ممالک امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس جیسے مغربی ممالک میں ابھری اور اس نے عورتوں کے تحفظ کے قوانین پر زور دیا۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی یہ کتاب اردو میں تانیثی تنقید میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ یوں تو اردو میں تانیثی تنقید پر بہت سے مضامین، رسائل وجرائد میں مل جاتے ہیں یا پھر ترتیب دی گئی کتابوں دیگر ادیبوں کے مضامین مل جاتے ہیں۔ لیکن تانیثی تنقید پر باقاعدہ کوئی تحقیقی وتنقیدی کتاب نہیں ملتی ہے۔ اردو ادب میں تانیثیت مشتاق احمد وانی کی تحقیقی وتنقیدی کتاب ہے جو تانیثی تنقید میں ایک روشن باب کا اضافہ کرتی ہے۔

■

Dr. Ghazala Fatima
Dept. of Urdu, JMI
New Delhi-110025
Mob.: 7530972798
Email.: ghazalaamuu@gmail.com

حنیف نقوی کی تذکرہ شناسی کے نمایاں پہلو

عائشہ ضیا

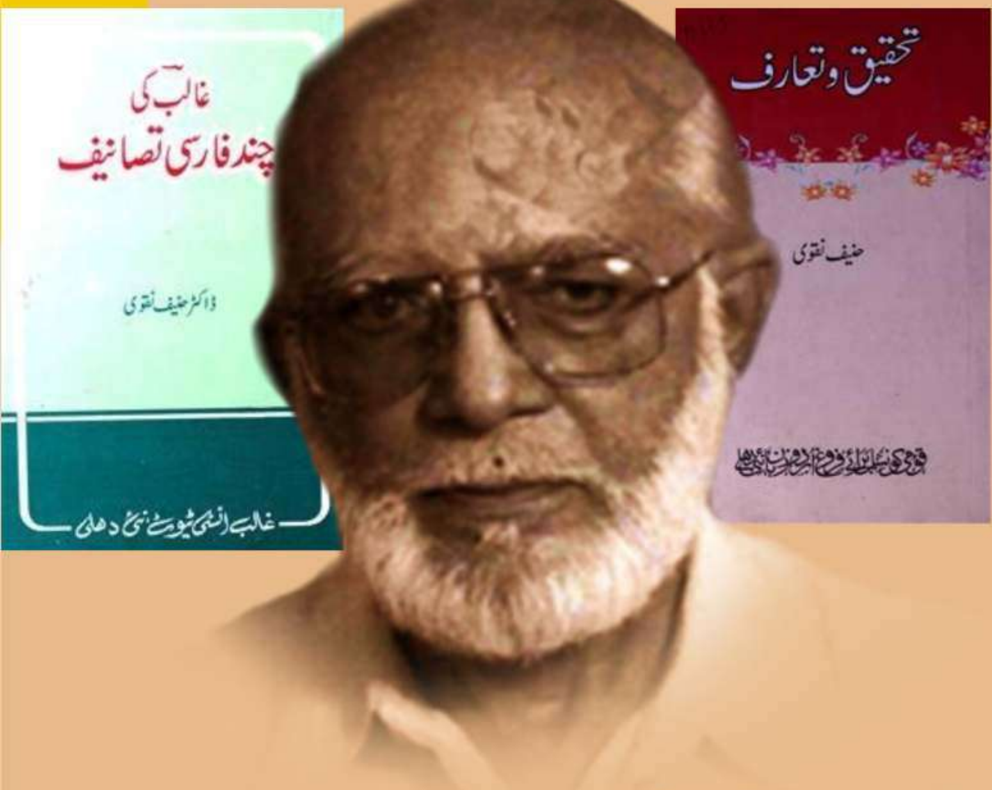

اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ تذکرے ہماری ادبی اور تنقیدی روایت کا بیش قیمت حصہ اور اثاثہ ہیں۔ تذکروں کے بغیر نہ تو ہم ادب کی تخلیق اور شعر کی تعمیر میں کارفرما شعریاتی نظام تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی ادبی روایت میں تسلسل کی تلاش کو حقیقت میں بدلنے پر قادر ہوسکتے ہیں۔ یہ تذکرے ہی ہیں جو ہمیں ہماری شاعری کو اس کی اپنی ایجاد کردہ اصطلاحات اور شعری تصورات کی روشنی میں سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ مغربی پیمانوں کے مقابلے میں ہمارے مشرقی پیمانے کیا ہیں؟ جنھیں ہم شعر اور سخن کی پرکھ اور جانچ پڑتال کے لیے استعمال کریں۔ ہمارے یہاں کلاسیکی ادبی اصناف کو خلق کرنے والے ان اصناف سے کون سے ادبی کام نکال رہے تھے؟ یا پھر کس تصور کے پیش نظر وہ لکھ رہے تھے؟ ان تمام باتوں کا علم ہمیں تذکروں سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

تذکروں کا ایک اور اہم پہلو ہے، جو ادبی تاریخ سے متعلق ہے۔ ادبی تاریخ کو قائم کرنے اور نئے پیمانوں پر اس کی بنیاد اٹھانے کا کام بھی تذکروں ہی سے انجام پاتا ہے۔ تذکرے ہی کلاسیکی ادبی روایت کا اولین سراغ ہیں۔ مختلف علاقوں اور زمانوں میں لکھے گئے تذکرے ہمیں ادبی تاریخ کا ایک تسلسل فراہم کرتے ہیں۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ہر عہد کے تذکروں میں کون سے ایسے شعرا ہیں جو تواتر کے ساتھ مذکور ہوتے آئے ہیں۔ کس شاعر کا رنگِ شاعری کیا تھا؟ یا پھر وہ کس رنگ کے لیے معروف تھا؟ یہ سارے پہلو ہمیں تذکروں سے ہی معلوم ہوتے ہیں۔

تحقیق وتدوین کے سلسلے میں بھی تذکرے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ وہ کسی شاعر کا زمانہ متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ تذکروں میں نمونے کے طور پر درج اشعار کسی متن کی ترتیب وتدوین کے وقت تقابل کے کام آتے ہیں۔ مختلف تذکروں اور مخطوطوں کے تقابل سے ہمیں الحاقی یا اضافی کلام کی شہادتیں بھی حاصل ہوجاتی ہیں۔

ادبی تذکروں کی اہمیت وافادیت کا درست اندازہ کرنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اگر ان تذکروں سے تہی دامن ہوتے تو ہم اپنے کلاسیکی ادب کو تسلسل میں کس طرح دریافت کرتے۔ ظاہر ہے ادبی تاریخ کے بہت سے پہلو، شاعروں کے حالات اور ان کے تخلیقی خصائص سے ہم محروم ہوتے۔ حنیف نقوی لکھتے ہیں:

''تذکروں نے ایسے بے شمار فنکاروں کو بے نام ونشان ہونے سے بچالیا ہے جن کے کارنامے یا تو کسی وجہ سے مدون نہ ہوسکے یا مدون ہونے کے بعد ضائع ہوگئے۔ فنکاروں کے اس زمرے میں سخنوروں کے پہلو بہ پہلو جن کے کلام کی فنی سطح زیادہ بلند نہیں، بعض ایسے اساتذہ بھی شامل ہیں جنھوں نے انتہائی نازک مرحلوں میں کاروان شعر وسخن کی قیادت کی ہے اور اپنی کوششوں سے ایک نئے عہد کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ سے یہاں بطور مثال مصطفیٰ خاں یکرنگ، خان آرزو، مرزا مظہر جان جاناں کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان اساتذہ کے کلام سے جو معدودے چند نمونے دست برد زمانہ سے محفوظ رہ کر ہم تک پہنچے ہیں وہ تذکروں ہی کے واسطے سے حاصل ہوئے ہیں۔''

(حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے 'نکات الشعرا سے گلشن بے خار تک'، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1998، ص 35)

تذکروں کی روایت ادبی تاریخ اور شاعری سے نہ صرف واقفیت کا بڑا ذریعہ ہے۔ بلکہ اس نے ہماری شاعری کی تاریخ کو بہت سے الحاقات اور گڑھی ہوئی باتوں سے محفوظ رکھنے میں مدد دی ہے۔ بیاضیں اور کشکولیں جو اہل علم کے ذاتی شوق سے وجود میں آئیں۔ ان کے اندراجات نے اختصار کے باوجود حقائق کو سامنے لانے اور روشن کرنے میں بڑی مدد کی۔ تذکرے نے اس معیار کو اور زیادہ اونچا کیا۔ وہاں احوال وکوائف قدرے تفصیل سے ہاتھ آنے لگے اور اس کے علاوہ جو اہم چیز تذکروں کے توسط سے ہاتھ آئی، وہ ہمارا مشرقی تنقیدی شعور ہے۔ کسی فنکار کے فن پاروں کے مجموعی کیف وکم کو

چند جملوں میں سمیٹنے کی روش ہے۔ اس روش نے ایک مستقل تنقیدی نظام اور فن پاروں کی معیار بندی کا تصور ہمیں فراہم کیا۔

تذکروں کا مطالعہ کیوں ضروری ہے؟ تذکروں میں موجود حقائق اور معلومات کی چھان بین بھی ایک ضروری امر ہے۔ کسی واقعے یا شخص کی ادبی زندگی کے بارے میں محض جاننا کافی نہیں بلکہ دستیاب معلومات کے پایہ ثبوت کی جانچ اور آزمائش کرنا بھی ضروری ہے۔ کسی تذکرے میں دی گئی معلومات کس حد تک درست ہیں۔ اس کے اندر بطور متن شامل کیا گیا تخلیق کاروں اور شاعروں کا تخلیقی سرمایہ صحت متن کے اعتبار سے کس حد تک قابل قبول ہے۔ تذکرے میں شامل اشخاص اور چھوڑ دیے جانے والے شاعروں کے درمیان تذکرہ نگار کی ترجیح اور عدم ترجیح کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں۔؟ بسا اوقات تذکرہ نگار کی ترجیحات اور آرا علمی و تحقیقی نہ ہو کر ذاتی اور شخصی ہوا کرتی ہیں۔ تذکروں کی تحقیق و تنقید ان تمام پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے۔

حنیف نقوی کی تذکرہ شناسی پر نظر کرتے ہیں، تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تذکروں کے مطالعے میں اپنے عہد کی عام روش سے ہٹ کر الگ طریقے پر تحقیق کی ہے۔ ہمارے یہاں جدید تنقید کے نام نہاد غلغلے سے تذکروں کی طرف علمی حلقے کا التفات خاطر خواہ نہ رہا۔ اسے گراں قدر سرمایہ خیال کرنے کے بجائے معلومات کا ذخیرہ اور تنقیدی بصیرت سے خالی توصیفی جملوں کا مجموعہ خیال کیا جاتا رہا۔ تذکروں کے بارے میں بہت سی رائیں ایسی ظاہر اور عام کی گئیں جن سے تذکروں کی واقعی اہمیت اور افادیت کا پہلو بے توجہی کا شکار ہوتا رہا اور تذکرے کم وقعت یا بے وقعت بھی خیال کیے جاتے رہے۔ حنیف نقوی نے تذکروں کے بارے میں اس زاویہ نظر کو نہ صرف غلط ثابت کیا بلکہ تذکروں کے ٹھوس مطالعے سے ادبی تاریخ کے لیے ان کی ناگزیریت، اہمیت، مقامی و ہندستانی تنقیدی شعور سے آگہی کے لیے ان کی لازمیت کو روشن کیا۔

حنیف نقوی نے اپنی بیش قیمت تالیف 'شعرائے اردو کے تذکرے نکات الشعرا سے گلشن بے خار تک' کے پہلے باب میں بہت ہی جامع انداز میں تذکرہ نگاری کے لغوی مفہوم، اصطلاحی معنی وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے بیاض اور تذکرے کے فرق کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ اور تذکرے کے امتیازات کو نشان زد کیا ہے۔ تذکرے کیوں لکھے جانے شروع ہوئے؟ تذکرہ نگاری کے پیچھے کون سے محرکات کارفرما ہوئے؟ اس نوع کے سوالات سے بحث کرتے ہوئے مصنف نے تذکروں کی معنویت اور انفرادیت کو نشان زد کیا ہے۔ اسی طرح تذکروں کی نوعیت، گروہی تقسیم وغیرہ پر تحقیقی و تنقیدی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔

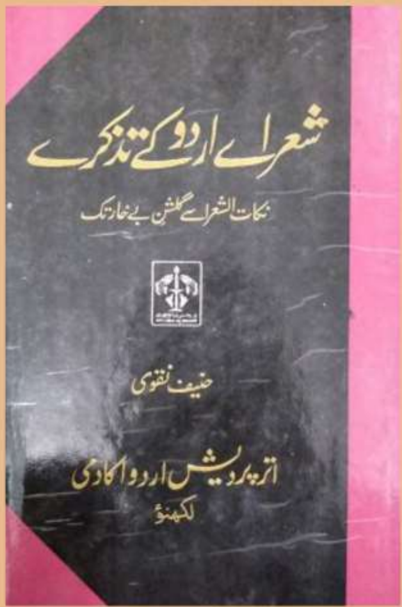

حنیف نقوی نے تذکرے کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کی تعبیر اور تفسیر کے لیے مختلف مستند لغات، قرآن کی مختلف آیات، عربی، فارسی اور اردو کے مختلف علما اور دانشوروں کے اقوال کو استعمال کیا ہے۔ تذکرہ کا لفظ کئی معنوں میں مستعمل رہا ہے۔ حنیف نقوی نے فی زمانہ لفظ تذکرہ کے اطلاق اور اس کے مدلول کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ تذکرے کا اطلاق اس کتاب پر ہوگا جس میں شعرا کے مختصر حالات اور ان کا منتخب کلام درج کیا گیا ہو۔ تذکرے، بیاض اور تاریخ کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے اور ان کی اپنی الگ الگ انفرادیت ہے۔ حنیف نقوی نے انفرادیت کو واضح کیا۔

تذکرہ اور تاریخ ہم رشتہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ حنیف نقوی نے تذکرے اور ادبی تاریخ کے فرق کو بھی بہت ہی خوبی اور باریک بینی سے واضح کیا ہے۔ حنیف نقوی نے تذکرہ نگار یا مورخ کے شعار، طریق کار، ان کی طرف سے اختیار کیے جانے والے اصول وضوابط، ان کی تحدیدات وغیرہ کو منفرد انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ نتیجے کے طور پر انھوں نے یہ بتایا ہے کہ تذکرے ادبی تاریخ کا جز بھی ہیں اور ان کی علاحدہ منفرد بنیاد بھی ہے۔

فی زمانہ تذکرہ نگاری کا سلسلہ منتہی ہو چکا اور اب اس کی جگہ ادبی تاریخ نے لے لی ہے۔ لیکن سلسلے کے منتہی ہو جانے سے تذکروں کی قدر و قیمت اور اہمیت کم نہیں ہوتی بلکہ وہ ادب کی تاریخ کو سمجھنے اور جاننے کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر ادبی تاریخ اسلاف کے کارناموں اور علمی و شعری سرمائے سے واقفیت بہم کرنے کا دوسرا راستہ تلاش نہیں کر سکتی۔ آج بھی ہمارا بیشتر کلاسیکی سرمایہ اپنے متعلق تصریحات اور معلومات کا دفتر تذکروں ہی میں بند رکھتا ہے۔ یہ سرمایہ بیاضوں، نسخوں، دستاویزات اور مختلف اہم مآخذ کی مدد سے تذکروں میں یکجا کر کے محفوظ کیا گیا۔ بہت سارے کلاسیکی شاعروں کا وجود ہماری ادبی تاریخ میں تذکروں کا رہین منت ہے، اگر تذکرے نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ کئی کلاسیکی شعرا آج گوشہ گمنامی میں ہوتے۔

تذکرہ نگاروں کے یہاں ایک ترتیب اور تنظیم کا بھی اہتمام ملتا ہے۔ اس ترتیب اور تنظیم سے مختلف تذکروں کے درمیان ہمیں فرق اور تفاوت بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس اختلاف نے تذکروں میں ایک طرح کا تنوع اور رنگارنگی بھی پیدا کی ہے، جس سے مختلف شاعروں کے احوال کے تقابل کی صورت بھی پیدا ہوئی ہے۔ کئی محققین نے تذکروں کو گروہ میں تقسیم کیا ہے، حنیف نقوی نے اس روش سے انحراف کرتے ہوئے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور سید عبداللہ، محی الدین قادری زور اور دوسرے ناقدین سے انحراف کرتے ہوئے اردو تذکروں کی تقسیم اغراض ومقاصد کے اعتبار سے کی۔ انھوں نے تذکروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے حصے میں انھوں نے تعارفی تذکرے رکھے یعنی جن کے لکھنے والوں کے پیش نظر یہ بات تھی کہ وہ اساطین شاعروں کو متعارف کرائیں۔ دوسری قسم ایسے تذکروں کی ہے جو جوابی اور انتخابی نوعیت کے ہیں، یعنی ابتدائی تذکروں کے وجود میں آنے کے بعد کچھ تذکرے ان کے جواب میں لکھے گئے اور کچھ منتخب شعرا کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے۔ حنیف نقوی نے تعارفی تذکرے کو بھی دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ حنیف نقوی کی یہ تقسیم اتنی سائنٹفک اور جامع ہے کہ تقریباً تمام تذکرے اس تقسیم یا درجہ بندی کے تحت آ جاتے ہیں۔

دوسرے باب میں مصنف نے عربی فارسی تذکرہ نگاری سے بحث کی ہے۔ اس باب میں تذکرہ نگاری کی روایت، فارسی میں تذکرہ نگاری کی ابتدا اور ہندستان کے فارسی تذکرے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ تذکرے کی روایت کا آغاز عربی سے ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد ایران میں فارسی تذکرے لکھے جاتے ہیں۔ فارسی ترسیل کی عالمی زبان ہونے کی حیثیت سے زیادہ ترسیلی امکانات رکھتی تھی اس لیے فارسی میں کئی ملکوں میں تذکرہ نویسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندستان میں بھی باضابطہ فارسی تذکرہ نگاری کی ایک روایت قائم ہوئی۔ اردو شاعروں

کے اولین تذکرے بھی اسی زبان میں لکھے گئے۔اسی سیاق میں تذکرہ نگاری کی روایت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے حنیف نقوی نے عربی، فارسی اور ہندستانی روایت کو اپنے پیش نظر رکھا اور نہایت تحقیق اور تدقیق سے اردو شاعروں کے تذکروں کے پیچھے موجود سیاق اور پس منظر کو واضح کیا۔

حنیف نقوی نے باب سوم کا عنوان 'اردو تذکرہ نگاری-آغاز سے شیفتہ تک' رکھا۔ اس باب میں انھوں نے اردو تذکروں کا تفصیلی اور تحقیقی مطالعہ پیش کیا۔ساتھ ہی انھوں نے کچھ ذیلی عنوانات بھی قائم کیے جیسے

پس منظر اور محرکات
شعرائے اردو کا اولین تذکرہ
ماحول اور ترقی کی منزلیں
ابتدائی تذکرے
تذکرہ نگاری کے مختلف مراکز
ذکا اور مصحفی کا دور

حنیف نقوی نے تذکرہ نگاری کے پس منظر اور محرکات کو نشان زد کرتے ہوئے ہندستان کی سیاسی، سماجی اور تاریخی وتہذیبی فضا کو تذکروں کی اہمیت اور تشکیلی نوعیت کو واضح کرنے کے لیے شامل بحث کیا ہے۔دکن اور شمالی ہند میں اردو زبان وادب کی ابتدا، فروغ اور ارتقا پر گفتگو کرتے ہوئے حنیف نقوی نے مختلف اصناف کی فنی خوبیوں کو دائرہ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔ان تفصیلات سے مصنف کی سماجی بصیرت، علمی وسعت اور تہذیبی شعور وآگہی کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔

تذکرے کسی ایک مقام پر ہی نہیں لکھے گئے۔ فاصلہ زمانی کے ساتھ ساتھ تذکروں کے مراکز تبدیل ہوتے رہے۔ شعراء اور سخن فہموں کی وابستگیاں احوال سیاسیہ کے بدلنے سے تبدیل ہوتی رہیں۔ دکن کا خطہ الگ احوال کا مالک تھا۔ دہلی کی دنیا الگ تھی۔لکھنؤ کی تہذیب اور زبان کا طور کچھ اور ہوا۔ اس کے علاوہ بھی دیگر مراکز تھے جو ان مقامات سے نسبتاً چھوٹے تھے لیکن ادب پروری اور شاعروں وعالموں کی قدردانی کا وہاں بھی کوئی نہ کوئی سلسلہ رہا جیسے رام پور، حنیف نقوی نے ان سارے مراکز کا ان کے زمانی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی سیاق میں جائزہ لیا ہے۔

'ذکا اور مصحفی کا دور' اس عنوان کے تحت اس عہد کے سماجی، سیاسی اور تاریخی پس منظر کا نقشہ کھینچنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے علمی وادبی ماحول، شعر وشاعری کی محفلوں اور ادبی معرکہ آرائیوں کا بحسن وخوبی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزے کو پڑھ کر ہم مصنف کے مطالعے کی گہرائی اور گیرائی تک پہنچ جاتے ہیں اور اس کے تبحر علم اور تنقیدی وتحقیقی نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس عہد کو تذکرہ نگاری کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں زیادہ تر تذکرے دہلی اور اس کے قرب وجوار میں لکھے گئے۔اس عہد کے تذکروں میں عیار الشعرا کو سب سے قدیم بتایا جاتا ہے۔ یہ تذکرہ شاہ نصیر کے شاگرد لالہ خوب چند ذکا نے شاہ نصیر کی فرمائش پر تحریر کیا۔حنیف نقوی نے اس تذکرے کی اہم خصوصیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس سے اردو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں ہمہ گیری اور جامعیت کے رجحان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے قبل جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں شعرا کی شمولیت ان کے کارناموں کے ادبی مرتبے یا پھر سہل الحصول معلومات کی پابند ہے۔'' (ص 88)

ذکا کے تذکرے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سابقہ تذکروں کی عام روش سے صرف نظر کرکے ایک اصول کی پیروی کی گئی۔ اس تذکرے میں ان شعرا کو شامل کیا گیا جنھوں نے اپنی موزونی طبع کی بنا پر شعر نظم کیے۔اس طرح جوابی تذکروں نے ایک نیک فضا پیدا کی اور چھوٹ جانے والے اہم شعرا کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ ایسے شاعر جن کے احوال بآسانی دستیاب نہ تھے ان کے احوال کو بہ مشقت حاصل کرنے کی روش بھی سامنے آئی۔ذکا کا تذکرہ ایک مؤثر تذکرہ ثابت ہوا۔اسی کے اثر میں میر محمد خاں سرور کا تذکرہ عمدہ منتخبہ اور حکیم قدرت اللہ قاسم کا مجموعہ نغز تالیف ہوا۔ اس کے بعد تو دھیرے دھیرے تذکرے منظر عام پر آنے لگے۔حنیف نقوی نے تذکروں کے اچھے پہلوؤں تک ہی خود کو محدود نہیں کیا بلکہ ان کے اسقام اور معائب کی طرف بھی انھوں نے نظر کی۔ انھوں نے تذکروں کی دستیابی کے مقامات اور تذکروں کی موجودہ حالت پر بھی گفتگو کی۔

گروہ بندی اور معرکہ آرائی کے ساتھ مرکزی کشمکش تذکرہ نویسی کے اہم محرکات اور اسباب ہیں۔اس عہد کو ہم مصحفی اور انشا کی ادبی سرگرمیوں پر محیط عہد بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس عہد کو سماجی وثقافتی تغیرات، اقتصادی ومعاشی تبدیلیوں اور ادبی وعلمی سرگرمیوں اور انقلابات کے لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے۔تذکرہ نویسی کے لیے اس صورت حال نے اسباب پیدا کیے اور یہ فضا تذکرہ نویسی کے لیے بارآور ثابت ہوئی۔مصحفی نے اس عہد میں اپنا پہلا تذکرہ عقد ثریا تالیف کیا۔اس عہد میں اس تذکرے کو اولیت وسبقت حاصل ہے۔اس کے علاوہ ریاض الفصحا اور تذکرہ ہندی بھی اسی زمانے میں تحریر کیے گئے نقوی صاحب نے مصحفی کے تذکروں کی خوبیوں اور امتیازات کو بہ طریق احسن اجاگر کیا ہے۔شیخ امام بخش کاشمیری، احد علی خاں یکتا لکھنوی اور بہادر سنگھ دہلوی جیسے تذکرہ نویسوں کا ذکر بھی حنیف نقوی نے کیا ہے۔اس عہد میں دوسرے مراکز میں جو تذکرے لکھے گئے ان کا ذکر بھی ضمنی طور پر کیا ہے۔

باب چہارم کا عنوان ہے 'نکات الشعرا اور دوسرے ابتدائی تذکرے' یہاں نکات الشعرا زیر بحث آیا ہے اس کے علاوہ دوسرے تذکرے بھی زیر بحث آئے ہیں۔گلشن گفتار، گلشن راز یا تذکرہ ریختہ گویاں، ریاض حسنی اور مخزن نکات جیسے معروف تذکروں کے مشمولات کا محاکمہ اور جائزہ شامل باب ہے۔نکات الشعرا کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شاعروں کے فنی محاسن اور معائب کی جانب واضح اشارے ملتے ہیں۔اور جابجا ملتے ہیں۔میر نے اس سلسلے میں بعض لسانی وفنی تصورات کی پیروی کی ہے۔ان کے تنقیدی زاویوں میں جامعیت، معقولیت، اور تنقیدی بصیرت کا حسین امتزاج موجود ہے۔ حنیف نقوی نے اس پہلو کا بہت ہی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

گلشن گفتار حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ ہے۔ زمانی لحاظ سے یہ میر کے تذکرے کا ہم عصر وہم زمانہ ہے۔ مصنف کتاب نے اس تذکرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی داخلی خوبیوں خامیوں کی تلاش پر محنت صرف کی۔مختلف شاعروں کے بارے میں حمید کے اندراجات کا جائزہ لیا۔ ان شہادتوں کی روشنی میں یہ رائے قائم کی کہ تذکرہ نگار نے جو طور اختیار کیا ہے وہ اس کی سہل پسندی اور تن آسانی سے زیادہ اس کی لاعلمی اور بے خبری پر دلالت کرتا ہے۔ کچھ تفصیلات اور تصریحات واقعات کے ذیل میں اس تذکرے سے ضرور حاصل ہوجاتی ہیں جو اتفاق اور خصوصی تعلق ودلچسپی کی رہین منت ہیں۔حنیف نقوی لکھتے ہیں:

''گلشن گفتار کی ترکیب کسی سنجیدہ محرک کے بجائے محض تفریح طبع اور وقت گزاری کے خیال سے عمل میں آئی تھی۔ اس لیے عام حالات میں مؤلف سے اہم واقعاتِ زندگی کے انضباط نیز شخصیت اور شاعری کی تنقید کے سلسلے میں کسی خاص تحقیق وتلاش اور غور وفکر کی توقع رکھنا مناسب بھی نہیں۔ درحقیقت یہ تذکرہ ایک ایسی بیاض کی ترقی یافتہ شکل ہے جس میں ارباب ذوق اپنا منتخب اور پسندیدہ کلام یا مختلف شاعروں کی مشہور غزلیں یا نظمیں جمع کرلیتے ہیں۔ ہماری اس رائے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے حمید نے بالعموم مکمل غزلیں یا ہم عصر شعرا کا ہم طرح کلام نقل کیا ہے۔''

(حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے 'نکات الشعرا سے گلشن بے خارتک'، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1998، ص 213)

حنیف نقوی نے گلشن راز یا تذکرہ ریختہ گویاں کا بھی مفصل جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اوسط درجے کا تذکرہ دوسروں کی خوشہ چینی اور استفادے کا رہین منت ہے۔ فتوت کے تذکرے ریاض حسنی کے بارے میں بھی ان کی رائے یہی ہے کہ یہ معیار سے فروتر ہے۔ مخزن نکات میں نقوی بعض اقسام کی نشان دہی مثلاً غیر ضروری اختصار، تفصیلات سے بالکل صرف نظر، کہیں کہیں صرف شاعر کے تخلص پر انحصار کے ساتھ اسے ایک اہم ادبی دستاویز تسلیم کیا ہے اور اسے اردو شاعری کے مدارج کو سمجھنے سمجھانے کے لیے سودمند ہی نہیں ناگزیر قرار دیا ہے۔

پانچویں باب میں بھی اہم تذکرہ نگاروں کے تذکرے زیر بحث آئے ہیں۔ چمنستان شعرا، طبقات الشعرا، تذکرہ شعرائے اردو، تذکرہ شورش، مسرت افزا، گل عجائب، گلزار ابراہیم اور گلشن سخن جیسے معروف تذکروں کو یہاں زیر بحث لایا گیا ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی کے شاگرد لچھمی نرائن شفیق کے تذکرے چمنستان شعرا کو حسن ترتیب، جامعیت، اور ادبی معیار کے لحاظ سے دکنی تذکروں میں سرفہرست شامل کیا ہے۔ شفیق کو تذکرہ نویسوں میں پہلا شخص قرار دیا ہے جو تاریخ وفات کا تعین واضح الفاظ میں کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ شفیق کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ وہ ذاتی مسائل تک پہنچنے کے لیے غور و فکر کی عادت رکھتے تھے۔ اس تذکرے کا نقص اس کے اسلوب کو قرار دیا ہے کہ یہ پر تکلف اور صناعانہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ نقوی اس تذکرے کے بارے میں اپنی مجموعی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''متذکرہ بالا لسانی وبیانی نقائص اور واقعاتی خامیوں کے باوجود 'چمنستان شعرا' ایک اہم اور قابل قدر تذکرہ ہے جو اردو شاعری کے ابتدائی دور سے متعلق تحقیق وتلاش کے سلسلے میں ایک معتبر ماخذ اور مستند ذریعہ معلومات کی حیثیت رکھتا ہے۔''

(حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے نکات الشعرا سے گلشن بے خارتک، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1998، ص 293)

علی ابراہیم خان خلیل کے تذکرے گلزار ابراہیم کو مصنف نے اس لیے اہم تسلیم کیا ہے کہ بارہویں صدی ہجری تک کی اردو شاعری کی روداد ادبی دستاویز کی صورت میں اپنے حجم میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ عظیم آباد اور مرشد آباد کے دبستان کو روشن کرنے والا یہ اہم تذکرہ ہے۔

چھٹا باب تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا، اور معاصر تذکروں مثلاً گلشن ہند، تذکرہ عشقی، طبقات سخن اور تذکرہ بے جگر وغیرہ کے تحقیقی وتنقیدی مطالعے پر محیط ہے۔ حنیف نقوی نے ان تذکروں کا تفصیلی جائزہ سال تالیف وترتیب کے مطابق پیش کیا ہے۔

حنیف نقوی نے اپنی کتاب میں نکات الشعرا سے لے کر گلشن بے خار تک کے تذکروں کے طویل سلسلے کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے میں وہ تذکروں کی تاریخی اہمیت کو ثابت کرتے ہیں۔ ہمارے متقدمین شعرا کے بارے میں تذکرے جو ناگزیر مواد فراہم کرتے ہیں۔ وہ اس کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اگر تذکروں کا سرا ہمارے ہاتھ میں نہ ہوتا تو وہ معلومات ہمارے ہاتھ نہ آتیں۔ وہ تذکرے کو نہ تاریخ کابدل قرار دیتے ہیں نہ ہی اسے سوانح مانتے ہیں بلکہ اسے آزاد صنف کے طورپر قبول کرتے ہیں۔

ساتویں باب میں 'طویل اور جامع تذکرے' کے تحت عیار الشعرا، عمدہ منتخبہ، مجموعہ نغز، گلشن بے خار جیسے مفصل اور مرتب تذکروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ تذکرے 1208ھ مطابق 1730 عیسوی تا 1250ھ مطابق 1835 کے درمیان ترتیب دیے گئے۔ یہاں بھی حسب سابق حنیف نقوی نے ان تذکروں کی نمایاں امتیازی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں استدلالی اور منطقی انداز میں بحث کی ہے۔ انھوں نے عیار الشعرا کو اردو ادب کے جمہوری کردار کی وضاحت کے نقطہ نظر سے اہمیت کا حامل بتایا۔

حنیف نقوی نے اپنی کتاب میں نکات الشعرا سے لے کر گلشن بے خار تک کے تذکروں کے طویل سلسلے کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے میں وہ تذکروں کی تاریخی اہمیت کو ثابت کرتے ہیں۔ ہمارے متقدمین شعرا کے بارے میں تذکرے جو ناگزیر مواد فراہم کرتے ہیں۔ وہ اس کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اگر تذکروں کا سرا ہمارے ہاتھ میں نہ ہوتا تو وہ معلومات ہمارے ہاتھ نہ آتیں۔ وہ تذکرے کو نہ تاریخ کا بدل قرار دیتے ہیں نہ ہی اسے سوانح مانتے ہیں بلکہ اسے آزاد صنف کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ وہ تذکروں کو کمیوں خامیوں سے مبرا نہیں قرار دیتے، نہ ہی یہ باور کراتے ہیں کہ تذکرے ہماری تمام ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ معلومات کے نقص اور غلط بیانیوں کے عوائق پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ تمام تذکروں کے مجموعی تقابلی مطالعے سے حاصل ہونے والے قدیم تاریخ ادب کے شعور کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ صرف تذکروں سے حاصل ہوسکتا ہے۔ وہ شعرائے اردو کے بعض تذکروں کو لسانی وادبی شعور کے ساتھ قدیم کلاسیکی شاعری کی تاریخ کے لیے اہم قرار دیتے ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں:

''مختصر یہ کہ تذکرے اپنی بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہماری علمی وراثت کے امین، ہمارے ادبی ذوق کے ترجمان، ہماری تہذیبی سرگرمیوں کے عکاس اور ہماری مجلسی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے اوراق خودشناسی و خودگری کے اس جذبہ صادق کے گواہ ہیں جس نے اہل ہند کے سامنے ایران کی لسانی محکومیت سے آزادی کا تصور پیش کیا، عوام کو باہمی رابطے کے لیے ایک مہذب اور شائستہ زبان عطا کی، ملک کے مختلف طبقوں کے درمیان ذہنی وفکری ہم آہنگی و یک جہتی کے ایک نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک ہمہ گیر وہمہ رنگ، لالہ کار وسدا بہار تہذیب کو جنم دیا۔ تہذیبی شناخت کی صورت گری کے اس حوالے سے اردو کی توسیع وترقی کے لیے کی گئی کوششوں کی روداد جب بھی قلم بند کی جائے گی، تذکروں سے دامن بچا کر گزرنا ممکن نہ ہوگا۔''

(حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے نکات الشعرا سے گلشن بے خارتک، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1998، ص 727)

متذکرہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ حنیف نقوی تذکروں کو محض ادبی تاریخ کے لیے ہی مفید خیال نہ کرتے تھے، وہ ان کی لسانی تہذیبی معنویت کا گہرا احساس وادراک رکھتے تھے۔ وہ ایران کی لسانی اجارہ داری سے آزادی کا زینہ تصور کرتے تھے کہ تذکروں نے اپنی مقامی روایت کو روشن کرکے ہمیں اپنی مقامی زبان پر اعتبار واعتماد کرنے کا سلیقہ سکھایا تھا۔ اس طرح سے تہذیبی ہم آہنگی اور مختلف طبقات کے ارتباط باہم کی ذہنی وفکری بنیاد مستحکم ہوئی، یک جہتی کا صاف چہرہ سامنے آیا۔ تذکروں نے تنقید کا بھی ایک تصور دیا۔ زبان کا ایک معیار بنایا۔ اچھی شاعری کے لوازم کے بارے میں ایک نظریہ دیا۔ سوانحی اور تاریخی عناصر بھی تذکروں سے حاصل ہوئے۔ تذکرے جس زمانے میں لکھے گئے، اس زمانے کے آداب مجلسی اور اخلاقی معیار واقدار پر بھی تذکروں نے روشنی ڈالی۔ ایک طرح ہم دیکھیں تو ادبی تاریخ اور لسانی تہذیب کو قلم بند کرنے کے لیے مطلوب مختلف عناصر کی فراہمی میں تذکروں نے اہم کردار ادا کیا۔ تذکروں کی ان تمام خوبیوں کو واضح کرنے اوران کی تحقیقی قدر وقیمت کا تعین کرنے کے لحاظ سے یہ نہ صرف وقیع بلکہ نادر تحقیق کا درجہ رکھتا ہے۔

■

Aisha Zia
Room No.: 57, Shipra Hostel
JNU (New Campus)
New Delhi - 110067
Mob.: 7011422975
Email.: aishaziajnu@gmail.com

محمد نسیم

شمس الرحمٰن فاروقی کی سفارشات "لغات روزمرہ" کے حوالے سے

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے دیگر ادبی کارناموں کی طرح لغت نویسی میں بھی منفرد و اعلیٰ کارنامہ انجام دیا ہے۔ان کی لغت، 'لغات روز مرہ' نہ صرف سابقہ اردو لغات سے ممیّز ہے بلکہ آئندہ کی تحقیقی لغت نگاری کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔لغت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عربی، فارسی، انگریزی، لغات کے ماسوا نوادرالالفاظ، دافع الاغلاط، نوراللغات، فرہنگ آصفیہ، امیر اللغات اور اردو لغت۔ تاریخی اصول پر، جیسی لغات کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔اس لغت میں انھوں نے مذکورہ لغات کے جا بہ جا حوالے بھی دیے ہیں۔ یہ حوالے استناد کے طور پر تو ہیں ہی لیکن کہیں کہیں ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔اختلاف کی صورت میں وہ دیگر لغات کے معانی بھی بطور موازنہ درج کرتے ہیں اس کے بعد استدلال کے ساتھ یہ بتاتے ہیں کہ فلاں لفظ کا صحیح ترین معنیٰ فلاں ہوگا۔'لغات روزمرہ' سے قبل لغت نویسی کا عمومی طریقہ یہ رہا ہے کہ الفاظ کے معانی، اس کے مترادفات، زبان، تذکیر و تانیث اور اعراب کی نشاندہی کردی جاتی تھی یا زیادہ سے زیادہ لفظ کے معانی کے اثبات میں مستند شعرا کے کلام درج کر دیے جاتے تھے۔ لغت نویسی کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ پاکستان کے لغت بورڈ نے کیا۔انھوں نے منصوبہ بند طریقے سے تقریباً باون سال کی طویل مدت میں ایک لغت بنام 'اردو لغت۔تاریخی اصول پر' مرتب کرایا۔اس کی پہلی جلد 1960 اور آخری جلد 2010 میں شائع ہوئی۔ جملہ بائیس جلدیں ہیں جن میں دو لاکھ چوسٹھ ہزار الفاظ درج ہیں۔ اس جدید لغت کا حیرت انگیز کارنامہ یہ ہے کہ معانی کے اثبات کے طور پر شعرا کے کلام اور نثر کے اقتباسات و مقولے کے ساتھ ساتھ اس کے سنین بھی درج کر دیے گئے ہیں جس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ لفظ کب اور کس معنی میں استعمال ہوا تھا۔ گو معانی کے زمانی ارتقا و تبدیلی پر کوئی خاص بحث نہیں ہے پھر بھی تھوڑا اذکر مل ہی جاتا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی اردو کے جن چند لغات کو مستند مانتے ہیں یا یہ کہ جن لغات کے حوالے انھوں نے سب سے زیادہ دیے ہیں ان میں 'اردو لغت۔ تاریخی اصول پر' بھی شامل ہے۔انھوں نے اس لغت سے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ اس میں جدید تحقیق کی جو روش اختیار کی گئی ہے اسے شمس الرحمٰن فاروقی نے درجہء کمال کو پہنچا دیا ہے۔

'لغات روزمرہ' جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ اس میں جو الفاظ درج کیے گئے ہیں وہ ادبی کتابوں سے متخرج نہیں ہیں بلکہ اس کے تمام تر الفاظ وہ ہیں جو خواص و عوام میں زبان کے طور پر مستعمل ہیں۔اس لغت کے سب سے نمایاں پہلو اس کے تنقیدی و تحقیقی مباحث ہیں جو اردو کی دوسری لغات میں خال خال ہی ملتے ہیں۔ ایک ایک لفظ پر کئی کئی زاویے سے بحث کی گئی ہے جیسے کہ وہ لفظ ارود کا ہی ہے یا دخیل ہے، اگر دخیل ہے تو اسے کس قاعدے کی رو سے اردو بنایا گیا ہے، اس لفظ کے معانی دیگر لغات میں کیا ہیں، اور کون سا معنیٰ بہتر ہے، وہ لفظ کس علاقے میں کس معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، موجودہ وقت میں اس کا طریقہ استعمال کیا ہونا چاہیے، شمس الرحمٰن فاروقی نے ان تمام پہلوؤں پر تحقیقی استدلال کے ساتھ بحث کی ہے اور یہی تحقیقی استدلال وہ وصف ہے جو اسے معاصر لغات میں امتیازی حیثیت عطا کرتا ہے۔وہ الفاظ و معانی کی تشریحات کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت اپنی

سفارشات بھی پیش کرتے رہتے ہیں کہ کن الفاظ کا استعمال جاری رہنا چاہیے اور کسے ترک کر دینا چاہیے۔ ذیل میں ایسے ہی کچھ الفاظ درج کیے جا رہے ہیں جنھیں وہ ترک کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔

ادب نواز اور اردو نواز: عام طور پر یہ فقرے کسی ایسے سیاسی قائد کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جو اردو محفلوں میں شریک ہوتا ہو یا کسی ایسے شخص کے لیے کر دیا جاتا ہے جسے اردو زبان و ادب سے محبت ہو یا یہ کہ زبان و ادب کے نام پر کبھی کبھار مالی تعاون دیتا ہو۔ فاروقی صاحب اس لفظ کے استعمال پر برہم ہیں۔ ان کے نزدیک ''ادب کوئی یتیم بچہ یا بے سہارا شخص'' نہیں ہے جو کسی کے نوازے جانے کا محتاج ہو۔ ان کا مطالبہ ہے کہ 'ادب نواز' اور 'اردو نواز' جیسے فقرے ترک ہونے چاہیے بلکہ وہ اسے واجب الترک قرار دیتے ہیں اور اس کی جگہ وہ اردو دوست یا خادم اردو جیسے فقروں کے استعمال کا تقاضا کرتے ہیں۔ انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

''یہ زبان کی نوازش ہے کہ وہ ہمارا وسیلہء اظہار بنتی ہے۔ ہم بہت سے بہت اردو دوست ہو سکتے ہیں۔ ورنہ ہمارا صحیح مقام 'خادم اردو' کا ہے۔ ادب نواز، ادب پرور، اردو نواز جیسے فقروں کو مکمل طور پر ترک ہو جانا چاہیے۔''

(لغات روزمرہ، شمس الرحمٰن فاروقی، آج کی کتابیں، کراچی، 2012، ص 59)

ابھر کر سامنے آنا: اس فقرے کو ہم نمایاں ہونا، یا توجہ کا مرکز بننے کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو اس فقرے کے استعمال پر اعتراض یہ ہے کہ 'ابھرنا' اور 'سامنے آنا' دونوں ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ ''جو چیز ابھرے گی وہ سامنے ہی تو آئے گی'' اس لیے ابھرنے کے ساتھ سامنے آنا جیسے الفاظ کا استعمال غیر ضروری طور پر تکرار پیدا کر رہا ہے۔ وہ اس فقرے کو جملوں میں استعمال کر کے مثالوں کے ذریعہ بتاتے ہیں کہ کون سے جملے درست ہیں اور کون سے درست نہیں ہیں۔

مثال نمبر 1 گزشتہ چند برسوں میں جو شعرا ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

مثال نمبر 2 رپورٹ کو پڑھنے سے جو نکتہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی ان دونوں جملوں کو قبیح اور نامناسب کہتے ہیں۔ ان کا اصرار یہ ہے کہ 'ابھرنا' اور 'سامنے آنا' میں سے کسی ایک کو ہی استعمال کیا جائے اور مذکورہ جملوں کو یوں لکھا جائے۔

مثال نمبر 1 گزشتہ چند برسوں میں جو شعرا نمایاں ہوئے ہیں۔

مثال نمبر 2 رپورٹ کو پڑھنے سے جو نکتہ خاص طور سے متوجہ کرتا ہے۔

پیش فرمانا: فاروقی صاحب اس فقرے کا استعمال درست نہیں سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس میں 'اجتماع ضدین' ہے۔ یعنی لفظ 'پیش' میں خود ہی عاجزی کا پہلو مضمر ہے اس لیے اس کے ساتھ عاجزی کے اظہار کے لیے ہی 'فرمانا' کا استعمال جائز نہیں ہے۔ یہ فقرہ عام طور پر کسی چھوٹے کی جانب سے کسی بڑے یا زیادہ لائق احترام شخص کے لیے کیا جاتا ہے۔ ہم جب زیادہ تکلف یا عجز و انکسار کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو اس فقرے کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن شمس الرحمٰن فاروقی اسے قبیح قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''پیش فرمانا' کی جگہ 'ارشاد فرمانا' کا فقرہ استعمال کیا جائے اور یہی مناسب اور فصیح ہے۔

سنجیدگی سے لینا: اس کے تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے کہ اسے:

''انگریزی روز مرہ to take seriously کی مت بگاڑ کر اب ہم لوگ کسی معاملے/بات/واقعے وغیرہ کو 'سنجیدگی سے لینا' بولنے لگے ہیں۔ اردو میں یہ محاورہ معنیٰ دینے کا نہیں، آپ ہزار کوشش کر لیں۔ یہ بھونڈا اور احمقانہ الگ ہے۔'' (ایضاً، ص 215)

اس تعلق سے انھوں نے کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں جن کے دو جملے یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔

''میں آپ کی ہر بات کو بہت سنجیدگی سے لیتا ہوں'' فاروقی صاحب اس جملے کو غلط اور واجب الترک قرار دیتے ہیں اور اس کی جگہ وہ اس جملے کو صحیح و مستحسن سمجھتے ہیں کہ ''میں آپ کی ہر بات کو بہت باوزن یا اہم یا قرار واقعی سمجھتا ہوں''

کاش! فاروقی صاحب اس معترضہ محاورے کو ''بھونڈا اور احمقانہ'' یا واجب الترک سمجھنے کی کوئی ایک وجہ بھی بتا دیتے تو قاری کو تشنگی کا احساس نہ ہوتا۔ کیا ہم بھونڈا صرف اس لیے مان لیں کہ یہ انگریزی فقرے کا ترجمہ ہے۔ ظاہر ہے فاروقی صاحب خود اسے کوئی معقول دلیل نہیں سمجھیں گے۔ ورنہ اردو کا ہر وہ لفظ اور فقرہ مشتبہ قرار دے دیا جائے گا جو دوسری زبانوں سے ماخوذ یا مترجمہ ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اسے اردو زبان کے مزاج کے خلاف سمجھتے ہوں۔ لیکن راقم الحروف یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہے کہ ''سنجیدگی سے لینا'' میں اردو کے خلاف مزاج کون سے پہلو ہیں۔

سے ہونا: مثلاً اگر جملے میں یوں بولا جائے کہ ''آپ کہاں سے ہیں؟'' یا ''آپ کہاں سے آتے ہیں؟'' تو ایسے تمام جملے غلط اور قبیح ہوں گے۔ کیونکہ یہ اردو کے مزاج کے خلاف ہیں۔ ''سے ہونا'' کے بجائے ''کے ہونا'' بولا جائے۔ جیسے کہ آپ کہاں کے ہیں؟ کہاں کے رہنے والے ہیں؟

صاحب زادہ: بقول شمس الرحمٰن فاروقی اس فقرے کو صرف دوسرے کے بیٹے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ خود کے بیٹے کے لیے ہرگز نہ کریں۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ ''میرے صاحب زادے ان دنوں یہاں نہیں ہیں'' تو ایسا جملہ نہایت قبیح ہوگا۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ ''میرا بیٹا ان دنوں یہاں نہیں ہے'' تو درست اور احسن ہوگا۔

ظاہری بات: ''لغات روز مرہ'' کے مطابق لفظ 'ظاہر' کے بعد ''سی بات'' کا اضافہ غیر ضروری ہے۔ اس لیے کہ ''کوئی چیز یا تو ظاہر ہوگی یا ظاہر نہ ہوگی۔ ''سی بات'' کا اضافہ لفظ ظاہر پر کوئی معنوی اثر نہیں ڈال رہا ہے۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ اسے ترک کر دیا جائے۔ جیسے کہ:

''ظاہر ہے پہاڑوں پر میدان سے زیادہ ٹھنڈک ہوتی ہے۔'' اسی کو عام طور پر لوگ اس طرح بولتے ہیں کہ ''ظاہری بات ہے کہ پہاڑوں پر میدان سے زیادہ ٹھنڈک ہوتی ہے'' جب کہ آخر الذکر جملہ فاروقی صاحب کے الفاظ میں ''نامناسب اور قبیح ہے''۔

کارروائی چلانا: یہ عام طور پر کسی جلسہ یا سمینار کی نظامت کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ فاروقی صاحب کے نزدیک اسے بھی ترک ہونا چاہیے اور اس کی جگہ ''جلسے کی نظامت کرنا'' ہی جاری رہنا چاہیے۔ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''کسی جلسے یا محفل کی نظامت کرنے کو اب بعض لوگ ''کارروائی چلانا'' کہنے لگے ہیں گویا کارروائی کوئی گاڑی ہو جسے کوئی چلاتا ہے۔ اس بے معنی اور غیر ضروری فقرے کا ترک اولیٰ اور انسب ہے۔ ''جلسے کی نظامت کرنا'' نہایت عمدہ فقرہ ہے اور ''کارروائی چلانا'' کی جگہ اسی کو استعمال کرنا چاہیے۔'' (ایضاً، ص 258)

کچھ اس طرح: اس فقرے کا استعمال عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ ''جو لوگ اس محفل میں شریک تھے ان کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔'' گویا یہاں ''کچھ اس طرح'' 'حسب ذیل' یا محض 'یوں' کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اسے غلط اور قبیح قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''کچھ اس طرح'' سے معنیٰ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو فہرست پیش کی جا رہی ہے وہ اصل فہرست کے مماثل کوئی فہرست ہے جب کہ قائل کا مقصد حقیقی یا اصلی فہرست پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں لفظ 'کچھ'

کے استعمال سے احتراز کیا جائے اور'' کچھ اس طرح'' کے بجائے صرف 'اس طرح، حسب ذیل، یا 'یوں' جیسے الفاظ استعمال کیے جائیں۔

رہائش: اسی طرح وہ لفظ 'رہائش' اور 'رہائش گاہ' کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ:

'' یہ غلط تو ہیں ہی، بھونڈے بھی ہیں، اور ان سے کوئی مقصد ایسا حاصل نہیں ہوتا جو مکان، گھر، قیام گاہ، مستقر، جائے قیام، دولت کدہ وغیرہ سے نہ حاصل ہوسکتا ہو۔'' (ایضاً،ص، 203)

اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ جس طرح خواہش، آرائش، فہمائش اور زیبائش جیسے الفاظ فارسی مصدروں کے حاصل مصدر کے طرز پر اردو بنا لیے گئے ہیں اس طرز پر 'رہائش' کونہیں بنایا گیا ہے۔ فارسی میں حاصل مصدر بنانے کا طریقہ یہ کہ مصدر سے مضارع بناتے ہیں پھر مضارع کے آخری حرف کو ہٹا کر وہاں 'ش' لگا دیتے ہیں۔ اب اس سے جو اسم حاصل ہوتا ہے اسے حاصل مصدر کہتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی جب فارسی کے اس قاعدے کے اصول پر 'رہائش' کو جانچتے ہیں تو وہ پورا نہیں اترتا ہے۔ انھی کے الفاظ ملاحظہ کریں:

'' اگر رہنا سے حاصل مصدر بقاعدۂ فارسی بنے گا تو 'رہش' ہوگا نہ کہ رہائش۔ اور رہش یا رہائش میں جگہ کے معنیٰ شامل ہیں۔ اس لیے رہائش گاہ تو بالکل ہی فضول ہے۔'' (ایضاً، ص، 203)

شمس الرحمٰن فاروقی نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ فارسی قاعدے کے مطابق یہ رہائش نہیں 'رہش' ہوگا۔ بعینہٖ یہی حال زیبائش و فہمائش کا بھی ہے۔ یہ بھی فارسی قاعدے کی رو سے 'زیبش' و 'فہمش' ہوں گے۔ لیکن ان دونوں الفاظ کے استعمال پر شاید انہیں اعتراض اس لیے نہیں ہے کہ یہ اردو الفاظ کے طور پر رائج ہوگئے ہیں جب کہ اس کے مقابلے میں 'رہائش' ذرا کم استعمال میں ہے۔ ورنہ اگر فارسی قواعد کی رو سے رہائش کو مسترد کیا جارہا ہے تو زیبائش و فہمائش کو بھی مسترد کردینا چاہیے تھا۔ اسی لغت میں فاروقی صاحب کا یہ نظریہ بھی موجود ہے کہ ہماری زبان میں دخیل الفاظ جیسے بھی رائج ہیں ہم انہیں اردو کا مان کر ویسے ہی پڑھیں گے اور بولیں گے اگرچہ وہ اصل زبان کے لحاظ سے غلط ہوں۔ جیسے کہ ''استفادہ حاصل کرنا'' عربی قواعد کی رو سے غلط ہے۔ اس لیے کہ لفظ استفادہ میں 'حاصل' کا معنیٰ پہلے سے موجود ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ لفظ 'حاصل' کا اضافہ غیر ضروری ہے۔ فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ چونکہ اردو والے استفادہ سے صرف فائدہ مراد لیتے ہیں اس لیے یہی جاری رہنا چاہیے اگرچہ وہ عربی قاعدے کے مطابق غلط ہے۔ راقم الحروف کا عریضہ یہ ہے کہ کیا اس نظریے کا اطلاق 'رہائش' اور 'رہائش گاہ' پر نہیں ہوسکتا ہے۔ جبکہ ہم 'رہائش' سے قیام اور 'رہائش گاہ' سے قیام گاہ مراد لیتے ہیں۔

اس طرح جن الفاظ کے ترک کرنے پر وہ زور دیتے ہیں ان کی طویل فہرست ہے۔ ظاہر ہے ان سبھی الفاظ کو اس مختصر سے مضمون میں نہ شامل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان پر بحث کی جاسکتی ہے۔ پھر بھی کچھ الفاظ مزید درج کیے جارہے ہیں تاکہ تشنگی کا احساس کم سے کم رہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی لفظ 'آگ زنی' کی جگہ 'آتش زنی' کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح 'آنر کلنگ' کی جگہ 'ناموسی قتل' کو بہتر مانتے ہیں۔ 'آنجہانی' کو بھی وہ واجب الترک قرار دیتے ہیں اور اس کی جگہ لفظ 'مرحوم' کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کی یہ بھی سفارش ہے کہ 'مرحوم' ہر کسی کے لیے استعمال کیا جائے خواہ مرنے والا ہندو ہو یا مسلم۔ اسی طرح وہ 'آس پڑوس' کی جگہ 'پاس پڑوس' کو بہتر مانتے ہیں۔ وہ 'تقرری' میں حرف 'ی' کو فاضل محض کہتے ہیں اور صرف 'تقرر' کے استعمال کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ چونکہ اردو میں حرف تعمیم نہیں ہے اس لیے انگریزی کے 'A' کا ترجمہ ہر جگہ 'ایک' کرنا مناسب نہیں ہے۔ انھوں نے مثال یہ پیش کی کہ 'John a good man' اس کا ترجمہ یہ کرنا کہ ''جان ایک اچھا آدمی ہے'' صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ انگریزی جملے میں 'A' حرف تعمیم کے طور پر ہے جس کا ترجمہ 'ایک' کرنا اردو کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسی طرح وہ 'لاپرواہی' کے بارے میں کہتے ہیں کہ 'بے پروائی' اور 'لاپروائی' کے ہوتے ہوئے 'لاپرواہی' غیر ضروری اور غلط ہے''۔ اسی طرح 'مارے گئے' کو وہ ممنوع قرار دیتے ہیں۔ یعنی اگر جملے میں یوں بولا جائے کہ '' حادثے میں بارہ آدمی مارے گئے'' یا پھر اسے صیغۂ حال میں بولا جائے کہ '' روزانہ تین بچے مارے جاتے ہیں'' تو ایسے تمام جملوں کو وہ غلط قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی جگہ ''بارہ آدمی مرے' یا حادثے کا شکار ہوئے، اور زمانہ حال کی صورت میں ''روزانہ تین بچے مرتے ہیں'' جیسے فقروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی دلیل وہ دیتے ہیں کہ معترضہ جملوں میں فاعل مذکور نہیں ہے اور 'حادثہ' فاعل کی جگہ نہیں لے سکتا ہے اس لیے 'مارے گئے' یا 'مارے جاتے ہیں' جیسے فقرے بے معنیٰ ہوں گے۔ اسی طرح وہ لفظ 'یکسانیت' کے تعلق سے کہتے ہیں کہ اگر یہ 'مشابہ' کے معنیٰ میں استعمال ہو رہا ہے تو نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ ہمارے پاس پہلے سے لفظ 'یکسانی' موجود ہے۔ البتہ بعض لوگ 'یکسانیت' کو 'عدم تنوع' کے معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں جیسے کہ '' ان کے اشعار میں یکسانیت بہت ہے'' تو ایسی صورت میں قابل قبول ہے۔

پوری لغت میں ہمیں اس طرح کی بحث جا بہ جا نظر آتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فاروقی صاحب نے انہی الفاظ، فقروں اور لسانی اختراعات کو شامل کیا ہے جو اعراب و تلفظ اور تذکیر و تانیث میں مختلف فیہ ہیں یا یہ کہ ایسے چنندہ الفاظ شامل ہیں جن پر وہ گفتگو ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لیے یہ لغت مروجہ لغات سے قطعی مختلف ہے، اسے 'فیروز اللغات' کے قبیل کی لغت نہیں سمجھنا چاہیے جس میں صرف معانی، مترادفات اور تذکیر و تانیث کا اندراج ہوتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی منشا صرف معانی درج کرنا نہیں بلکہ معانی کے ساتھ اس لفظ سے متعلق ممکنہ مباحث پر روشنی ڈالنا ہے۔ کئی ایسے الفاظ بھی ہیں جن پر اہل علم اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے ان معترضہ الفاظ پر اچھی گفتگو کی ہے اور معترضین کے اعتراض کا جواب بہ استدلال دے کر یہ بتایا ہے کہ کون سا اعتراض بجا ہے اور کون سا بے جا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے اس لغت میں صرف انہیں الفاظ کو شامل کیا ہے جن پر دوسرے اہل علم کو اعتراض ہے یا یہ کہ جنھیں خود شمس الرحمٰن فاروقی لائق ترک سمجھتے ہیں۔ اصل میں معترضہ اور مختلف فیہ الفاظ کے ساتھ ساتھ ایسے مروجہ الفاظ بھی کثرت سے مندرج ہیں جن کی وہ تائید کرتے ہیں حتی کہ ان الفاظ کے ہو بہو استعمال پر زور دیتے ہوئے صاف طور پر کہتے ہیں کہ اسے ہی رائج رہنا چاہیے۔ البتہ بعض الفاظ کے ترک کرنے کی سفارش بھی کرتے ہیں جس کا مختصر سا حصہ میں نے پچھلے صفحات میں پیش کردیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی ان سفارشات پر غور کیا جائے اور ان کے معقول اور مدلل وجوہات کو تسلیم کرتے ہوئے ان الفاظ کے استعمال سے بچا جائے جن کو وہ لائق ترک قرار دے چکے ہیں اور اس کی جگہ مجوزہ الفاظ کو استعمال کیا جائے۔ تاکہ یہ الفاظ مقبول خاص و عام ہوسکیں۔

■

Mohd Naseem
Ph.D. Research Scholar Dept. of Urdu
University of Hyderabad
CR Rao Raod, Gachibowli
Hyderabad - 500046 (Telangana)
Mob.: 9618474155
Email: naseemmanuu@gmail.com

شعیب نظام

زندہ کلاسک اور زبیر شفائی کی شاعری

زبیر شفائی کا اصل نام زبیر احمد قریشی تھا۔ وہ 10 دسمبر 1944 کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ کم و بیش پچاس سال کی مشق سخن کے بعد ان کا انتقال 27 فروری 2008 کو کانپور میں ہوا۔ اسی دن ان کے جسد خاکی کو ہم سب خاک کے حوالے کر آئے۔ اپنے پیچھے اہلیہ ایک بیٹی اور تین بیٹے چھوڑ گئے۔ بیٹی اور بڑے بیٹے کی شادی ان کی زندگی میں ہوگئی تھی۔ ان کا بڑا بیٹا کالج میں میرا شاگرد بھی رہ چکا ہے۔

زبیر پہلے میکش تخلص کرتے تھے۔ بعد میں تخلص تبدیل کر کے وہ زبیر شفائی ہو گئے۔ شفائی کا لاحقہ محض اس لیے ہے کہ انھوں نے اپنی کچھ ابتدائی غزلیں شفا گوالیاری کو دکھائی تھیں۔

جب شمس الرحمٰن فاروقی نے 1966 میں شب خون جاری کیا تب تک ترقی پسند تحریک خود اپنے ہاتھوں خودکشی کرنے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ اس لیے یہ رسالہ جبس بھرے ماحول میں ایک تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا اور اس تازہ جھونکے نے دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان اور پاکستان کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ظاہر ہے کانپور کو بھی اس سے متاثر ہونا ہی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رمز سیتاپوری محمد احمد رمز بن گئے۔ اس طرح کانپور میں جدید شاعروں کا ایک حلقہ بنتا گیا جس میں زیب غوری، محمد رمز، زبیر شفائی، عشرت ظفر، حسن عزیز اور ابوالحسنات حقی کے نام نمایاں تھے۔ استاد شاعر علامہ کوثر جائسی اپنے اسلوب اور مزاج کے اعتبار سے پہلے ہی تمام اصولی جکڑ بندیوں کے باوجود جدید فکر کے علم بردار تھے۔ زیب غوری ان سے اپنے کلام پر دوستانہ مشورہ کرنے لگے۔ یہ شعرا ناظر صدیقی صاحب کے کمرے اور جگر اکادمی میں گرانڈ ہوٹل میں بیٹھتے تھے جہاں فنا نظامی اور شارق ایرایانی صاحب اور قیوم ناشاد فیض آبادی سے بھی نشستوں اور ملاقاتوں میں فطری طور پر شاعری بھی ہوتی رہتی تھی۔ انوار انجم اور اظہار عابد بھی اس گروپ میں شامل ہو گئے۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا تبادلہ 1972 میں کانپور ہو گیا اور زیب غوری، محمد احمد رمز، زبیر شفائی، عشرت ظفر اور حسن عزیز پابندی سے پوسٹ آفس کی اوپری منزل پر شام سے فاروقی صاحب کی قیام گاہ پر بیٹھنے لگے۔ اس محفل میں کبھی کبھی ابوالحسنات حقی صاحب چلے جاتے تھے۔ یہاں پابندی سے شعر و ادب پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ یہ محفل کبھی کبھی زیب غوری کے گھر پر جم جاتی اور رات رات بھر شاعری اور شعروں پر بحثیں ہوتی رہتیں اور فاروقی صاحب کیا بک رہے ہو کہاں کی اڑا رہے ہو جیسے جملوں کے ساتھ شعروں کے نئے نئے مفاہیم بیان کر کے حاضرین کو بنی علمی گفتگو سے متاثر کرتے رہتے۔

فاروقی صاحب نے زبیر شفائی پر اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ زبیر زیب کی شاعری سے متاثر ہوئے اور ان پر زیب کا اثر دیکھا جا سکتا ہے مگر ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جب چار پانچ دوست روز آپس میں اٹھتے بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کو شعر سناتے ہیں تو فطری طور پر ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتے ہیں اور خود متاثر بھی ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعرا اپنا اپنا الگ اسلوب رکھنے کے باوجود ایک دوسرے سے متاثر ضرور ہوئے۔ ظاہر ہے یہ موقع نہیں ہے ورنہ میں مثالوں کے ذریعے اپنے معروضات ضرور پیش کرتا۔

زیب کا کلام نیر مسعود صاحب اور فاروقی صاحب کے سخت انتخاب کے بعد زرد زرخیز کی صورت میں سامنے آیا اور ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ باقی شعرا اپنے اپنے طور پر شعر کہتے رہے۔ بعد میں محمد احمد رمز اور ابوالحسنات حقی کے مجموعے منظر عام پر آئے مگر حسن عزیز اور زبیر شفائی کا کلام رسائل میں ہی قید رہ گیا۔

زبیر شفائی کے انتقال کے ایک ہفتے بعد میں اور ظفر غازی زبیر مرحوم کے گھر حاضر ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے ایک مشترکہ دوست بھی تشریف لے آئے۔ میں نے بھابھی (زبیر شفائی کی اہلیہ) سے کہا کہ زبیر بھائی کا کلام یکجا ہو جائے اور اس کی اشاعت کی کوئی صورت نکل آئے۔ میں نے اور ظفر نے اجازت لے کر تمام کلام یکجا کر لیا۔ بھابھی ضد کر کے چائے پینے پر اصرار کرنے لگیں کہ شعیب ایسے نہ جاؤ ورنہ تمہارے بھائی کی روح شرمندہ ہوگی۔ ہم لوگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران ہمارے مشترکہ دوست نے ایک عجیب سی بات کا انکشاف کیا کہ ایک دن انھوں نے زبیر سے کہا تھا کہ اپنا مجموعہ جلد شائع کرائیے ورنہ خدا نہ کرے اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو مجموعہ مجھے ہی چھپوانا پڑے گا۔ دیکھیے صاحب کبھی کبھی مذاق میں کہی ہوئی بات سچ ثابت ہو جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ نے مرحوم سے اس طرح کا کوئی وعدہ کر لیا تھا تو یہ آپ اپنے ساتھ لے جائیے اور مجموعہ شائع کرانے میں اگر ضرورت ہو تو میں ہر ممکن

مدد کو حاضر ہوں۔ خیر میں نے یکجا کیا ہوا مواد ان کے حوالے کردیا۔ یہ واقعہ مارچ 2008 کے اوائل کا ہے۔ ان صاحب کے اپنے کچھ ذاتی مسائل کے سبب تاخیر ہوتی چلی گئی اور اب سے ایک ڈیڑھ ماہ قبل میں نے ان سے یہ کلام حاصل کرلیا۔ ظاہر ہے ہر کام اپنے مقررہ وقت پر ہی ہوتا ہے۔ سو اب یہ مجموعہ اشاعت کے مراحل طے کررہا ہے اور ان شاء اللہ بہت جلد زبیر کے پرستاروں کے ہاتھ میں ہوگا۔ میرے اور زبیر کے مشترکہ دوست کا شکریہ شاید واجب ہو کہ یہ کلام انھوں نے حفاظت سے رکھا اور ضائع نہیں ہوا اور نہ بارہ سال کی مدت کم نہیں ہوتی خیر۔

1986 میں ملازمت کے سلسلے میں کانپور حاضر ہوگیا۔ میں سفید کالونی جوہی میں قیام پذیر ہوا جہاں زبیر شفائی میرے پڑوسی تھے اس طرح بہت جلد ان سے دوستی ہوگئی اور نشستوں کا سلسلہ کبھی زبیر کے گھر کبھی میرے اور کبھی شاہد اختر کے گھر ہونے لگا جو نزدیک ہی لال کالونی میں رہتے تھے۔ زبیر اچھی طرح جانتے تھے کہ میں دوپہر میں پابندی سے سوتا ہوں مگر جب وہ رات میں ایک یا دو غزلیں کہہ لیتے تھے تو پابندی سے میرا گیٹ کھٹکھٹانا اپنا حق سمجھتے تھے آنکھیں ملتے ہوئے گیٹ پر وہ ہمیشہ مجھ سے یہی کہتے کہ یہیں گالیاں دے لو مگر غزلیں سننی پڑیں گی۔ یہ زبیر کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ ایک دو شعر جن پر مجھے اعتراض ہوتا وہ بغیر بحث کے انھیں قلم زد کردیتے۔ شام کو پریڈ پر خورشید الرحمٰن حنفی کی فوٹو آرٹ اسٹوڈیو میں پابندی سے دوستوں کا جمگھٹا لگتا جس میں زبیر شفائی، حسن عزیز، محمد احمد رمز، تسکین زیدی اور میں موجود ہوتے۔ یہاں بھی شعر و شاعری اور شعروں پر بحثیں خوب خوب ہوتی رہتیں۔ زبیر بہت مستی اور سرشاری کے ساتھ اپنے شعر سناتے۔ ان کو اچھے شعروں کی اتنی عمدہ پرکھ تھی کہ غزل کا اچھا شعر سناتے وقت ان کی آنکھیں ہمیشہ چمکنے لگتی تھیں اور دوسروں کے اچھے شعر بھی خوب یاد تھے۔ اسی زمانے میں ابوالحسنات کے اچھے شعر بھی خوب یاد تھے۔ اسی زمانے میں ابوالحسنات حقی کے باہری کمرے میں شعری نشستوں کا انعقاد ہوتا رہتا تھا۔ وہاں مندرجہ بالا شعرا کے علاوہ سمیع فراز اور شمیم عثمانی بھی موجود رہتے۔

جن عناصر سے انسانوں کی تخلیق ہوتی ہے ان میں آگ زبیر شفائی کے کلام میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یونانی میتھالوجی میں بیان کیا گیا ہے کہ آگ دیوتاؤں کی دسترس میں تھی اسی لیے اسے مقدس تصور کیا جاتا رہا ہے۔ جس دیوتا سے آگ انسانوں تک پہنچی اسے سزا کے طور پر سخت معتوب کیا گیا۔ زبیر کے یہاں آگ چاہے وہ چراغ کی ہی شکل میں ہو بہت اہم اور معنی خیز استعارہ بن جاتا ہے۔

میں نے کانپور میں دوسروں کی ضیافت کرکے خوش ہونے والی دو ہستیاں ایسی دیکھیں جو عدیم المثال کہی جاسکتی ہیں ان میں پہلا نام زیب غوری اور دوسرا زبیر شفائی کا ہے۔ زیب غوری اور زبیر شفائی دونوں بہت خوش ذائقہ کھانوں کے شوقین تھے مگر دوستوں کو کھلاکر یہ دونوں حضرات بہت خوش ہوتے تھے اور دونوں کی بیویاں بہت خوش سلیقہ اور عمدہ کھانا پکانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ میں متعدد موقعوں پر دونوں دوستوں کے دسترخوان پر خوش ذائقہ پکوانوں سے لطف اندوز ہوچکا ہوں جس کو یاد کرکے اب بھی لطف اندوز ہوتا رہتا ہوں۔

زبیر خاصے خوش اخلاق، ملنسار اور شرف النفس انسان تھے۔ اپنی انانیت کے باوجود اگر انھیں ان کی غلطی کا احساس دلاکر قائل کردیا جاتا تھا تو وہ بلاشرط معافی تک مانگنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ یہ اتنا آسان نہیں ہوتا اس کے لیے بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبیر اس حوالے سے خاصے باظرف انسان تھے۔ وہ دوسروں کے ساتھ سلوک کرکے مسرور ہوتے تھے۔

چلیے زبیر شفائی کے فن پر بھی تھوڑی سی گفتگو ہوجائے ہر چند کلمات آپ کے ہاتھ میں ہوتب قاری کی اپنی رائے میری رائے سے کہیں زیادہ معتبر ہوتی ہے اور ہونی ہی چاہیے۔

وہ ایک صاحب طرز اور منفرد اسلوب کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری میں حواسی قوتوں کی شدت کا احساس قاری کو قدم قدم پر ہوتا ہے۔ جذبے کا کھرا پن اور سرشاری ان کی تمام غزلوں میں آپ کو نظر آئے گی۔

جن عناصر سے انسانوں کی تخلیق ہوتی ہے ان میں آگ زبیر شفائی کے کلام میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یونانی میتھالوجی میں بیان کیا گیا ہے کہ آگ دیوتاؤں کی دسترس میں تھی اسی لیے اسے مقدس تصور کیا جاتا رہا ہے۔ جس دیوتا سے آگ انسانوں تک پہنچی اسے سزا کے طور پر سخت معتوب کیا گیا۔ زبیر کے یہاں آگ چاہے وہ چراغ کی ہی شکل میں ہو بہت اہم اور معنی خیز استعارہ بن جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں اور زبیر کی تخلیقی ہنرمندی اور فنی چابک دستی کی داد دینے پر اپنے آپ خود کو مجبور محسوس کریں گے۔ شرط صرف صاحب ذوق ہونے کی ہے۔

چند شعر اور ملاحظہ فرمائیں ؎

آخر یہ کس گنہ کی سزا پارہا ہوں میں
جلتے ہوئے چراغ کی لو میں کھڑا ہوں میں

وہ سر سے پا تک ہے فوارہ روشنی کا
تمام اعضا میں اک اک شمع جل رہی ہے

رات کے مناظر سے فائدہ اٹھاؤں گا
میں چراغ کی لو میں چھپ کے بیٹھ جاؤں گا

دھوئیں کی انگڑائیوں سے ہے مشتعل اجالا
ہوا چراغ کے ہونٹ سے ہونٹ مل رہی ہے

رکھتے ہی ہونٹ جھوم اٹھا رشتہ چراغ
لیکن مری گرفت میں پل بھر نہیں رہا

جیسا میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ زبیر اپنے اشعار میں خوبصورت قدرتی مناظر بھی پیش کرنے پر پوری طرح قادر نظر آتے ہیں۔ اس میدان میں زیب کے علاوہ ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ چند شعر دیکھیے ؎

واضح ہوا کہ سفینہ اب کس طرف جارہا ہے
آبی پرندوں کا اک غول اڑتا نظر آرہا ہے

یہ وقت کی بیکرانی آفاق کی حکمرانی
ناقہ سواروں کا پرچم کھلتا چلا جارہا ہے

نکہت گل کے لیے کوچ کا اعلان نہ ہو
وہ ضیا ماند سویرا وہ گجر بجتا تھا

وصل کے بعد شب و روز عمومی ہوں گے
خوش گمانی کے سوا اور بتا کیا ہوگا

میں بلاتاخیر مرنا چاہتا ہوں
زہر کی تاثیر میں حائل دعا ہے

زبیر اور زیب جدیدیت کے ہراول دستے میں شامل تھے مگر شمس الرحمان فاروقی اور نیر مسعود کے سخت انتخاب کے باوجود زرد زرخیز میں ''شاخ اظہار پہ بیٹھا ہوا الو بولا'' جیسی غزل بھی شامل ہوگئی ہے۔ جس سے زیب شناسی میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ زبیر کے پورے کلام میں اس طرح کوئی فیشن پرستی نظر نہیں آتی۔ ان کا لہجہ ٹھہرا ہوا اور رواں دواں ہے جس میں زندہ کلاسک کی آمیزش بھی ہمیں صاف نظر آتی ہے۔

■

Shoeb Nizam
105/591 Hafiz Haleem Compound
Bhannana Purwa, Chaman Ganj,
Kanpur- 208001 (UP)
Mob.: 8960416841

آفتاب احمد منیری

جدید غزل کا ایک معتبر نام
فضا ابن فیضی

ادب فی نفسہ تنقید حیات کا نام ہے۔ جس کا مقصد تخلیق گم شدہ انسانیت کی تلاش ہے۔ یہ تلاش جب صحیح سمت اختیار کرتی ہے تو میر غالب اور اقبال جیسے نابغۂ فن منصۂ شہود پر آتے ہیں، ان ادبی لجنڈز کے یہاں زندگی کا ہر رنگ موجود نظر آتا ہے۔ ادب اور زندگی کی جس قدر تعبیرات اور تشریحات سے ان کا کلام مزین ہے، اس کی دوسری مثال دور تک نظر نہیں آتی۔

اردو شاعری کی اس تثلیث کے رخصت ہو جانے کے بعد اردو کے شعری منظر نامے میں ایک قسم کا خلا پیدا ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں بیسویں صدی کا نصف آتے آتے مشرق کی شعری روایات ماند پڑنے لگی۔ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح اردو شعر و ادب پر بھی مغربی فکر و فلسفے کے اثرات غالب آئے۔ جدیدیت کے بطن سے پیدا وجودی نظریات نے تنہائی تشکیک اور ذہنی اضطراب کو جنم دیا جس سے تمدنی بحران پیدا ہوا اور زندگی لایعنیت کا شکار ہو کر رہ گئی۔

ایسے پرآشوب دور میں جن تخلیق کاروں نے کلاسکی شعری روایات کی پیروی کرتے ہوئے تہذیب مشرق کا پرچم بلند کیا، ان میں حسن نعیم، حفیظ میرٹھی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے ساتھ فضا ابن فیضی کا نام سرفہرست ہے۔

فضا نے جب اپنے شعری سفر کا آغاز کیا اس وقت تک ترقی پسند تحریک کے ہنگامے ختم ہو چکے تھے اور اردو شاعری جدید فلسفہ حیات سے متعارف ہو رہی تھی۔ فضا عام روش کے مطابق ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں سے متاثر ہوئے۔ لیکن فکر اور نظریے کی سطح پر کسی قسم کی ادبی گروہ بندی کا شکار نہیں ہوئے، اور اپنا امتیاز سخن برقرار رکھا۔ اپنے اس شعر میں انھوں نے اس جانب واضح اشارے کیے ہیں۔

میرے قلم کا لہو، تیرا رنگ لب بھی غلط
جو محض نظریہ سازی ہے وہ ادب بھی غلط

فضا ابن فیضی کی شاعری کے تنقیدی مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ کلاسکی اور جدید دونوں قسم کی شاعری سے اکتساب فیض کرتے رہے ہیں۔ لیکن ان کا تنقیدی شعور انھیں کلاسکی شعرا کی تقلید سے باز رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ کلاسکی شاعری کی قرأت بھی معاصر ادبی تصورات کے سیاق میں کرتے ہیں۔

ہر تصور کو اسی عہد میں جا کر دیکھو
اب جو ہے کہنہ روایت سا نیا تھا کبھی
مرا ادب ہے عبارت، اسی تسلسل سے
نہ تجربوں سے روایت کا واسطہ ٹوٹا

غیر معمولی تخلیقی ذہن کے حامل فضا زبان کے خلاقانہ استعمال پر بھی قادر ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات قطعی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ اقبال کے بعد آنے والے شعرا کی نسل میں معدودے چند نام ہی ایسے ہیں جن کے شوکت الفاظ، بلند آہنگ، شگفتہ اسلوب اور پاکیزگیِ فکر کے چرچے عام ہوئے ہوں۔ اس ضمن میں پروفیسر مسعود حسن خاں کی رائے قابل غور ہے:

''فضا کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے، اس کے تخلیقی استعمال کے فن سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے روایت کا شکار نہیں ہوتے۔ دوسرے الفاظ میں وہ صوت اور لفظ کے نازک رشتوں کے محرم راز ہیں:

حرف و معنی کے پوشیدہ روابط پر ان کی گہری نظر ہے اور ان کا ذہن کمپیوٹرائی سرعت کے ساتھ مانوس کو نامانوس سے ہمدگر کر دیتا ہے۔ بعض اوقات اور بعض حضرات کو ممکن ہے یہ روابط میکانکی نظر آئیں لیکن تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ان کی تہہ داری پر قاری چونک پڑتا ہے۔

ہے غضب کی چیز پیچیدہ بیانی بھی فضا
شعر کے ابلاغ میں ابہام باقی ہے ابھی

فضا ابن فیضی عربی و فارسی زبان کے ماہر ہونے کے ساتھ ہی ان کی گہرائیوں اور پہنائیوں کے شناور بھی تھے۔ لہٰذا ان کے یہاں اعلی شعری اظہار کی سطح پر نادر الفاظ و تراکیب کا ایک مخصوص مزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے شعری اسلوب اور لب و لہجے میں ایک قسم کی عالمانہ شان ہے جو قاری کے اوپر محویت طاری کر دیتی ہے اور وہ شاعری کی اس طلسماتی فضا میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

منظر سیاہ پوش نہ پیکر جلا ہوا
ہر شخص اپنی ذات کے اندر جلا ہوا
خاکستری آہنگ کا پیکر ہے کہ ہم نے
شعلہ کوئی آواز کے قالب میں نہ رکھا
تو صبا ہے تو ملا کر ہم سے
ہم ہیں خوشبو کے ذخیرے آخر

مذکورہ اشعار کے مطالعے سے یہ بات مترشح ہو جاتی ہے کہ زبان کا یہ محرم راز کس سلیقے سے اپنے تخیلات کو شعری سانچے میں ڈھالتا ہے۔

شاعر مشرق اقبال نے شاعر کا منصب بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔

زینت بزم حکومت چہرہ زیبائے قوم
شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بے تاب قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اپنے پیش رو اقبال کے تصور شاعری کے سیاق میں اپنا ادبی نصب العین اختیار کرتے ہوئے حساس ذہن فضا نے چیختے ہوئے سماجی شعور اور جذباتی نعروں سے پرہیز کیا۔ دور جدیدیت میں بھی نظریاتی گروہ بندیوں سے دور رہتے ہوئے بنی نوع انسان کے ذہنی و روحانی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ مشینوں کے شہر میں آباد آج کا انسان ہر چہار جانب سے مادی یلغار کی زد پر ہے۔ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور مارکیٹ کلچر نے مظلوم عوام کو غربت و افلاس کی بھٹی میں جھونک دیا ہے۔ انسان کی تعلیمی و تمدنی ترقی کے دعوے دار معاشرہ کے چہرہ سے نقاب اتر چکا ہے بے چہرہ ہو چکے اس معاشرے کو دیکھ کر شاعر شدت غم کی جس کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے، اس کا بلیغ

اظہاران اشعار میں ہوا ہے۔

چہروں پہ جم کے رہ گئی بے چہرگی کی دھول
آکر اڑا کے رنگ سحر کون لے گیا
کس نے چرالیں صورتیں اس کی کہ یوں ہوا
بے چہرگی کے غم سے فگار اور آئینہ
بجز لا حاصل کیا اور بام و در پہ رکھا ہے
دیابے منظری کا طاق ہر منظر پہ رکھا ہے

شعری صنعتوں کے فن کارانہ استعمال میں بھی فضا ابن فیضی کو کمال حاصل ہے۔ مثلاً ان کی غزلوں میں مناسبت لفظی کے ساتھ ترجیع وتجنیس کا جو اہتمام ملتا ہے وہ ان جیسے ماہرفن کا اختصاص ہے۔

فضا نے اپنی غزل میں کلاسیکی شعری روایات کے احترام کے ساتھ ساتھ غزل کی اس وجد آفریں فضا کو بھی نہایت سلیقے سے برتنے کی کوشش کی ہے جو اردو کی صوفیانہ شاعری کے مزاج سے بھی قریب نظر آتی ہے۔ مثلاً درج ذیل اشعار میں یقین، تشکیک، عقیدہ، موجود، لا موجود جیسے الفاظ اور جسم کا پنجرا، نیز روح کے پنچھی کے اُڑ جانے جیسے شعری پیکر فضا ابن فیضی کے مابعد الطبعیاتی رجحان کی طرف قاری کے ذہن کو ملتفت کرتے ہیں۔

بدن کے زندہ سفر میں قائم
نفس نفس بادبان اس کا
بس ایک تشکیک میری پونجی
یقین اس کا گمان اس کا
پنچھی میں کب ہمت تھی اڑ جانے کی
وہ تو کہیے جسم کا پنجرا ٹوٹ گیا
جہاں عاجز رہی دانش عقیدے کام آئے
نہ تھا کچھ سہل لا موجود کو موجود رکھنا

ہر بڑا شاعر اپنی ادبی روایات سے قریب ہوتا ہے۔ فضا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی شاعری کا رنگ تو غالب ہے ہی انہیں اس رنگ کو قوس قزح میں تبدیل کرنے کا ہنر بھی آتا ہے۔

دباؤ مجھ پہ ہواؤں کا سخت ہونے لگا
جو بیج بویا تھا میں نے درخت ہونے لگا
میں کیسے قصہ عہد بدن دریدہ لکھوں
پھر انگلیوں میں قلم لخت لخت ہونے لگا

کامل تھی کتنی اس کی ادائے سپردگی
اک سانپ تھا جو سارے بدن سے لپٹ گیا
سراب کے وہ مسافر، ادھر آ نکلے
اڑی ہے کتنی سمندر میں دھول مت کہنا

استاد شعرا کی زمین میں شعر کہنا جدید ادب کے نمائندہ تخلیق کاروں کا خاص شغف رہا ہے۔ فضا نے بھی اس فن میں طبع آزمائی کی ہے غالب کے رنگ میں کہا گیا ان کا ایک شعر آج بھی لوگوں کو سر دھننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ غالب کی مشہور غزل 'آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک' کا ایک شعر ہے۔

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اس شعر میں موجود فکر و فلسفے کی بلندی کو فضا نے اس شعر کے ذریعے کامیابی کے ساتھ چھونے کی کوشش کی ہے۔

موج مصروف تھی خود اپنا سفر کرنے میں
ورنہ کیا دیر تھی قطرے کو گہر کرنے میں

اگرچہ دونوں اشعار کی ردیف مختلف ہے تاہم شعر کی فنی خوبیوں سے لے کر فکر و فلسفے کی گہرائی تک دونوں شعروں میں حیرت انگیز یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ شعری تجزیہ اس بات کو سند اعتبار عطا کرتا ہے کہ مشرقی یوپی کے دور افتادہ ضلع کا یہ باشندہ کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ بقول قمر رئیس:

''فضا کی غزلوں میں ان کے عہد کا اجتماعی آشوب اور شخصی حقائق کا کرب دونوں کی آمیزش دیکھنے کو ملتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ روایت کے توانا عناصر کو جذب کرنے کے باوجود فن شاعری کے جدید تقاضوں کو برتنے کا ہنر جانتے تھے۔ راست اظہار کے بجائے استعاراتی اسلوب میں اپنی بات کہتے۔ اگرچہ بجا طور پر انہیں شکوہ بھی رہا۔

ہم سجاتے رہ گئے اپنی بصیرت کی دکان
پاگئے داد ہنر کتنے ہنر ناآشنا''

فن شاعری کو فکر و آگہی کا سرچشمہ بنانے والے اس ممتاز غزل گو کی عظمتوں کا اعتراف بھی کیا گیا اور ادبی حلقوں میں اسے داد وتحسین سے بھی نوازہ گیا وہ اس خراج تحسین کے ہر طرح سے لائق بھی تھے۔ جہاں ایک سمت ان کی نکتہ سنجیوں، نادر ترکیبوں اور صوتی آہنگ نے جدید شاعری کو ایک نیا موڑ دیا وہیں دوسری جانب اسلامی روایات کی پاسداری نے ان کو دیگر معاصر شعرا میں ممتاز کر دیا۔ لفظوں کے حسن انتخاب، علوئے فکر، جدت طرازی اور شعری تراکیب کی مدد سے انھوں نے خشک تصور کیے جانے والے موضوعات کو سحر انگیز اسلوب میں ڈھال کر کے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری مسحور ہو کر رہ جائے۔ جب یہ شعری تخیلات لفظوں کے پیکر میں ڈھل کر نمایاں ہوتے ہیں تو شاعر کی جلوہ گری اور عشوہ طرازی کی گواہی دیتے ہیں۔

پابندیِ تقدیر نہیں شیوۂ مومن
تدبیر سے اس کی حد تقدیر ملی ہے
ارباب صنم خانہ بہ حیرت نگراں ہیں
اسلام کو وہ سطوت تعمیر ملی ہے

تہذیب جدید اور آج کی مادی دنیا کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ روحانیت اور اخلاقی قدروں سے محروم ہو کر ظلمتوں کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ وہ بنی آدم جو اپنے علم وفضل کی بنا پر کبھی مسجود ملائک بنا تھا دنیوی حرص وہوس کا شکار ہو کر اپنی پرواز بھول بیٹھا ہے۔ شاہین کا کردار فراموش کر زاغ کی فطرت اختیار کرنے والے انسان کی کم نگہی اور عیاری نے فضا کو طنز کی شدت میں ڈوبے یہ اشعار کہنے پر مجبور کیا۔

پاش پاش آئینہ طلعت شبنم تو نہیں؟
تھا جو ''مسجود ملائک'' یہ وہ آدم تو نہیں؟
خاک بے نور کا فانوس پہ سورج کا گہن
رات کی زرد قبا، صبح کی میت کا کفن
عالم بے عمل و حاجی بے مکہ و خیف
فاضل بے کتب و غازی بے نیزہ وسیف

مذکورہ اشعار میں اپنے پیش رو اقبال کا کامیاب تتبع کرنے والے فضا ابن فیضی صرف عذاب دانش حاضر کا نوحہ نہیں کرتے بلکہ وہ نسخہ کیمیا بھی عطا کرتے ہیں جس سے کہ فکری انحطاط کے شکار انسانوں کی چارہ سازی ہوسکتی ہے۔

جہاں میں زندگی مستقیم پیدا کر
قرون خیر کی شان قدیم پیدا کر
زمانہ تجھ سے بغاوت کی چال چل نہ سکے
وہ زور دست عصائے کلیم پیدا کر
جہان کفر ہے پھر معجزہ طلب تجھ سے
فلک پہ پھر کوئی ماہ دو نیم پیدا کر

ادبی دانش کدے میں فکری بصیرت کے ساتھ مذہبی افکار کا بھرپور اظہار بھی فضا کے دست ہنر کا کمال ہے۔ کس قدر خوبصورتی کے ساتھ وہ عصری احساسات سے بھرپور واقفیت نیز جدید تقاضوں سے مکمل آگہی کے ساتھ قدیم موضوعات کو موضوع سخن بناتے ہیں۔ قدیم وجدید کے اس حسن امتزاج نے ان کے کلام کو سند اعتبار عطا کیا ہے۔ میں اپنی بات فضا کے اس شعر کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

یہ شاعری جو ہے اک نوع کی عبادت ہے
فضا اسے کبھی شوق فضول مت کہنا

کتابیات

جابر زماں (مرتب)، کلیات فضا ابن فیضی: مکتبہ نعیمیہ، مئوناتھ بھنجن، یوپی

قمر رئیس، ایوان اردو دہلی، مارچ 2009

مسعود حسین خان، مقالات مسعود

■

Dr. Aftab Ahmad Manery
C-183, Near Tayyeb Masjid
Shaheen Bagh,
New Delhi-110025
Mob. 9319663297
Email. aahmad9@jmi.ac.in

محمد ارشد انصاری

بچّوں کے شفیع الدین نیر

شفیع الدین نیر (1978-1903) کا شمار ان ادبا و شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی پوری زندگی بچوں کے ادب کے لیے وقف کر دی۔ انھوں نے صرف بچوں کے ادب کو اپنا مطمحِ نظر جانا اور زندگی کی آخری سانس تک ادبِ اطفال کی خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے اس سے ہٹ کر بڑوں کے لیے لکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے بچوں کے لیے جو کچھ بھی لکھا وہ یہ سوچ کر لکھا کہ ایک مقدس قومی اور انسانی فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ وہ بچوں کی نفسیات، رجحانات، پسند و ناپسند اور جذبات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ حالی، اسماعیل میرٹھی اور اقبال کی قائم کردہ روایت کو بہت آگے لے گئے۔ آج وہ بچوں کے عظیم شاعر کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

بچوں سے ایسے لب و لہجے میں بات کرنا جو دل نشیں اور خاطر نشان ہو آسان بات نہیں ہے۔ اس کے لیے طبیعت میں خلوص، دل میں محبت اور ذہن میں معصوم شوخی اور شگفتگی ضروری ہے۔ بچوں کی نفسیات اور دلچسپیوں کے بارے میں غور و فکر کرنا اور ان کی امنگوں کو سمجھنا آسان کام نہیں، اس کے لیے خود بچہ بننا پڑتا ہے، ان کی فطرت کو سمجھنا ہوتا ہے اور ان سے انھیں کی زبان میں بات کرنی ہوتی ہے۔ نیر صاحب اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ہلکی پھلکی زبان، سیدھے سادے لہجے اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہ بچوں کے لیے ایسی دلچسپ کہانیاں، خوب صورت نظمیں اور مزیدار چٹکلے لکھتے رہے ہیں کہ بچے یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے یہ انھیں کی بات ہے، انھیں کے دماغ نے اسے سوچا ہے اور انھیں کے دل سے یہ نکلی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے۔ ''بچوں کے لیے لکھنے میں خود اپنے اندر سوئے ہوئے بچے کو جگانا پڑتا ہے اور اسے اپنے آپ سے مانوس بھی کرنا پڑتا ہے''

(محمد شفیع الدین نیر: اطہر پرویز، مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی، ص 36)

نیر صاحب کے یہاں یہ بچہ کبھی نہیں سویا۔ انھوں نے اس بچے سے صرف اپنی شاعری اور کہانیوں ہی میں کام نہیں لیا بلکہ زندگی بھر اس کے کہے پر عمل بھی کیا۔

شفیع الدین نیر کے تخلیقی سفر کا آغاز اس وقت سے ہوا جب وہ دہلی کے ماڈرن اسکول میں استاد کی حیثیت سے پڑھانے لگے۔ انھیں احساس ہوا کہ اردو میں ننھے منے بچوں کے لیے ایسی نظمیں نہیں ہیں جیسی انگریزی زبان میں موجود ہیں اور اسی وقت سے وہ بچوں کے لیے لکھنے لگے۔ نیر صاحب نے تقریباً 19 سال تک وہاں کام کیا اور اسی اسکول نے مولوی شفیع الدین کو نیر بنایا۔ اس کے بعد نیر صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مدرسہ ثانوی میں اردو کے معلم ہوئے۔ وہ بچوں کو پڑھاتے اور ان سے اپنی تخلیقات کے لیے مواد حاصل کرتے تھے۔ یہیں ان کے تخلیقی جوہر کو نکھرنے کا موقع ملا۔

شفیع الدین نیر کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے مضمون 'اعتراف حق' میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ان میں بچوں کے ذہن کو سمجھنے اور ان سے محبت کرنے کی وہ صفت ہے جو پیدائشی معلم کا جوہر ہوتی ہے۔ نیز ذوق ادب اور ذوق جمال کی سمت بچوں کی رہنمائی کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت، ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہے'' (نیر، 1977 جیسا کہ زیدی، 1989 میں حوالہ دیا گیا ہے)۔ بچوں کے لیے جو نظمیں انھوں نے لکھی ہیں وہ ایک پیش رو کی حیثیت سے ان کا نہایت ہی بیش قیمت کارنامہ ہے۔ انھوں نے وہ میدان سر کیا ہے، جسے سر کرنے کی بہت ہی کم اصحاب نے جرأت کی ہے۔ ان کی نظموں نے تعلیم کے خشک کام کو خوشگوار بنا دیا ہے۔ ان بچوں میں بھی ادبی دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو دوسرے مضمونوں کی طرح مادری زبان کی تحصیل کو غیر دلچسپ سمجھتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیر صاحب بچوں کی نفسیات کو پوری طرح سمجھتے تھے بلکہ ان تغیرات کا بھی پورا شعور رکھتے تھے جو عمروں کے تفاوت سے لازمی طور پر بچوں کے جذبات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کے ذہن، ماحول اور نشیب و فراز کو سمجھنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی شعری اور نثری تخلیقات میں بچوں کی عمر، نفسیات اور ذہنی استعداد کا شعور ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ انھوں نے بچوں کی تفریح، ان کی اخلاقی تعلیم اور ذہنی نشو و نما کے لیے کثیر تعداد میں نظمیں، کہانیاں اور معلوماتی مضامین لکھے ہیں، جن کی زبان ہلکی پھلکی اور عام فہم ہے۔ ان کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں ہر عمر کے بچوں کی پسند کی نظمیں مل جاتی ہیں۔ ان نظموں میں آسانی سے یاد ہو جانے کی خصوصیت بھی موجود ہے۔ ان کی تحریروں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی اخلاقی پیام ہوتا ہے جسے وہ بچوں کی ہی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ بچوں کو ان کی بات سمجھنے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی نظموں میں نغمگی کے ساتھ شگفتگی اور روانی ہے۔ نظموں کے موضوعات زندگی سے متعلق ہیں اور ان میں تنوع کی کمی کا مطلق احساس نہیں ہوتا۔ ان کی نظموں کے موضوعات بچوں کو اخلاقی تعلیم دینے کا وسیلہ ہیں۔ ان کی تخلیقات بچوں کو اخلاقیات اور انسانیت کا درس دینے کے ساتھ انھیں اپنی ذہنی اور عملی قوتوں کو انسان کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ بچے نیک، صلح کن، صداقت شعار، مودب و مہذب، محنتی، سمجھدار، عبادت گزار، انسان دوست اور محبّ ملک و قوم بنیں۔ وہ بچوں کے ذہنوں کو علم کی روشنی سے منور کرنا چاہتے تھے۔ بچوں کا تحفہ، وطنی نظمیں، اسلامی نظمیں، اخلاقی نظمیں، منّی کے گیت، منّی کا تحفہ، ہماری زندگی اور بچوں کا کھلونا، ان کی نظموں کے اہم مجموعے ہیں۔

شفیع الدین نیر کی تعلیمی نظموں کا مجموعہ 'بچوں کا تحفہ'

بہت مقبول ہوا۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، حصہ اول میں چھبیس اور حصہ دوم میں چوبیس نظمیں ہیں۔ ان نظموں کے ذریعے بچوں کو اپنے گرد و پیش کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کی طرف مائل کیا گیا ہے۔ 'بچوں کا تحفہ' کی نظموں کی فنی خصوصیات کے بارے میں شفیع الدین نیر خود یوں رقمطراز ہیں: ''ان نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ میں نے ان نظموں کے ذریعے بچوں کو گرد و پیش کی چیزوں سے دلچسپی لینے اور ان کا بغور مشاہدہ کرنے کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضرورت تھی کہ زبان سلیس، عام فہم اور بامحاورہ ہو، خیالات سادہ ہوں، عام اور مفید معلومات فراہم کی جائے۔ تعمیر نصیحت کا پیرایہ اختیار کیے ہوئے اخلاقی تعلیم کا پورا لحاظ رکھا جائے، نظموں میں روانی اور اختصار ہو، عنوانات میں تنوع ہو، بحریں قابلِ ترنم ہوں۔'' (وطنی نظمیں (اشاعت سوم): شفیع الدین، نیر کتاب گھر، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1968، ص 7) نیر صاحب نے اپنی تمام نظموں میں ان خصوصیات کا پورا لحاظ رکھا ہے۔

'بچوں کا تحفہ' حصہ اول میں صبح، شام، باغ کی سیر، موٹر، گرمی، بلی کا بچہ، عید کا چاند، بہار کا موسم، ہوا، صفائی وغیرہ نظمیں شامل ہیں۔ نظم 'شام' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

ہوئی شام سونے کا وقت آ گیا
اندھیرا سا چاروں طرف چھا گیا
گیا ڈوب پچھم میں اب آفتاب
اُفق پر چمکنے لگا ماہتاب
پرند آشیانے میں جانے لگے
مویشی بھی جنگل سے آنے لگے
فلک پر ستارے چمکنے لگے
جواہر کی صورت دمکنے لگے
ہیں سب صاف صاف اور نکھرے ہوئے
ہر اک سمت موتی سے بکھرے ہوئے

(بچوں کا تحفہ: شفیع الدین نیر، حصہ اول، محبوب المطابع دہلی، 1955، ص 17)

'منی کے گیت' میں آؤ چندا ماما آؤ، منی کی بکری، منی کی لوری، دیوالی آئی، منی کی موٹر، منی کی بلی وغیرہ نظمیں شامل ہیں۔ نظم 'منی کی بلی' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

منی نے ایک بلی پالی بلی پالی کالی کالی
آنکھیں اس کی نیلی پیلی نیلی پیلی اور چمکیلی
دن بھر موج اڑاتی تھی وہ دودھ ملائی کھاتی تھی وہ
چھپا کو وہ دیکھ جو پاتی مار کے اس کو چٹ کر جاتی

(منی کے گیت: شفیع الدین نیر، نیر کتاب گھر، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1962، ص 26)

نظموں پر مشتمل ان کے دوسرے مجموعے 'وطنی نظمیں' میں ہندوستانی بچوں کا گیت، صبح وطن، ہمارا پیارا وطن، وطن کی محبت، دریائے گنگا، ہماری زبان، ہمالیہ پہاڑ اور قومی ترانہ وغیرہ نظمیں ہیں۔ نظم 'وطن کی محبت' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

وہ چڑیا وہ طوطا وہ مینا وہ مور
وہ کوئل وہ بلبل وہ قمری، چکور
وہ جھیلوں کی لہریں وہ دریا کا زور
وہ جھرنوں کا گرنا، وہ پانی کا شور
وہ سرسبز اس کے پہاڑ اور بن
یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن

(وطنی نظمیں: شفیع الدین، ص 35)

نظموں کے علاوہ نیر صاحب نے بچوں کے لیے بے شمار کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی کوشش رہی ہے کہ بچوں میں کہانی کے وسیلے سے مطالعے کی عادت پڑے اور عمر کے ساتھ ساتھ ان کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی اضافہ ہو۔ تارہ کا ڈنڈا، پرستان کی سیر، ریڈیو کا بھوت، بونے کا انصاف، مکھن کا ڈبّہ، ڈھول کا پول، بدّھو کی بیوی، میاں مٹھو، طلسمی دنیا، ہماری زندگی، آٹے کا پتلا، عید کے کھلونے، گھر جاؤں تو کیسے وغیرہ ان کی کہانیوں کے مشہور اور مقبول مجموعے ہیں۔ شفیع الدین نیر نے بچوں کی عمر کے مختلف ادوار اور ان کی نفسیاتی استعداد کے اعتبار سے تمام کہانیاں قلم بند کی ہیں۔ یہ اعتبار مدارج تین سے پانچ برس، چھ سے آٹھ برس اور نو سے بارہ برس تک کے بچوں کے لیے زبان و بیان کا خیال رکھا اور کوشش کی کہ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے ذخیرۂ الفاظ اور معلومات میں بھی مناسب اضافہ ہوتا رہے اور بچوں میں کہانی کے وسیلے سے مطالعے کی عادت پڑے۔ نیر صاحب نے اپنی کہانیوں کو ایسی فنکارانہ مہارت سے پیش کیا ہے کہ چھوٹے بچے بے ساختہ ان کتابوں پر لپکتے ہیں۔ 'شیر خاں کے معرکے' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''کرتے بھی کیا چند روز رو دھو کر بیٹھ رہے۔ باپ کے بعد بھی پڑھنے میں دل سے لگے رہے۔ ماں سے پہلے ہی محبت تھی، اب وہ اور بھی بڑھ گئی۔ ان کی خوشی اور آسائش اب ماں ہی کے دم سے تھی۔ ہر وقت پروانے کی طرح اپنی ماں پر فدا رہتے تھے۔ ماں کے پسینے کی جگہ خون بہا دینے کو معمولی بات سمجھتے۔ میاں کی جدائی کا صدمہ ان کی ماں کو اندر ہی اندر گھلا رہا تھا مگر وہ باہمت بی بی اپنے صدمے کو چھپائے رکھتی۔ بچوں کے کڑھنے اور غمگین ہونے کے خیال سے کبھی ظاہر نہ ہونے دیتی۔ اس صدمے نے آہستہ آہستہ ایک مہلک بیماری کی شکل اختیار کر لی'' (نیر، 1979 جیسا کہ زیدی، 1993 میں حوالہ دیا گیا ہے)۔

اس عبارت سے واضح ہوتا ہے نیر صاحب بچوں کو بہلانے میں ماہر تھے اور بچوں میں بچوں کی طرح گھل مل جانے کا گر انھیں خوب یاد تھا۔ اس اقتباس میں ماں بیٹے کی محبت اور ایک دوسرے کی غمگساری کے جذبات کو عام فہم اور آسان زبان میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔

1947 تک شفیع الدین نیر کا مرتبہ بچوں کے ایک اہم اور معتبر قلم کار کی حیثیت سے مستحکم اور مستند ہو چکا تھا۔ آزادی کے بعد بھی ان کا تخلیقی سفر مسلسل جاری رہا۔ اس اثنا میں انھوں نے نظمیں، لوریاں، نعت، قوالی، پہیلیاں، کہانی اور ڈرامے ہر صنف پر طبع آزمائی جاری رکھی۔ اس کے علاوہ شفیع الدین نیر نے بچوں کے لیے درسی، معلوماتی اور اخلاقی مضامین بھی لکھے ہیں۔ یو این او، تعلیمی میلے کی دھوم، تعلیمی میلہ، ایک پہیلی، باپو کی یاد، ان کے قابل ذکر مضامین ہیں۔ نیر صاحب نے بچوں کے لیے دیگر زبانوں سے بھی کتابیں ترجمہ کی ہیں جو نہرو بال پستکالیہ دہلی کے زیر اہتمام منظر عام پر آئیں۔ ایسی کتابوں میں پرندوں کی دنیا اور خالہ بلی کا خاندان خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ ان تخلیقات سے شفیع الدین نیر کو غیر معمولی شہرت ملی۔ موضوعات کے تنوع اور زبان کے استعمال کی بنا پر شفیع الدین نیر کو بچوں کا نظیر اکبرآبادی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

شفیع الدین نیر نے اپنی تخلیقات میں تعقل، کشادہ نظری اور انسان دوستی کا ایک ایسا نظریۂ حیات پیش کیا جو بچوں کو اس دور ترقی میں خود اعتمادی کے ساتھ زندہ رہنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ شفیع الدین نیر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں پیام تعلیم (دہلی) نے دو حصوں میں ان پر خاص نمبر شائع کیا۔ جن میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں، خشونت سنگھ، ظہیر احمد صدیقی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر قمر رئیس اور احمد جمال پاشا جیسے اہل قلم نے شفیع الدین نیر کی زندگی میں ہی ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا۔

(اردو میں بچوں کا ادب: خوش حال زیدی، ادارہ بزم خضر راہ، کانپور، اتر پردیش، ص 215)

شفیع الدین نیر کا نام بچوں کے عظیم شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

■

Md. Arsad Ansari
Assistant Professor in Education
IASE, Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mob.:9911543984

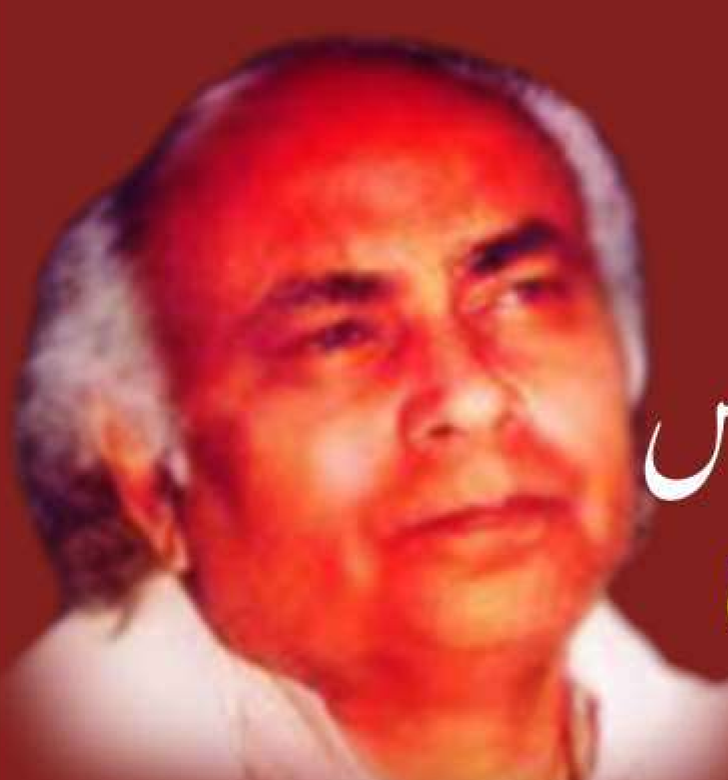

انظرنبی ڈار

صحرائے جمالیات کا تنہا قیس شکیل الرحمن

ویسے بھی اردو میں جمالیات کی حیثیت ایک وادی غیرذی زرع کی سی تھی شکیل الرحمن نے اسے ایک سرسبز اور شاداب خطے میں تبدیل کردیا۔ اردو میں جمالیات کو جو جدت، وسعت، تازگی اور تحرک نصیب ہے وہ فیض ہے شکیل الرحمن کی ریاضت کا وہ جمالیات کے بحر بیکراں میں قدم نہ رکھتے تو بھتوں کو اس کی اوپری سطح کا بھی پتہ نہ چلتا... دشت جمالیات کے وہ تنہا قیس ہیں اور اس کوہ کے اکیلے فرہاد۔

شکیل الرحمن کا نام اردو تنقید میں ایک کوکب درخشاں کی مانند ہے، جس کی تابانی و لمعانی نے اردو تنقید کے جمالیاتی افق کو منور و مجلی کیا۔ جمالیات کی حکیمانہ اور فلسفیانہ وادی میں قدم رکھنا ہرگز آسان نہیں یہاں قدم قدم پر آبلہ پائی کا خطرہ ہے۔ شکیل الرحمن نے شکستہ پائی کی پروا کیے بغیر شاہراہ جمالیات پر قدم رکھا اور اس شاہراہ پر جمالیات کے نشان فرخ کو قائم کیا۔ اردو میں جمالیاتی تنقید کا ایک مستحکم استعارہ شکیل الرحمن ہیں۔ انھوں نے اپنی تنقیدی دراکی کی بدولت جمالیاتی تنقید میں وہ انفراد و امتیاز حاصل کیا کہ 'بابائے جمالیات' کے نام سے معروف ہوئے۔ اردو ادب میں شکیل الرحمن سے قبل جمالیاتی تنقید کی محدود صورتیں نظر آتی ہیں جہاں لفظوں کی نزاکت، معنی کی ندرت، صنائع بدائع کی آمیختہ گری اور تشبیہات و استعارات کی جلوہ گری کو ہی جمالیات کے زمرے میں شامل کیا جاتا رہا لیکن شکیل الرحمن نے اپنی باریک بیں اور نکتہ داں طبیعت سے جمالیات کی نئی اور انوکھی جہات کو متعارف کرایا۔ شکیل الرحمن کا تنقیدی مطاف خاصا کشادہ ہے جس میں جنسیات و نفسیات کی پرپیچ لکیریں، علم الاصنام یا علم الاساطیر کی رومان پرور کائنات، ہندوستان کی جمالیات کے دلآویز مرقعے، بدھ جمالیات سے جمالیات غالب کا وقوف، تصوف کی جمالیات اور دیگر کئی ایسے درمکنون موجود ہیں جو قاری کے قلب ونظر کو مسحور اور مبہوت کر دیتے ہیں۔ ان کی تنقیدی نگارشات کو پڑھنے کے بعد یہ شفاف تاثر قائم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر لفظ کو اپنا خون جگر دیا ہے اور اپنے عمیق مطالعے سے جمالیاتی تنقید کے دبستان کو مزین و مملو کیا ہے۔

شکیل الرحمن کا محبوب موضوع جمالیات ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے اپنی ذہانت اور مہارت کا ثبوت دے کر گراں مایہ تصانیف چھوڑی ہیں، جن میں امیر خسرو، نظیر اکبرآبادی، مرزا غالب، اقبال، فیض، فراق، پریم چند اور منٹو کے جمالیاتی نکات انفراد و امتیاز کو سامنے لانے کی مستحکم کوشش کی ہے۔ شکیل الرحمن کی تنقیدی کائنات میں متنوع رنگوں کی جلوہ گری موجود ہے۔ ان رنگوں سے تشکیل پذیر خاکوں کا عرفان و اذعان حاصل کرنے کے لیے لازم ہے کہ قاری جمالیات کی مبادیات سے واقف ہو اور اُس سے حسن و جمال کا معنوی ادراک ہو۔ جمالیات کے ساتھ شکیل الرحمن کی ذہنی اور قلبی وابستگی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش کے ایک سوال سے متعلق یہ جواب مرحمت فرمایا کہ:

''میں کب پیدا ہوا؟ میں تو کبھی پیدا ہی نہیں ہوا بھائی i was never born اور میں کبھی مروں گا ہی نہیں And i will never die میں تو اس دنیا کے جلال و جمال کو دیکھنے آیا تھا چلا جاؤں گا''

(انشا، کلکتہ شکیل الرحمن نمبر، 2010، ص8)

شکیل الرحمن نے اپنی عمر عزیز کا بیش تر حصہ جمالیاتی تفہیم میں صرف کیا اور جمالیات ان کے قلب و جگر میں یوں سرایت کر گیا کہ پھر جس طرف بھی نگاہ کی حسن و جمال سے بھرپور کائنات نظر آئی۔ شکیل الرحمن کی تنقیدی بصیرت کا اعتراف اس طرح نہیں کیا گیا جس کے وہ

حقدار تھے۔ان کی بصیرت افروز تنقیدی نگارشات کی جانب کم توجہ منعطف کی گئی لیکن جن ناقدین نے شکیل الرحمٰن کے تنقیدی قلزم میں غوطہ زن ہونے کی جرأت مندانہ کوشش کی انھیں اس کی تہہ میں ادبی تفہیم کے قیمتی موتی ہاتھ آئے۔ اردو ادب کے بالیدہ نقاد حقانی القاسمی نے شکیل الرحمٰن کے تنقیدی اختصاص کو ان لفظوں میں خراج نیاز پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''ویسے بھی اردو میں جمالیات کی حیثیت ایک وادی غیر ذی ذرع کی سی تھی شکیل الرحمٰن نے اسے ایک سرسبز اور شاداب خطے میں تبدیل کردیا۔ اردو میں جمالیات کو جو جدت، وسعت، تازگی اور تحرک نصیب ہے وہ فیض ہے شکیل الرحمٰن کی ریاضت کا وہ جمالیات کے بحر بیکراں میں قدم نہ رکھتے تو بہتوں کو اس کی اوپری سطح کا بھی پتہ نہ چلتا... دشت جمالیات کے وہ تنہا قیس ہیں اور اس کوہ کے اکیلے فرہاد۔''

(حقانی القاسمی، شکیل الرحمٰن کا جمالیاتی وجدان، کراچی: زین پبلی کیشنز، 2011، ص29)

نقد شکیل کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کے یہاں تنقید اور تخلیق میں وصل اور وحدت کی آمیختہ گری نظر آتی ہے۔جس کے نتیجے میں ان کی تنقید کو تخلیقی تنقید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔تنقیدی فکر میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ تنقید کو بھی فکشن کی طرح ساحرانہ کیفیات کا حامل ہونا چاہیے، جس کو پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن پر فن کی طرح انوکھے قسم کے تاثر کا ارتسام ہو۔تنقید کو بھی جمالیاتی اہتزاز کا موجب ہونا چاہیے۔ان کے تنقیدی اظہار میں جذب اور ادغام کی ایسی آمیزش ہے کہ ان کی تنقید پر بھی تخلیق کا گماں ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: ''میں تخلیقی تنقید کو 'دیپک راگ' تصور کرتا ہوں۔'وہ دیپک راگ' کہ جس سے قاری کے دل و دماغ میں چراغاں کی سی کیفیت پیدا ہوجائے۔''

(محمد صدیق نقوی، ترتیب وتہذیب، شکیل الرحمٰن اور مولانا رومی کی جمالیات، ادونی (اے پی) انڈیا: صفدر پبلی کیشنز، 2003، ص113)

شکیل الرحمٰن کے اسی امتیاز کا تذکرہ کرتے ہوئے کوثر مظہری رقمطراز ہیں:

''شکیل الرحمٰن کی تنقیدی و تخلیقی قوت کے نمونے کم نہیں جن لوگوں نے انھیں پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں ایک خاص طرح کی دلکشی اور جاذبیت ملتی ہے۔ نثر میں جو بہاؤ اور ایک طرح کی تخلیقیت ہے اس کے سبب ان کی تحریروں میں اکتاہٹ کے بجائے Readability پیدا ہوجاتی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ اوڑھی ہوئی نظریاتی تنقید سے الگ رہتے ہوئے انھوں نے ہمیشہ احساس کی آنکھوں سے فن پاروں کو پڑھا اور تجزیاتی و جمالیاتی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔''

(کوثر مظہری، ترتیب ومقدمہ، متنو شناسی اور شکیل الرحمٰن، گڑگاؤں: انجمن پبلی کیشنز، 2008، ص7)

شکیل الرحمٰن کا تنقیدی وصف انھیں اردو ادب کے جید ناقدین کی صف میں کھڑا کرتا ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقی تنقید کے اجتہادی طریقہ کار سے تنقید کے منفرد قرینے کی اختراع وابتدا کی۔شکیل الرحمٰن کے تنقیدی شعور سے مذہب، تاریخ، نفسیات، اساطیر، فنون لطیفہ اور فلسفے کا غیر مبہم تاثر ملتا ہے۔انھوں نے ہندوستان کے مختلف مذاہب اور تہذیب وثقافت کا بڑی گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان تمام عناصر کا نمایاں اثر شکیل الرحمٰن کے تنقیدی وجود سے چھلکتا ہے۔شکیل الرحمٰن نے قرآن مجید جمالیات کا سرچشمہ (مقدمہ) لکھ کر قرآن کو جمالیات کا منبع مانا ہے۔اس مقدمے کو پڑھ کر شکیل الرحمٰن کے محض تنقیدی اعماق کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ عارفانہ تنقید کے اکسیر نمونے سامنے آتے ہیں۔قرآن مجید کے بحر ذخار میں جمالیاتی اسرار وغوامض کی تلاش آسان نہیں یہ کام کسی غبی اور کند ذہن کا نہیں اس کے لیے شکیل الرحمٰن جیسے پیر جمالیات کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کائنات کے ہر ذرے میں پوشیدہ توازن و اعتدال پر تدبر وتفکر کی دعوت دیتا ہے، کائنات میں موجود اشیا کے اندر جمال وجلال کی جلوہ سامانیوں کا ادراک بخشتا ہے۔ انھوں نے اپنے مقدمے کا آغاز ہی ان لفظوں سے کیا ہے کہ:

شکیل الرحمن نے اپنے تنقیدی وجدان کی بنیاد پر مولانا رومی جیسے نابغہ دوراں اور کہنہ مشق شاعر کو جمالیاتی انتقاد پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے کلام رومی کا مطالعہ جس دروں بینی اور عمیق نگاہی سے کیا ہے، یوں لگتا ہے کہ شکیل الرحمٰن کسی سالک کی طرح رومی کے کلام میں موجود اسرار ورموز کی پرسکوت لہروں کو محسوس کررہے ہیں اور ان لہروں کو اپنے وجود میں جذب کر کے جمالیاتی انبساط و اہتزاز حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے رومی کے تخلیقی شہ پارے یعنی 'مثنوی مولوی معنوی ہست قرآن درزبان پہلوی، کے مصداق کلام میں عشق کے متنوع تجربات کو نمایاں کیاہے۔

''قرآن حکیم جمالیات کا بھی ایک عظیم تر سرچشمہ ہے! اللہ نور کائنات ہے۔ جلال و جمال کی اس کائنات کا خالق! قرآن نے اللہ کو نور کائنات بتایا ہے۔''

(شکیل الرحمٰن، قرآن حکیم جمالیات کا سرچشمہ (مقدمہ)، گڈگاؤں (ہریانہ): عرفی پبلی کیشنز، 2000، ص5)

شکیل الرحمٰن نے اپنی بات کو مستحکم اور معتبر بنانے کے لیے قرآن حکیم سے اخذ واستفادہ کیا ہے انھوں نے قرآن حکیم سے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ نور کائنات ہے اور دنیا کی ہر شے اسی نور کی اثر پذیری سے حسین وجمیل ہیں۔ وہ قرآن مقدس کی اس آیت کو بطور برہان پیش کرتے ہیں: ''اللہ آسمانوں ورزمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل ایسی صاف شفاف کہ گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے۔''

(قرآن کریم، سورہ النور، آیت نمبر 35)

شکیل الرحمٰن کائنات کی اشیا میں حسن کی بوقلمونی کے اس لیے قائل ہیں کہ ان میں حسن مطلق یا حسن حقیقی کا پرتو موجود ہے، اس اعتبار سے حسن کائنات کی علت حسن الوہی ہے۔شکیل الرحمٰن کی عمیق نظر میں اس عالم طبیعی کی ہر چیز حسن و جاذبیت کا پیکر ہے اور اس کائنات کی ہر شے حسین ونظر افروز ہے۔

شکیل الرحمٰن نے اپنے تنقیدی وجدان کی بنیاد پر مولانا رومی جیسے نابغہ دوراں اور کہنہ مشق شاعر کو جمالیاتی انتقاد پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے کلام رومی کا مطالعہ جس دروں بینی اور عمیق نگاہی سے کیا ہے، یوں لگتا ہے کہ شکیل الرحمٰن کسی سالک کی طرح رومی کے کلام میں موجود اسرار ورموز کی پرسکوت لہروں کو محسوس کررہے ہیں اور ان لہروں کو اپنے وجود میں جذب کر کے جمالیاتی انبساط واہتزاز حاصل کررہے ہیں۔انھوں نے رومی کے تخلیقی شہ پارے یعنی 'مثنوی مولوی معنوی ہست قرآن درزبان پہلوی، کے مصداق کلام میں عشق کے متنوع تجربات کو نمایاں کیا ہے۔شکیل الرحمٰن کے نزدیک عشق کلام رومی کا بنیادی جوہر ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا رومی کے نزدیک عشق زندگی کا سرچشمہ ہے، یہ عشق ہی کا سفر ہے جو جاری ہے۔ اس طرح عشق ایک کائناتی اصول بن جاتا ہے کہ جس سے زندگی کی ابتدا ہوتی ہے زندگی کی وحدت ہو یا کائنات کے جلال و جمال کی وحدت اس کا شعور صرف عشق سے حاصل ہوتا ہے۔کائنات میں جمالیاتی وحدت ہی مختلف جلوؤں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔''

(محمد صدیق نقوی، ترتیب وتہذیب، شکیل الرحمٰن اور مولانا رومی کی

جمالیات، ادونی (اے پی) انڈیا: صفدر پبلی کیشنز، 2003، ص 107)

'رومی کی جمالیات' شکیل الرحمن کی اردو زبان میں ایک اضافے کا درجہ رکھتی ہے اس کتاب میں شکیل الرحمن نے مولانا رومی کے دروں تک رسائی حاصل کی ہے انھوں نے مولانا رومی کی شاعری میں نہفتہ جمالیات کی پرت در پرت خوبیوں کو منور کیا ہے۔

شکیل الرحمن نے اردو ادب کے نامور اور قد آور فکشن نویس پریم چند کو بھی مدار تنقید بنایا ہے۔ پریم چند کی شخصیت اور ان کی تخلیقات کو کئی ناقدین نے تختۂ مشق بنا کر اپنے تنقیدی موقف کو پیش کیا ہے۔ یہ نقد شکیل کا اختصاص ہے کہ انھوں نے پریم چند کی تخلیقی کائنات کا مطالعہ کرنے کے بعد 'فکشن کے فنکار: پریم چند' لکھ کر اپنا منفرد تنقیدی نقطۂ نظر سامنے رکھا ہے۔ شکیل الرحمن کا پریم چند سے متعلق تنقیدی موقف یہ ہے کہ وہ بڑے افسانہ نگار تو ہیں بڑے ناول نگار نہیں، اسی تنقیدی موقف کو بنیاد بنا کر انھوں نے جس انداز سے پریم چند کے ناولوں کا تجزیہ کیا ہے اور فنی سقم کو واضح کیا ہے وہ نہایت حوصلہ مندانہ فعل ہے انھوں نے پریم چند کے ناولوں کا جس خاص زاویے سے مطالعہ کیا ہے وہ پریم چند کے ان ناقدین سے متعارض ہے جنھوں نے فقط ان کے ناولوں میں مقصدی نقطۂ نظر اور اصلاحی پہلو کو مطمح نظر بنا کر اظہار نقد کیا ہے۔ 'بازار حسن' کا مطالعہ کرتے وقت اکثر ناقدین نے سیاسی زندگی کا تجزیہ کیا ہے لیکن شکیل الرحمن کی تنقیدی حس نے سمن کے نفسیاتی زیر و بم کو محسوس کیا ہے اور سمن کی بے قراری، خودداری، خودنمائی، خود بینی، عمل اور ردعمل کی آمیزش کو ہی ناول کا حسن قرار دیا ہے۔ شکیل الرحمن نے اپنی تنقیدی بصیرت سے پریم چند کے فکشن میں تیسرے آدمی کے کردار کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ پریم چند کی کہانیوں میں تیسرے آدمی کی موجودگی سے جو اتار چڑھاؤ اور تصادم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے کہانی میں المیہ کے عناصر رونما ہوتے ہیں۔ نقد شکیل کے تناظر میں یہی المیہ کے عناصر و عوامل قاری کو جمالیاتی آسودگی فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود رقمطراز ہیں:

''شہر اور گاؤں کی روزانہ زندگی میں 'تیسرے آدمی' سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے، یہ کارخانوں میں بھی ہے اور کھلیانوں میں بھی، سیاسی زندگی میں بھی تیسرا آدمی اپنا خاص مقام رکھتا ہے... ہم اسے ہیرو سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس لیے بھی کہ ہیرو کے روایتی تصور کو ابھی تک عزیز رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک بڑی سچائی ہے کہ فکشن کا اصل ہیرو یہی ہوتا ہے۔''

> ''شکیل الرحمٰن کے نزدیک دنیا کی عظیم تخلیقی نگارشات معنی و مفہوم کی تہہ داری سے مملو ہوتی ہیں جن کے مطالعے سے ہر دور میں مفاہیم کی انوکھی پرتیں کھلتی ہیں اور نئے جمالیاتی انکشافات ہوتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری میں بھی معنی و مفاہیم کا ایک انوکھا جہاں آباد ہے جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اردو کے نامور ناقدین نے منٹو کی تخلیقیت کا تجزیہ کیا ہے اور اپنا تنقیدی زاویہ سامنے رکھا ہے۔''

(شیخ عقیل احمد، مرتب، فکشن کے فن کار پریم چند اور شکیل الرحمن، نئی دہلی: نرالی پبلی کیشنز، 2009، ص 38-37)

شکیل الرحمن نے ادبی دنیا کے بے باک اور حساس تخلیق کار سعادت حسن منٹو کی جمالیاتی حسیت کو اجاگر کیا ہے۔ منٹو کی تخلیقی دنیا کو جن ناقدین ادب نے اپنی تنقیدی بصیرت کا نقطۂ ارتکاز بنایا ہے اور منٹو کی شخصیت کا پرسونا (Persona) پیش کیا ہے اُس میں منٹو کی شناخت جنس پرست، فحش نگار اور عریاں نگار کے بطور سامنے آتی ہے جس کے باعث منٹو کی حقیقی بصیرتوں اور فن کی حقیقی گہرائیوں کا ادراک نہیں ہو سکا۔ شکیل الرحمن کی تنقیدی ذہانت قابل داد ہے کہ انھوں نے منٹو کی پیچیدہ اور پُراسرار شخصیت کی تفہیم نو کر کے منٹو شناسی کی جانب ایک کامیاب قدم بڑھایا ہے انھوں نے منٹو کی تخلیقی سائیکی کے دروں میں داخل ہو کر ان کے تخلیقی برتاؤ میں مستور جمالیاتی ابعاد کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شکیل الرحمن کے نزدیک دنیا کی عظیم تخلیقی نگارشات معنی و مفہوم کی تہہ داری سے مملو ہوتی ہیں جن کے مطالعے سے ہر دور میں مفاہیم کی انوکھی پرتیں کھلتی ہیں اور نئے جمالیاتی انکشافات ہوتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری میں بھی معنی و مفاہیم کا ایک انوکھا جہاں آباد ہے جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اردو کے نامور ناقدین نے منٹو کی تخلیقیت کا تجزیہ کیا ہے اور اپنا تنقیدی زاویہ سامنے رکھا ہے۔ شکیل الرحمن نے منٹو کے خامہ زرنگار سے نکلنے والے افسانوں کی از سر نو قرأت کی ہے اور جمالیاتی قضایا کو طشت از بام کیا ہے انھوں نے منٹو کی کہانیوں میں موجود ٹریجڈی کے عناصر کی طرف اشارہ کر کے منٹو کو ٹریجڈی اور اس کی جمالیات کا عظیم تخلیقی فنکار مانا ہے۔ منٹو کے افسانوں میں موجود ٹریجڈی کے اثرات سے قاری کے دل و دماغ میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ احساس اور جذبے کو تحریک ملتی ہے جس کی بدولت قاری کو آہستہ آہستہ سکون ملتا ہے اور اس سے جمالیاتی انبساط و اہتزاز حاصل ہوتا ہے۔ شکیل الرحمن نے منٹو کے باطن میں داخل ہو کر یہ راز منکشف کیا ہے کہ

''میرا مطالعہ یہ ہے کہ ٹریجڈی منٹو کی تخلیقات کی روح ہے لہٰذا ٹریجڈی کی جمالیات ہی کے ذریعے منٹو کی بہتر دریافت ہو سکتی ہے۔''

(کبیر موریل لیکچر جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی، 21 فروری، 2008، ص 22)

شکیل الرحمن نے منٹو کی جن کہانیوں میں ٹریجڈی اور اس کی جمالیاتی خوبیوں کو نمایاں کیا ہے، ان میں ٹوبہ ٹیک سنگھ، سرمہ، ہتک، موذیل، ٹھنڈا گوشت، بابو گوپی ناتھ، خوشیا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شکیل الرحمن کے تنقیدی مزاج میں تدبر، تفکر، تحیر اور تعمق کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان ہی تخصیصی جہات کی بنا پر وہ جمالیاتی تنقید کے نقیب مانے جاتے ہیں۔ ان کے تخلیقی چمن میں خوشبودار اور متنوع پھول موجود ہیں، جن کی مہک سے قاری کے مشام جاں میں انوکھے قسم کی پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی تنقیدی نگارشات سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے گہرے مطالعے، دماغی زہد اور طبعی ریاض کی بدولت اردو میں 'بابائے جمالیات' کے لقب سے ملقب ہونے کا افتخار پایا ہے۔ ان کی تنقیدی کاوشیں قاری کی بصیرت و بصارت میں اضافہ کرتی ہیں۔ جمالیاتی ذوق کو بالیدگی بخشتی ہیں۔ جمالیاتی تفہیم کے نئے دریچے وا کرتی ہیں۔ اردو میں جمالیات اور شکیل الرحمن دونوں لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ ایک کا تذکرہ دوسرے کے ذکر کے بغیر تشنہ رہ جاتا ہے۔ نقد شکیل کی عظمت و سطوت پر یہ تجزیہ منطبق آتا ہے کہ ''پروفیسر شکیل الرحمن کی کتابیں پڑھنے کے بعد جو تاثر میرے باطن پر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ شخص ناظر جمالیات نہیں بلکہ باصر جمالیات ہے، حد رسائی اور حد نظر تک جہاں بھی جمال ہے وہاں پروفیسر شکیل الرحمن کی چشم باصر پہنچ جاتی ہے اور جمال کے باطن میں اتر جاتی ہے''۔

(محمد صدیق نقوی، ترتیب و تہذیب، شکیل الرحمن اور مولانا رومی کی جمالیات، ادونی (اے پی) انڈیا: صفدر پبلی کیشنز، 2003، ص 54)

■

Anzar Nabi Dar
Research Scholar, Dept of Urdu
Central University of Kashmir
Kashmir- 19120 (J & K)
Mob.:9906820951

عبدالواسع

متصوفانہ اقدار اور
داراشکوہ کی شاعری

”داراشکوہ ایک دانشور، صوفی، مترجم اوراديب کے ساتھ ساتھ اعلی ذوق کا حامل شاعربھی تھا۔ وہ قادری تخلص کیا کرتا تھا۔ اس کا دیوان 'اکسیراعظم' کے نام سے یادگار زمانہ ہے۔ اس کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ کچھ رباعیاں بھی ہیں۔دارا کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ اس نے قدیم فارسی ادبیات کا عمیق مطالعہ کیاتھا۔“

داراشکوہ 29 مارچ 1615 کواجمیر کے قریب پیدا ہوا۔[1] وہ شاہ جہاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ وہ اپنے والد کو دوسرے شہزادوں کے مقابلے کہیں زیادہ عزیز رکھتا تھا[2] جب وہ 16 سال کا تھا تو اس کی والدہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔اس کی بڑی بہن جہاں آرا بیگم نے اس کی دیکھ بھال کی۔ دارا کی ایک چھوٹی بہن حسن آرا بیگم بھی تھی۔[3]

داراشکوہ کو چھ سال کی عمر میں تعلیم وتربیت کے لیے عبداللطیف سلطان کے حوالے کیا گیا۔[4] میرک شیخ سے داراشکوہ نے عربی، فارسی، تفسیر اور علوم متداولہ کا اکتساب کیا۔[5] داراشکوہ فارسی، عربی اور سنسکرت زبان کا ماہر تھا۔ وہ مصنف، شاعر اور خطاط بھی تھا۔اس نے خوش نویسی کے نمونے اور مغل شہزادوں کا ایک البم تیار کیا تھا۔محمودعلی نے لکھا ہے” علوم کے علاوہ داراشکوہ نے نقاشی اور خطاطی میں بھی مہارت حاصل کی۔اس نے خوش نویسوں کے نمونے اور مغل بادشاہوں اور شہزادوں کی تصاویر کا ایک مرقع تیار کیا تھا جسے اپنی رفیقہ حیات نادرہ بیگم کو 42-1641 میں اپنے رقم کردہ دیباچے کے ساتھ پیش کیا۔“[6]

دارا کو تصوف میں خاص دلچسپی تھی۔ میاں میر[7] اور ملا شاہ بدخشی [8] کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات تھے۔ 1635 میں اس کی روحانی زندگی کا آغاز میاں میر کے اثر سے ہوا۔ میاں میر کی وساطت سے ہی اس کی ملاقات ملا شاہ بدخشی سے ہوئی۔ داراشکوہ کی ملاقات ملاؤں اور جوگیوں سے ہوتی رہتی تھی اور وہ ان سے عقائد و مذہب کو سمجھتا رہتا تھا۔[9] وہ شاہ محبّ اللہ الہ آبادی، شاہ دلربا، سرمد، بابا لال داس بیراگی کے خیالات سے کافی متاثر تھا۔[10] اس نے بھگت رامانند اور مسلم صوفی مرزا سالک لاہوری اور مرزا لاہوری سے بھی کسب فیض کیا تھا۔فارسی ادب کے عظیم اسکالر عبدالرحمٰن جامی کی کتاب 'نفحات الانس' کا بھی اس نے بدقت مطالعہ کیا تھا۔[11] اس نے چندر بھان برہمن سے بھی اخذ واستفادہ کیا تھا۔چندر بھان نہ صرف پہلا صاحب دیوان شاعر تھا بلکہ فارسی کا پہلا ہندو شاعر بھی تھا۔اس نے تصوف اور عرفان پر بہت سی کتابیں لکھی تھیں۔داراشکوہ پر اس کی روحانی تعلیم کا بہت گہرا اثر پڑا۔محمودعلی نے اپنی کتاب میں داراشکوہ کے احوال پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھا ہے۔”چندر بھان سے داراشکوہ کے خیالات میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔“[12]

داراشکوہ ایک دانشور، صوفی، مترجم اوراديب کے ساتھ ساتھ اعلی ذوق کا حامل شاعر بھی تھا۔ وہ قادری تخلص کیا کرتا تھا۔اس کا دیوان 'اکسیراعظم' کے نام سے یادگار زمانہ ہے۔ اس کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ کچھ رباعیاں بھی ہیں۔دارا کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ اس نے قدیم فارسی ادبیات کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ نظامی، سعدی، حافظ، عراقی، رومی، جامی اور سنائی جیسے شعرا کے اشعار اس کی نوک زباں پر تھے۔اس نے اپنی تصانیف حسنات العارفین، رسالہ حق نما، سفینۃ الاولیا اور سکینۃ الاولیا میں ان شعرا کے کلام سے استشہاد کیا ہے۔'رسالہ حق نما' میں اس نے حافظ کا یہ مشہور شعر استعمال کیا ہے

کس ندانست منزل گہ دلدار کجاست
این قدر ہست کہ بانگ جرس می آید[13]

داراشکوہ پر قومی اردو کونسل سے شائع شدہ کتابیں

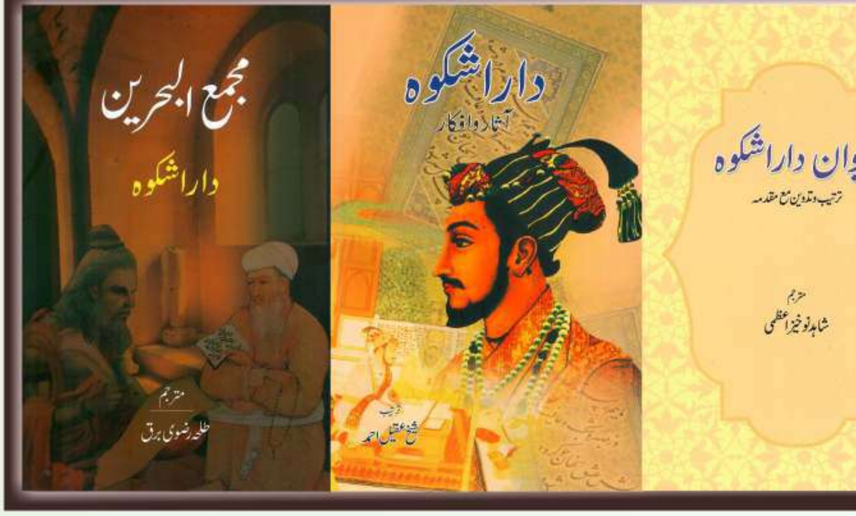

"کوئی نہیں جانتا کہ میرے محبوب کی منزل کہاں ہے۔ صرف اس قدر جانتا ہوں کہ گھنٹے کی آواز مسلسل آرہی ہے۔"

اسی طرح رسالہ حق نما میں ہی مولانا جامی کا یہ شعر استعمال ہوا ہے۔

درقافلہ کہ اوست دانم نرسم
این بس کہ رسد بگوش بانگ جرسم [14]

"میں جانتا ہوں کہ اس قافلے تک نہیں پہنچ سکتا جس میں میرا محبوب ہے۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ اس قافلے کے گھنٹے کی آواز میرے کانوں تک پہنچتی رہے۔"

رومی کا شعر بھی دارا کی اہم تصنیف 'رسالہ حق نما' میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ ایک شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہو۔

زچندیں روبہ مہمانست آورد   نیاوردت برائے انتقام او [15]

"اس نے تجھے اس راہ سے اس لیے گزارا ہے کہ ایک مہمان کی طرح تیرا استقبال کرے، اس لیے نہیں کہ ایک مجرم کی طرح سزا دے۔"

اسی طرح 'سکینۃ الاولیا' میں بھی دارا نے قدیم فارسی شعرا کا کلام جابہ جا استعمال کیا ہے۔ سنائی کا ایک شعر بطور نمونہ درج ہے۔

مجلس وعظ رفتنت ہوس است
مرگ ہمسایہ واعظ تو بس است [16]

"مجلس میں وعظ کے لیے جانا ہوس ہے، مرگ ہمسایہ ہی وعظ کے لیے کافی ہے۔"

اس کے علاوہ دارا کی دیگر تصانیف میں بھی کلاسیکی فارسی شعرا کا شعر خوب خوب استعمال ہوا ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس نے قدیم فارسی شعرا کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ دارا کی تصانیف کے مطالعے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ خاقانی، سعدی، حافظ، خسرو، عراقی اور ابوسعید ابوالخیر کے خیالات سے حد درجہ متاثر تھا۔ اس کا پورا کلام تصوف کے رنگ میں شرابور نظر آتا ہے۔

تصوف سے شغف رکھنے والے لوگ عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، طالب آملی، کلیم کاشانی اور قدسی جیسے صوفی شعرا کا کلام پڑھتے ہیں اور اپنی روحانی حس کو غذا فراہم کرتے ہیں۔ داراشکوہ کا کلام پڑھ کر بھی کچھ اسی طرح کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ بطور مثال رومی، جامی اور داراشکوہ کا کلام پیش کیا جاتا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ رومی اور دیگر قدیم صوفی شعرا کی طرح دارا کا کلام بھی اپنے اندر وہی متصوفانہ چاشنی و شیرینی لیے ہوئے ہے۔

رومی کا کلام۔

ما در رہ عشق تو اسیران بلائیم
کس نیست چنیں عاشق بیچارہ کہ مائیم
برما نظرے کن کہ دریں ملک غریبیم
برما کرمے کن کہ دریں شہر گدائیم
مرا نہ غم دوزخ و نے حرص بہشت است
بردار زرخ پردہ کہ مشتاق لقائیم [17]

"ہم عشق کی راہ میں، سخت مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ہماری طرح پریشان حال کوئی عاشق نہیں ہوگا۔"
ہم پر کرم کی نگاہ کر کیوں کہ ہم اجنبی ملک میں ہیں، ہم پر کرم فرما کیونکہ ہم اس شہر میں مفلس و بے نوا کی طرح ہیں۔ مجھے نہ دوزخ کا غم ہے اور نہ ہی جنت کی تمنا، اپنے رخ سے پردہ اٹھا کہ ہم دیدار کے خواہشمند ہیں۔"

جامی کا کلام۔

مرا شد جامہ جاں از غمت چاک
بیا اے آرزوئے جان غمناک
بیک رفتار بردی صد دل از راہ
تعالی اللہ عجب چستی و چالاک
نہانی ہر شب آیم من بکویت
گریبانے دریدہ دامنے چاک [18]

"میں تمھارے غم میں چاک گریباں ہوں، اے رنجیدہ جان کی آرزو اب تو آجا۔ ایک چال میں تو نے سیکڑوں دل کو اپنا اسیر بنا لیا، اللہ اکبر تو کتنا چالاک و چست ہے۔ میں رات کی تنہائی میں، دامن کو چاک کیے اور گریبان کو پھاڑے تمہارے کوچے میں آتا ہوں۔"

دارا کا کلام۔

ای تو اندر ہر جمالے رونما   وی تو اندر ہر لباسے آشنا
ای بہر جا حسن خوبت جلوہ گر   ای فتادہ شور حسنت جابجا
آنکہ ہر کس دید سوئے روی تو   چشم خود پوشید او از ماسوا [19]

"تو ہی ہر جمال کے اندر ہے، ہر لباس کے اندر بھی تو ہی ہے۔ تمھارا حسن ہر جگہ جلوہ گر ہے، تمہارے حسن کا شور ہر جگہ ہے۔ جس نے بھی تمہارا چہرہ دیکھ لیا، اس نے ماسوا سے اپنی آنکھ پھیر لی۔"

دارا کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ اس کی شاعری عموی طور پر دو محور پر گردش کرتی ہے۔ ایک طرف اس کی شاعری میں جہاں تصوف کے اقدار نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف وہ سلسلہ قادریہ کی تعریف میں رطب اللساں نظر آتا ہے۔ اس نے سلسلہ قادریہ سے جابہ جا اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے اور اسے تمام سلسلوں سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سلسلہ قادریہ کے حوالے سے اس کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

نگہ کردند قادر چوں در قادری   ہمہ نام کردند ایں را بقا [20]

"قادر نے جب قادری سلسلے پر غور و فکر کیا تو یہ سلسلہ ہی سب سلسلوں میں اچھا نظر آیا۔"

ہر کہ دل خویش را بست باین سلسلہ
ہردم و ہرساعتش کار بہ بالا برد
دست بدست آمدہ سلسلہ پیرما
تا بہ قیامت ہمین سلسلہ ما بود
سلسلہ قادری است آں کہ بحکم خدا
برہمہ قادر بود تا ہمہ دنیا بود [21]

"جو بھی اس سلسلے سے وابستہ ہوا، اس کا کام ہر وقت اور ہر لحہ بنتا جائے گا۔ ہمارے پیر کا سلسلہ ہاتھوں ہاتھ یہاں تک پہنچا ہے، قیامت تک یہ سلسلہ یونہی قائم رہے گا۔"

داراشکوہ صوفیوں اور سنتوں کی صحبت کا پروردہ تھا۔ اس کے کلام میں تصوف کے مضامین نہ پایا جانا غیر فطری کہا جائے گا۔ اس نے وحدۃ الوجود، توکل، فنا، تسلیم و رضا، صبر و قناعت، صدق، اخلاص، احسان، خشوع، خضوع، فقر، انابت، دنیا کی بے ثباتی اور دنیا طلبی سے گریز جیسے مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دیا ہے۔

وحدۃ الوجود کا نظریہ صوفی شعرا کے نزدیک مقبول ترین نظریہ تھا۔ تقریباً تمام صوفی شعرا نے اسے اپنا موضوع

سخن بنایا ہے۔دارا شکوہ کے یہاں بھی اس روش کا تتبع نظر آتا ہے۔ اس کے دیوان کی پہلی غزل ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحدت کا قائل ہے۔ شعر ملاحظہ ہو

ہمہ موجود در وجود ما　　گنج مخفی است این وجود ما
گرچہ در پردہ داشتیم آواز　　شد ز نے ظاہر وجود ما
ماندیدیم ہیچ غیر خود　　غیر نمود در شہود ما[22]

''ہمارے وجود میں تمام اشیا موجود ہیں، ہمارا یہ وجود چھپا ہوا خزانہ ہے۔ درپردہ گرچہ ہمارے اندر آواز ہے، پھر بھی نے سے ہمارا وجود ظاہر ہوا۔ اپنے علاوہ میں نے کچھ نہیں دیکھا، ہمارے شہود میں کوئی غیر نہیں ہے۔''

تصوف کے وہ مضامین جو عام طور پر صوفی شعرا کے یہاں ملتے ہیں، تقریباً وہ تمام دارا شکوہ کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔جس طرح صوفی شعرا کے کلام میں خدا کی تعریف اور پیغمبر اسلام سے والہانہ عقیدت کا اظہار ملتا ہے اسی طرح دارا شکوہ کے یہاں بھی اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔دارا شکوہ خدا کی تعریف اور پیغمبر اسلام سے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کرتا ہے

متوجہ مشو بغیر خدا　　رشتۂ ہست سبحہ و زنار[23]

''خدا کے علاوہ کسی دوسرے سے لومت لگاؤ، سبحہ و زنار کا سرا اسی سے ملتا ہے۔''

چند نازی تو بر شریعت خود　　احمد مرسل از خداست سوا[24]

''کب تک اپنی اپنی شریعت پر ناز کرتے رہو گے، محمد مصطفےٰ کی شریعت سب سے اعلیٰ ہے۔''

توکل دراصل کسی معاملے میں کسی ذات پر اعتماد کرنے کا نام ہے بہ الفاظ دیگر اپنی عاجزی کا اظہار، دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ توکل ہے۔تصوف کی اصطلاح میں دنیوی و اُخروی تمام معاملات میں نفع و نقصان کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو قرار دینا توکل کہلاتا ہے۔ صوفیا توکل پر زیادہ زور دیتے ہیں۔تقریباً تمام صوفی شعرا کے یہاں توکل کے مضامین بڑی اہمیت سے بیان ہوئے ہیں۔ دارا شکوہ بھی اپنے کلام میں اس مسلک کا پیرو نظر آتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو

ہر کہ دل را بزلف دلبر بست　　گشت آزاد از دو کون برست[25]

''جس نے محبوب کی زلف سے اپنے دل کو باندھ لیا، اسے دونوں جہان سے آزادی مل گئی۔''

تصوف و عرفان میں فنا و بقا کے تصور کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔فنا میں عارف اپنے ارادے و وجود کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اسے حق تعالیٰ کا وصل ہو جاتا ہے۔فنا، بقا کے حصول کا ابتدائی زینہ ہے۔فنا کے ذریعے بندہ صفات خداوندی سے متصف ہو جاتا ہے اور بقائے حقیقی کو حاصل کر لیتا ہے۔دارا شکوہ چونکہ ایک صوفی منش شاعر تھا لہٰذا اس کے کلام میں فنا اور بقا کے تعلق سے بیشمار اشعار ملتے ہیں۔بطور نمونہ یہ شعر ملاحظہ ہو:

باقی نشوی ہرگز تا می نشوی فانی
این پند بکن در گوش از قادری دانا[26]

''جب فنا نہ ہو گے ہرگز بقا نصیب نہیں ہوگی، قادری کی اس نصیحت کو غور سے سن لو۔''

انسان کا اپنے مقام، اپنی صلاحیتوں اور ذمے داری سے آگاہ ہونا خود شناسی کہلاتا ہے یعنی انسان کا اس کائنات میں کیا مقام ہے؟ وہ خالق ہے یا مخلوق؟ اور پھر اگر وہ مخلوق ہے تو اس کا درجہ کیا ہے؟ انسان کس طرح دوسری مخلوقات سے مختلف ہے۔ میں کون ہوں، میں یہاں کیوں آیا ہوں اور میرا ا خالق کون ہے ان تمام چیزوں کا جاننا تصوف میں خود شناسی یا علم حال اور خود شناس کو صاحب حال کہا جاتا ہے۔خود شناسی سے ہی 'رب شناسی' کے مقام پر فائز ہوا جا سکتا ہے۔خود شناسی کے بغیر خدا شناسی ناممکن سا امر ہے۔یہی وجہ ہے کہ تمام صوفیا نے خود شناسی پر کافی زور دیا ہے۔دارا شکوہ بھی چونکہ صوفیوں کے ماحول کا پروردہ تھا لہٰذا اس کے دیوان میں خود شناسی سے متعلق اشعار کا پایا جانا کوئی امر استعجاب نہیں ہے۔ بطور نمونہ یہ شعر ملاحظہ ہو:

عین خود بشناس یار بے بہا　　این متاع نیک در بازار نیست[27]

''اے میرے قیمتی دوست خود کو پہچان، اس سے اچھا سودا بازار میں دستیاب نہیں ہے۔''

تصوف میں فقر و غنا کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ فقر کا معنی درویشی محتاجی اور تنگی اور غنا کا مطلب دولتمندی و بے نیازی ہوتا ہے۔صوفیوں کے یہاں غنا سے مراد غنائے دل ہوا کرتا ہے۔اس سے بندہ دنیا سے پوری طرح بے نیاز ہو جاتا ہے اور صرف ایک خدا کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح فقر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ دنیا سے بے نیاز ہو کر خدا کا محتاج ہو جائے۔صوفی شعرا کے یہاں فقر و غنا کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ دارا شکوہ بھی اس کا تتبع کرتا ہوا نظر آتا ہے۔نمونے کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو

ہست کافی محبت آں یار　　دین و دنیا و زر نمی خواہد[28]

''یار کی محبت ہی کافی ہے، دین، دنیا اور مال و زر کی کیا ضرورت۔''

اسی معنی کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو

مسافر ہر قدر باشد سبکسار　　نباید در سفر تصدیع و آزار[29]

''مسافر کے پاس جتنا کم سے کم سامان ہوگا، سفر میں اسے کم سے کم پریشانی ہوگی۔''

یہ دنیا اپنی تمام تر دل فریبی و دلکشی کے باوجود فانی ہے۔ ایک نہ ایک دن اسے ختم ہو جانا ہے۔باقی رہنے والی ذات صرف اور صرف خدا کی ہے۔اسی لیے اسلام میں اخروی زندگی کو بنانے اور سنوارنے پر زور دیا گیا ہے کیونکہ اصل مقصد اخروی کامیابی ہے۔صوفیا نے بھی اسی اسلامی احکام کی پیروی میں دنیا سے دور رہنے اور آخرت کو سنوارنے پر زور دیا ہے۔ صوفی شعرا کے کلام میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کثرت سے کیا گیا ہے۔دارا شکوہ بھی دُنیا کی بے ثباتی کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے انسان دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ انسان کا وجود دنیا میں ایک مسافر کی طرح ہے۔لہٰذا اسے اس دنیا میں خود کو ایک مسافر تصور کرنا چاہیے۔چنانچہ وہ کہتا ہے۔:

تو ہم اندر جہاں ہستی مسافر　　یقیں می داں اگر ہستی تو ہشیار[30]

''تو اس جہان میں مسافر کی طرح ہے، اگر تو ہوشیار اور چالاک ہے تو اسے اچھی طرح جان لے۔''

اپنے آپ کو پہچان لینے کا نام خودی ہے۔ بندہ جب یہ جان لیتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں تو اس کی اپنی کوئی خواہش باقی نہیں رہتی اور رب کی رضا ہی اس کے لیے سب کچھ ہو جاتی ہے۔اور جب بندہ اور رب کی چاہتیں ایک ہو جاتی ہیں تو بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں بندے کی چاہت رب کی چاہت بن جاتی ہے۔ 'من عرف نفسہ فقد عرف ربہ' میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔صوفیا کے یہاں خودی کے مسئلے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔تقریباً تمام صوفی شعرا کے کلام میں خودی کے موضوع پر اشعار ملتے ہیں۔دارا شکوہ نے بھی خودی کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔وہ انا اور خود پسندی سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ایک شعر ملاحظہ ہو

ہستی خویش دور کن از سر　　گر تو داری ز جان و دل سر ما[31]

''اپنی ہستی کا خیال دل سے نکال دے۔ اگر تو جان و دل سے ہم پر فدا ہے۔''

دارا شکوہ اپنے کلام میں مثبت نظریے کا حامل نظر آتا ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ انسان کو اپنا فریضہ ادا کرتے رہنا چاہیے اور اپنی عبادتوں پر نازاں نہیں ہونا چاہیے۔ بندے کو اللہ کی رحمت سے مغفرت کی امید رکھنی چاہیے کیونکہ اس کی رحمت کافی وسیع ہے۔ خدا اپنے بندوں کے گناہوں کو ضرور بخش دے گا کیونکہ اس نے قرآن میں 'لاتقنطوا' فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

چرا لاتقنطوا من رحمت اللہ　　فرامش ساختی واللہ باللہ
چوں رحمت داست سبقت بر غضبہا　　ز'ان اللہ یغفر' باش آگاہ[32]

''اللہ کی رحمت سے مایوس کیوں ہو، خدا کی قسم تم

نے اسے فراموش کردیا ہے، اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے، کیا تمہیں 'ان اللہ یغفر' کا علم نہیں ہے۔''

ادب کی تاریخ میں ملا، مولوی، زاہد اور واعظ ادبا اور شعرا کو تختہ مشق بنایا جاتا رہا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں جس انداز میں ملا کی تنقید کی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دارا شکوہ کے اشعار میں بھی ملا پر سخت تنقید ملتی ہے۔ ملا پر دارا شکوہ کی تنقید کوئی خلاف واقعہ بھی نہیں ہے کیونکہ جس طریقے سے اس دور میں ملا کو ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اس سے دارا شکوہ کا کبیدہ خاطر ہونا لازمی امر تھا۔ دارا شکوہ سخت انداز میں ملا کی تنقید کرتا ہے۔ تنقید کا تیور ان اشعار میں ملاحظہ ہو۔

بہشت آنجا کہ ملائے نباشد زملا بحث وغوغائے نباشد
دراں شہرے کہ ملا خانہ دارد درآنجا ہیچ دانائے نباشد 33

''بہشت ایسی جگہ ہے جہاں ملا نہ ہوگا۔ بحث و مباحثہ سے وہ جگہ خالی ہوگی۔ جس شہر میں ملا کا گھر ہوتا ہے، وہاں کوئی عقلمند بود و باش نہیں کرتا۔''

دارا شکوہ نے کلام الٰہی کا مطالعہ بالاستیعاب کیا تھا۔ اس کے کلام میں اس وسیع وعمیق مطالعے کی واضح جھلک ملتی ہے۔ قرآنی آیات سے مستفاد مطالب اس کے دیوان میں جا بہ جا ملتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ملتا ہے جس کا مفہوم ہے:

{ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کردیا اور اس سے ڈر گئے (مگر) انسان نے اٹھالیا، وہ بڑا ہی ظالم جاہل ہے۔(34)}۔ کو بہت سارے صوفی شعرا نے اس آیت کریمہ کو تلمیح کے طور پر اپنے کلام میں استعمال کیا ہے اور انس وجن کی عظمت کو اجاگر کیا ہے۔ حافظ کے یہاں بھی اس آیت کریمہ سے متعلق اشعار ملتے ہیں۔ مثلا حافظ کا یہ شعر۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بہ نامِ منِ دیوانہ زدند 35

''آسمان بھی اس امانت کے بوجھ کا متحمل نہیں ہوسکا، یہ قرعہ فال اس دیوانے کے نام ہی آیا۔''

دارا شکوہ نے اس مفہوم کو اس انداز میں ادا کیا ہے۔

بارگران عشق جز آدمی نبردست
جن و ملک یقیں داں کیں بار برنتابد 36

''عشق کا بارگراں آدمی کے علاوہ اور کوئی نہیں اٹھا سکتا، جن وملک اس بوجھ کے متحمل نہیں ہوسکتے۔''

تلمیح کے مزید چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لاتجبر ازخدای شنیدند باوجود
چنداں کنند شور کہ بیزار کردہ اند
قومے کہ بستہ اند زروز الست عہد
مخفی نشستہ اند نہ اظہار کردہ اند 37

> **تصوف و عرفان میں فنا و بقا کے تصور کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ فنا میں عارف اپنے ارادے و وجود کو ختم کردیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اسے حق تعالیٰ کا وصل ہوجاتا ہے۔ فنا، بقا کے حصول کا ابتدائی زینہ ہے۔ فنا کے ذریعے بندہ صفات خداوندی سے متصف ہوجاتا ہے اور بقائے حقیقی کو حاصل کرلیتا ہے۔ دارا شکوہ چونکہ ایک صوفی منش شاعر تھا لھذا اس کے کلام میں فنا اور بقا کے تعلق سے بے شمار اشعار ملتے ہیں۔**

دارا شکوہ کے کلام میں دوسرے صوفی شعرا کی طرح تصوف سے جڑے الفاظ جیسے ذاکر، ذکر، دل، مے، فنا، بقا، صوفی، خرقہ، دستار، رائی، مرئی، زنار، عشق، فانی، رقیب، بوالہوس، خودی، زہد، جام، ملا وغیرہ خوب خوب استعمال ہوئے ہیں۔

بہرحال دارا شکوہ ایک صوفی شاعر تھا۔ اس نے دیگر صوفی شعرا کی طرح حق پرستی وخدا پرستی کی تعلیم دی اور خدا سے قریب ہونے کے طریق سے عوام کو باخبر کیا۔ اس نے اپنی شاعری کے ذریعے صلح کل اور امن عالم کا پیغام سرمدی پیش کیا اور سماجی تانے بانے کو مستحکم کرنے والے صوفیا کے پیغام کو اپنے الفاظ میں سماج کے ہر طبقے تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کی شاعری انسان کی خوشحالی، انسان کی دنیوی واخروی کامیابی، باہمی رواداری اور سماجی ہم آہنگی کا بہترین نمونہ ہے۔

حوالہ جات

1 Dara Shikoh The Man Who Could ,Page 12 Be King, Avik Chanda,2019، 2019، دارا شکوہ: محمود علی صفحہ 33، 1999

2 رسالہ حق نما، صفحہ 1، عادل اسیر دہلوی، مالک بک ڈپو Dara Shukoh The Man Who Would Be King, Avik Chanda , P 35, 2013

3 دارا شکوہ: محمود علی صفحہ 33، 1999

4 Dara Shukoh The Man Who Could Be King,Avik Chanda, Page 14

5 Dara Shukoh The Man Who Could Be King,Avik Chanda, Page 33، دارا شکوہ: محمود علی صفحہ 35، 1999

6 Dara Shukoh The Man Who Could Be King,Avik Chanda, Page 33، دارا شکوہ: محمود علی صفحہ 35-36، 1999

7 The Emperor Who Never Was,Supriya Gandhi, Page 97,2020

8 Dara Shukoh The Man Who Could Be King,Avik Chanda, Page 14

8 دارا شکوہ: محمود علی صفحہ 68-69، 1999

10 The Emperor Who never Was, Supriya Gandhi, Page 155

11 Dara Shukoh,The Man Who Would Be King, Avik Chanda, Page 50-51

12 دارا شکوہ: محمود علی، صفحہ 44-43

13 رسالہ حق نما، مترجم عادل اسیر، ص20، ملک بک ڈپو، 2013

14 رسالہ حق نما، مترجم عادل اسیر، ص20، ملک بک ڈپو، 2013

15 ایضا، ص 11

16 سکینۃ الاولیا، اردو ترجمہ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، ص 245 شیروانی آفسٹ پرنٹرز، دہلی

17 نغمات سماع، سید نوار الحسن مودودی صابری، 278-279، 1935

18 ایضا، ص 191

19 دیوان دارا شکوہ مرتبہ نبی احمد خان، ص 54، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، 1969

20 ایضا، ص 52 — 21 ایضا، ص 107

22 ایضا، ص 51 — 23 ایضا، ص 113

24 ایضا، ص 57 — 25 ایضا، ص 70

26 ایضا، ص 54 — 27 ایضا، ص 66

28 ایضا، ص — 29 ایضا، ص

30 ایضا، ص 109 — 31 ایضا، ص 53

32 ایضا، ص 160 — 33 ایضا، ص 104

34 الأحزاب-72

35 دیوان حافظ مترجم، مولانا قاضی سجاد حسین، ص، 150، سب رنگ کتاب گھر، دہلی

36 دیوان دارا شکوہ مرتبہ احمد نبی خان، ص 91، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، 1969ا

37 ایضا، ص

■

Abdul Wasay
B-37, Block B, Sector 1
Noida- 201301 (UP)
Mob.:9868453380

فیاض احمد

داراشکوہ اور اس کے ہمعصر معروف صوفیا

داراشکوہ کسی ناخواندہ شہزادے کا نام نہیں ہے بلکہ علم ومعرفت کے حوالے سے آل تیمور میں کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔ اس کی تصنیفات اس کے علم وفضل کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ اس کی سب سے مشہور سوانحی تصنیفات سفینۃ الاولیا اور سکینۃ الاولیا اس کی خوش فکری اور سلامتی عقیدہ پر شاہد عدل ہیں، سفینۃ الاولیا جو اس کی پہلی علمی کاوش ہے، اس میں اس نے آنحضرتؐ، خلفائے راشدین اہل بیت اطہار، ازواج مطہرات، ائمہ دین اور اولیائے کاملین کے احوال بیان کیے ہیں اور یہ احوال جامع ومستند ہونے کے ساتھ ساتھ اہل سنت کے عقیدہ وفکر سے پوری طرح مطابق ہیں۔ جن سلسلۂ تصوف کے منتسبین کو اس کتاب میں متعارف کرایا گیا ہے اس میں سلسلہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور کبرویہ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ صوفیہ کا ایسا جامع اور مختصر تذکرہ ہے، جس کی دوسری مثال اسلامی کتب خانے میں نہیں ملتی ہے اور کئی درجن ایسے تابعی اور تبع تابعی وغیرہ صوفیا وصلحا کا ذکر کیا ہے جو کسی سلسلے میں شامل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں سترہ عدد صوفیات عارفات کا بھی تذکرہ شامل ہے۔

سکینۃ الاولیا میں داراشکوہ نے حضرت میاں میر لاہوری، ان کے طریقے اور ان کے خلفا کا ذکر کیا ہے۔ ان کے طریقے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ حضرت سید الطائفہ شیخ جنید قدس اللہ سرہ اور حضرت غوث الثقلین قطب ربانی محبوب سبحانی شاہ عبدالقادر جیلانی کے مطابق شرع شریف کی پیروی کرتے تھے''۔

جو شخص شریعت کی پیروی کو اپنے ممدوح کی مدح کا دارومدار قرار دے رہا ہو، اتباع شریعت اور اس کی دعوت کے لیے معروف حضرت جنید اور شیخ عبدالقادر سے اپنے ممدوح کا مقارنہ کر رہا ہو اس کی بے راہ روی اور اس کے الحاد کے ثبوت کے لیے زیادہ مؤقر دلائل کی ضرورت ہے، اس کے مخالفین کے دعوے اور سرکاری دستاویزیں اس کام کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اسی کتاب کے باب سوم کی ابتدا کرتے ہوئے داراشکوہ رقمطراز ہیں کہ:

''جس طرح حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کے سلسلے کو تمام سلسلوں پر فضیلت ہے، اسی طرح ہمارے شیخ کا طریقہ صلاح، تقوی، زہد، ورع، ترک، تجرید وتفرید، سیر وسلوک، فتوح وکشائش، اوضاع وافعال، اطوار واقوال اور اشغال میں دوسرے مشائخ قادریہ سے مستثنیٰ اور ممتاز ہے۔ ہر امر میں ان کے طریقے کی بنا احادیث صحیحہ اور کلام مجید پر ہے''۔

یہ دعوی بھی محل نظر ہے کہ وہ آخری عمر میں الحاد کا شکار ہوئے، کیونکہ اٹھائیس سال کی عمر میں انھوں نے سکینۃ الاولیا کی تصنیف 1642 میں کی اور 1648 تک اس میں اضافہ کرتے رہے۔ اس کتاب میں اس نام نہاد الحاد کا کوئی اثر نظر نہیں آتا ہے۔ اس کے بعد اسے دس گیارہ سال کی زندگی ملی جس کا بیشتر حصہ جنگ وجدال اور فرار اور تلاش پناہ میں گزرا۔

داراشکوہ کا ایک مطبوعہ دیوان بھی ہے اس میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کے الحاد کی صراحت کرتی ہو، البتہ اس کی غزلیات ورباعی کا ہر شعر وحدت الوجودی فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔

داراشکوہ کی اگلی اہم تصنیف مجمع البحرین ہے جس میں دارا نے اسلام اور ہندوازم کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور دونوں مذاہب کے مشترک عناصر کو تفصیلی طور پر ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کی ابتدا حمد ونعت اور منقبت آل اصحاب سے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی وہ کتاب تھی جس پر علما نے الحاد کا فتوی دیا تھا اور دعوی کیا تھا کہ یہ کتاب اسلام اور ہندو مذہب کو مساوی قرار دینے کی نیت سے لکھی گئی۔ اس کتاب کے بارے میں یہ تاویل بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب برادران وطن کی تالیف قلب اور انھیں اسلام سے قریب کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس سے ملتا جلتا کام بہت سے صوفیا نے کیا ہے۔

داراشکوہ کی ایک اہم تصنیف حسنات العارفین کے نام سے ہے یہ کتاب شطحیات داراشکوہ کے نام سے بھی معروف ہے۔ اس کتاب میں دارا نے صوفیا کی شطحیات یا جذب کے حالات میں کہے گئے اقوال کی شرح اور تفسیر بیان کی ہے۔ کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

''کیونکہ میں سالکوں کی موجودہ کتابوں سے غیر مطمئن رہا ہوں اور کبھی کبھار اپنی بے خودی کی حالت میں

ایسے الفاظ کہہ جاتا ہوں جس میں اعلی سچائیاں ہوتی ہیں، تو بعض بدفطرت اور غیر مخلص لوگ اپنے کھوکھلے علم کی وجہ سے مجھ پر طنز کرتے ہیں، بدعتوں کے حامل ہونے کا الزام لگاتے ہیں...... اس پر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ میں ممتاز اور مقدس ہستیوں کے ان اقوال کو جنھیں شطحیات کہا جاتا ہے، تحریر میں لاؤں تاکہ وہ لوگ بھی قائل ہوسکیں جو حضرت عیسی کے بجائے دجال، حضرت موسی کے بجائے فرعون اور حضرت محمدؐ کے بجائے ابوجہل کا مشرب اختیار کیے ہوئے ہیں۔''

داراشکوہ کے بارے میں سب سے زیادہ ہنگامہ آرائی اس کی کتاب مجمع البحرین اور دارا کے ذریعے کرائے جانے والے سنسکرت کتابوں کے ترجموں کے حوالے سے ہوئی ہے، جب کہ داراشکوہ اس نوعیت کا کام کرنے والا کوئی پہلا شخص نہیں تھا اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی کئی علما وصوفیا نے اس نوعیت کے کام کیے ہیں جن میں ایک بڑا نام میر عبدالواحد بلگرامی کا ہے۔ (1509 - 1608) جن کی وفات دارا کی پیدائش سے صرف سات سال پہلے ہوئی، ان کی ایک تصنیف ہے حقائق ہندی، یہ ایک بے حد دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں تین ابواب ہیں: دھروپد، وشنوپد اور تیسرا سنسکرت کے مختلف ومتفرق اشلوکوں پر مبنی ہے، یہ تمام اشلوک کرشن بھکتی پر مبنی ہیں۔ حضرت بلگرامی نے ان اشلوکوں اور نغمات کی صوفیانہ توجیہ کی ہے اور صوفی فکر وعقیدے کے مطابق ان نغموں کی تفسیر بیان کی ہے بلکہ محفل سماع میں ان اشلوکوں کو پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے، پروفیسر فرانسسکا اورسینی (Francesca Orsini) نے مجلّہ کلچر اینڈ اسرکویشن میں کرشنا مردحق (Krishna is the Truth of Man) کے عنوان سے اس کتاب کا تجزیہ کیا ہے۔

یہ وہی کام ہے جسے دارا نے مجمع البحرین یا اپنے ترجموں میں کرنا چاہا ہے، بلکہ حضرت بلگرامی کا کام دارا کے کام سے بھی آگے کی چیز ہے۔ لیکن شیخ عبدالواحد بلگرامی کی عظمت و رفعت کا آسمان ان کے اس کام سے ذرا بھی غبار آلود نہ ہوا، بلکہ اسے ان کی صوفی فکر کا عکاس قرار دیا گیا۔ ان کے معاصرین ومتاخرین میں سے کسی نے اس کام کے حوالے سے ان پر انگشت نمائی نہیں کی۔

عہد دارا چونکہ عموماً سکون واستقرار کا دور تھا اس لیے اس میں اسلامی علوم وفنون کا بھی فروغ ہوا اور تصوف وسلوک نے بھی خوب ترقی کی۔ عہد دارا میں تصوف کی سب سے بڑی شخصیت حضرت میاں میر لاہوری متوفی 1045ھ/ 1635 کی ہے جن کے سبب سلسلہ قادریہ کو اس عہد میں زبردست عروج حاصل ہوا اور ساتھ ساتھ معتدل اسلام کو بھی تقویت ملی۔ داراشکوہ حضرت سے والہانہ عقیدت رکھتا تھا، جس کا اظہار اس نے سکینۃ الاولیا میں جابجا کیا ہے۔ اس کتاب میں اس نے حضرت میاں میر کی حیات وکرامات اور آپ کے ارشادات کو جمع کیا ہے۔ دارا نے اس کتاب میں ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جو اس عہد کے بدلتے زاویوں کی نشاندہی کرتا ہے، اور اس میں جاری فکری کشاکش کو ظاہر کرتا ہے۔ اس عہد کے سب سے بڑے معقولی عالم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، جو مجددی فکر کے حامل تھے بادشاہ وقت کی رفاقت میں میاں میر سے ملنے آئے حضرت میاں میر خدا تک رسائی کے طریقوں پر گفتگو فرما رہے تھے، اس دوران آپ نے فرمایا کہ جب سالک پر عالم ملکوت منکشف ہوجاتا ہے تو اس کا شیخ اسے جنگل بھیج دیتا ہے تاکہ وہ وہاں یکسوئی سے یاد الٰہی کرسکے، اس کو سن کر علامہ سیالکوٹی نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو اس کی نماز باجماعت ترک ہوجاتی ہے، میاں میر نے اس اعتراض کا مفصل جواب دیا۔ اس اعتراض اور اس کے جواب سے اس عہد کی علمی وفکری صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے، اور اس کشمکش کے وجود کا پتہ چلتا ہے جو عہد دارا میں کمزور تو ہوئی تھی لیکن خاصے آب وتاب کے ساتھ باقی تھی، اور اس اعتراض نے، بقول شیخ اکرام: ''آگے چل کر داراشکوہ اور عالمگیر کی مخالفت کو چمکا دیا''۔

حضرت میاں میر کے اندر خلق خدا کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اور آپ ایک بے حد وسیع المشرب بزرگ تھے۔ داراشکوہ آپ کے فکر وسلوک سے بے حد متاثر تھا۔ حضرت میاں میر خدمت خَلق کا پیکر اور حُسن خُلق کا مجسم نمونہ تھے۔ داراشکوہ نے آپ کے اخلاق عالیہ کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

''ابوجعفر حداد کہتے ہیں: اگر عقل مرد کی صورت میں ہوتی تو جنید کی صورت میں ہوتی۔ اور اگر اخلاق مرد کی صورت میں ہوتا تو حضرت میاں جیو کی صورت میں ہوتا۔''

حضرت میاں میر کے سکھ مذہب کے گروؤں کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات تھے جو آپ کی صلح جوئی کے مسلک کی کھلی دلیل ہیں۔ ''صلح کن با خاص عام'' کے طریقے نے آپ کو ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ جب گرو ارجن داس نے دربار صاحب بنانے کا ارادہ کیا تو اس کی بنیاد ڈالنے کے لیے آپ کو مدعو کیا اور مشہور روایت کے مطابق آپ نے امرتسر کے گرودوارہ (باب شیخ) کی بنیاد ڈالی جو اب گولڈن ٹمپل کے نام سے جانا جاتا ہے۔

عہد دارا کے ایک اور بڑے صوفی ملا بدخشی تھے جن

سے داراشکوہ مرید تھا۔ یہ حضرت میاں میر کے مرید وخلیفہ تھے اور زبردست وجودی صوفی تھے، داراشکوہ سکینۃ الاولیا میں لکھتے ہیں:

''اس فقیر کو ان کی غلامی اور ارادت کی نسبت حاصل ہے آپ کا اسم مبارک شاہ محمد ہے، حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ انھیں محمد شاہ کہتے تھے اور حضرت کے اصحاب ومعتقدین انھیں حضرت اخوند کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔''

آپ کی شخصیت بڑی پرکشش تھی کثرت مجاہدات نے چہرے کو بہت منور بنادیا تھا۔ دوسرے مذاہب کے ہم فکر لوگوں سے اچھے روابط رکھتے تھے، اور ان پر اچھا اثر ڈالتے تھے۔ ان کے ایک شعر ۔

پنجہ با پنجۂ خدادارم   من چہ پروائے مصطفیٰ دارم

پر علمائے کشمیر نے ان کے کفر کا فتوی دیا۔ شاہجہاں ان کے خلاف کارروائی بھی کرنا چاہتا تھا لیکن حضرت میاں میر کے کہنے سے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔

ان کے معتقدین اس شعر کی تاویل کرتے ہیں ان کے خیال میں 'پنجہ با پنجۂ خداادام'، 'یداللہ فوق ایدیہم' کا فارسی ترجمہ ہے۔ اور رؤف ورحیم مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی ظلم وجفا کا ڈر نہیں ہے۔

عہد دارا کی ایک نامور صوفی شخصیت حضرت شیخ عبدالرشید جونپوری متوفی 1083ھ/ 1672 کی بھی ہے۔ یہ مشہور عالم جونپوری عالم، فلسفی، متکلم اور ادیب ملا محمود جونپوری کے معاصر اور رفیق درس تھے اور انھیں کے درجے کے عالم بھی تھے البتہ ان پر تصوف وسلوک کا زیادہ غلبہ تھا۔ درس نظامی میں شامل کتاب مناظرۂ رشید یہ آپ کے مشہور علمی کاموں میں سے ایک ہے۔ محمد صالح لکھتا ہے کہ: آپ

''اہل دنیا سے گریزاں اور ان کی ملاقات سے متنفر ہیں بے نیازی اور استغنا ان کا شیوہ ہے۔ لوگوں سے فتوحات یا نذریں بالکل نہیں لیتے ہیں، اور دنیا والوں سے بالکل نہیں ملتے ہیں۔ ایک بار بادشاہ (شاہجہاں) نے ان سے ملنے کی خواہش کی لیکن وہ زاہد کامل ہرگز اپنے گوشۂ عزلت سے نہ نکلا۔''

عہد دارا کے طبقۂ علما میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے بعد سب سے زیادہ شہرت ملا محمود جونپوری کو حاصل ہوئی۔ یہ علوم عقلیہ اور نقلیہ دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ ہندوستان میں یونانی فلسفے پر سب سے بڑا کام 'الشمس البازغۃ' ان کی یادگار ہے۔ وہ ایک زبردست منطقی، فلسفی اور متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زبردست اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ درحقیقت ملا محمود جونپوری ایک جامع کمالات ہستی تھے۔

ملا محمود جونپوری اور دیوان عبدالرشید کے سبب جونپور ملک کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا۔ صاحبقران شاہجہاں اسے 'شیراز ماست' کہتا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی کا خیال ہے کہ ''علامہ تفتازانی اور سید شریف جرجانی کے بعد اس پائے کے دو علما کبھی اکٹھا نہیں ہوئے۔ عہد دارا کے ایک اور عالی مرتبت عالم دین اور مدرس ملا عبدالسلام لاہوری متوفی 1628 تھے جو مشہور منطقی عالم فتح اللہ شیرازی کے شاگرد تھے، لاہور میں ساٹھ سال تک درس وتدریس کی بساط بچھائے رکھی۔ ان کے شاگردوں میں حضرت محبّ اللہ الہ آبادی اور نابغۂ اودھ عبدالسلام دیوی جیسے عباقرۂ علم تصوف شامل ہیں۔

عہد دارا کی ایک اور صوفی شخصیت جس کے ذکر کے بغیر نہ صرف عہد دارا کے تصوف بلکہ برصغیر ہند و پاک کے تصوف کا تذکرہ نامکمل رہے گا، وہ شخصیت ہے حضرت محبّ اللہ الہ آبادی متوفی 1648 کی۔ آپ ہندوستان میں نظریہ وحدت الوجود کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ سلسلہ چشتیہ سے تعلق تھا، اور شیخ ابوسعید گنگوہی صابری چشتی متوفی 1639 سے بیعت تھے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی متوفی 1240 کی تصانیف نوک زبان پر رہتی تھیں۔ تسویہ کے نام سے فصوص الحکم کی شرح لکھی جو بے حد مشہور اور متنازع فیہ ہوئی۔ داراشکوہ ان سے بڑے نیاز مندانہ تعلقات رکھتا تھا۔ قیام الہ آباد کے دوران اس نے حضرت کی صحبت سے اکتساب فیض بھی کیا۔ اپنے ایک خط میں دارا کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فقیر کجا و نصیحت کجا، حق آنست کہ رفاہیت خلق خدا دامن گیر خاطر حکام باشد، چہ مومن چہ کافر کہ خلق خدا پیدائش خداست۔''

اس عبارت سے ان کے مسلک تصوف کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسے اس تناظر میں دیکھا جائے کہ اس وقت ایک طبقہ غیر مسلم سے امتیازی سلوک کا مطالبہ کررہا تھا۔ عالمگیر کی رائے حضرت کے بارے میں اچھی نہ تھی، اس نے تسویہ کو نذر آتش کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔

سرمد شہید متوفی 1661 بھی عہد دارا کی ایک نمائندہ شخصیت تھی۔ وہ آرمینین یا یہودی اصل تھے، سرمد کے بڑے مقربین میں تھے، اور اس کے ہم مشرب بھی تھے۔ سرمد کو اپنے عہد میں بڑی قبولیت عام حاصل تھی، ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ پورا شاہجہان آباد اس کا معتقد تھا، لہذا محض عریانیت کی بنیاد پر اسے قتل کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ مستوں اور قلندروں سے پوری دہلی بھری تھی اور ان میں سے کئی عریاں رہتے تھے۔

سرمد وحدت الوجودی فکر میں سرشار تھے، لہٰذا فقہا کے لیے ان کے دیوان سے الحادی عناصر کی حصولیابی چنداں مشکل نہ تھی، لیکن جب دربار میں اس کے قتل کا محضر تیار ہورہا تھا تو اورنگزیب نے اس سے پوچھا کہ: کیا تمھیں نے دارا کو نوید سلطنت دی تھی؟ کہا: ہاں! اور وہ نوید پوری طرح سے درست بھی نکلی، اسے ابدی سلطنت حاصل ہوگئی ہے۔ جہاں عالمگیر کے سوال سے قتل کے حقیقی مقصد کا اظہار ہوتا ہے وہیں دارا کے مقام رضا کا بھی پتہ چلتا ہے اور رسم دار و رسن کو از سر نو زندہ کرنے کے اس کے عزم کا بھی سراغ ملتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے درست ہی لکھا ہے کہ:

''ایشیا میں ہمیشہ پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے، اور ہزاروں خونریزیاں جو پولیٹیکل اسباب سے ہوئیں، انھیں مذہب کی چادر اڑھا دی گئی''

داراشکوہ ایک صاحب ذوق صوفی تھا، ممکن ہے کہ اس سے تعبیرات میں کچھ غلطیاں ہوئی ہوں لیکن وہ ایک خوش عقیدہ خوش فکر اور خوش بیان انسان تھا، جس اعلی انسانی اقدار کا وہ حامل تھا اس کی معنویت ہر دور میں رہی ہے اور آج کچھ زیادہ ہے۔ اگر ہندوستاں جنت نشان کا زمام اقتدار اسے مل گیا ہوتا تو اس کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے حیات سرمد میں دارا کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

''سلسلہ مغلیہ میں دارا شکوہ ایک عجیب طبیعت و دماغ کا شخص گزرا ہے، اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیے کہ تاریخ ہند کے قلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا ہے، اس لیے اس کی اصلی تصویر پولیٹکل چالوں میں چھپ گئی، وہ ابتدا سے درویش دوست اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا۔ اور ہمیشہ فقرا اور ارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی بعض تحریرات جو دست و برد زمانہ سے بچ گئی ہیں بتلاتی ہیں کہ ان کا لکھنے والا بھی ذوق وکیفیت سے خالی نہیں تھا''

مفتی غلام سرور لاہوری متوفی 1890 اپنی کتاب خزینۃ الاصفیا میں داراشکوہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''حضرت شاہ ملا بدخشانی کا نامور مرید و خلیفہ، ظاہری و باطنی اوصاف کا جامع، بادشاہ صورت اور درویش سیرت تھے۔ مسائل تصوف وعرفان سے بڑی وابستگی تھی۔ حضرت شیخ محمد میاں میر کی خدمت میں حاضر رہ کر اخذ فیض کیا تھا۔ اپنے مرشد کے نظریہ وحدت الوجود کے زبردست حامی ومبلغ تھے''

■

Fayyaz Ahmad
Rseaarch Scholar, Dept of Persian
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad- 500032 (Telangana)

رسم الخط ہی زبان کی شناخت ہے

امیر نہٹوری

اردو رسائل میں عموماً ان ادبی مباحث اور مسائل پر زیادہ ارتکاز ہوتا ہے جن سے عوام یا معاشرے کا زیادہ گہرا رشتہ نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں ؟

ج: زبانیں قوموں کی فکر کے ساتھ ہی زندہ یا مردہ ہوجاتی ہیں۔وقت کی تبدیلی کا اثر قبول کرنے والی قومیں جدید تہذیب وتمدن اورنئی زبان کواپنانے لگتی ہیں یاوقت ان پر نئے اطوار، نئی زبانیں مسلط کردیتا ہے،جس بناپرقومیں اپنی اصل زبانوں کوفراموش کردیتی ہیں اورزبانوں کی موت ہوجاتی ہے۔

س: زبانوں کوزندہ رکھنے کے لیےکون ساطریقہ اختیارکیا جاناچاہیے ؟

ج: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے درس وتدریس لازمی ہے۔اس کے علاوہ وقت کے ساتھ ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کے مدنظر نئے ٹیکنیکل طریقے اپناکرزبانوں کامعیار بلند کیا جانا چاہیے۔زبانوں کی پہچان ان کے رسم الخط پر منحصر ہوتی ہے اس لیے زبانوں کوزندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے روز مرہ کے معاملات میں زبانوں کے رسم الخط کا استعمال کیا جائے۔ نیز ثقافتی، ادبی، معاشی، تجارتی و دیگرفنون لطیفہ کی تقریبات کے دعوت نامے بینرز، اشتہار،نام کی تختیاں، سائن بورڈ وغیرہ اپنے رسم الخط میں ضرور ہونے چاہیے۔کوئی زبان محض بول چال کی حدتک زندہ نہیں رہ سکتی اس کواس کی تحریر کے ذریعے ہی زندہ رکھا جاسکتا ہے۔جن قوموں کو اپنی زبان زندہ رکھنی ہے انھیں چاہیے کہ عالمی،ملکی اور ریاستی سطح پر ایسے اجلاس و تقاریب کا انعقاد کیا جائے جہاں زبانوں کی اہمیت واضح ہو۔ زبانوں کی درس و تدریس کے لیے مراکز قائم کیے جانے چاہیے۔اردو زبان کے حوالے سےافسوسناک پہلو یہ ہے کہ جہاں اردو والے ہیں وہاں اردو کی تعلیم کا معقول انتظام نہ ہونے کی صورت میں نسل نو کثیر تعداد میں اردو زبان سے محروم ہو رہی ہے۔ایسے میں ضروری ہے کہ ان علاقوں کے اسکول کالجز کے ذمے داروں سے مل کر اردو کی تعلیم کا معقول انتظام کرانے پر زوردیا جائے۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسارشتہ ہے ؟

ج : زبان کا تہذیب وثقافت سے گہرا رشتہ ہے۔ہمیں کسی ملک یاکسی قوم کی تہذیب کے پس منظرکوپڑھناوسمجھنا ہےتو اس ملک اورقوم کی مکمل معلومات کے لیے ان کی زبان میں لکھی گئی تاریخی،ادبی کتابیں یادیگرزبانوں میں ترجمہ کردہ کتابیں پڑھ کر ہی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔اس سے واضح ہے کہ زبان اورتہذیب کا رشتہ کتنا مربوط ومضبوط ہے۔تاریخی کتب کا مطالعہ باور کراتا ہے کہ زبان تہذیب وثقافت لازم وملزوم ہیں۔مثال کے طور پرعرب کی زبان 'عربی' ہے۔وہاں کا کلچر،عربوں کی تہذیب وثقافت اور وہاں کے رسم و رواج،کھان پان کا تذکرہ عربی زبان کی کتابوں میں ہی بہ آسانی مل سکتا ہے۔اسی طرح اردو، ہند آریائی زبان ہے۔اس میں ہندوستانی تہذیب کامکمل تذکرہ ملتا ہے۔لہٰذا ہندوستانی تہذیب کو جاننے کے لیے یہاں کی زبانوں سے آشنائی ضروری ہے،جس میں اردوزبان خصوصی طور پرشامل ہے۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کامسئلہ بھی جڑاہواہے ؟

ج: جی ہاں...! زبانوں کی موت قوموں اوران کی وراثت کی موت کے مساوی ہے۔جب کوئی زبان زوال پزیر ہوتی ہےتو اس زبان سے تعلق رکھنے والی قوم کا تمام ورثہ یاوہ ادب جوانسانی تہذیب کامظہرہوتاہے،بھی ضائع ہوجاتا ہے۔

س: کیاکسی زبان میں خواندگی،سائنسی،سماجی موادکی کمی سے زبان پرمنفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج : یہ کھلی حقیقت ہے کہ جس زبان میں شرح خواندگی جتنی زیادہ ہوگی وہ اتنی ہی ترقی کرے گی۔زبان کی ترقی کے لیےضروری ہے کہ ہرقسم کے علوم کا ذخیرہ اس میں وافرمقدارمیں موجودہو۔بالخصوص سائنسی،سماجی علوم پرمبنی ذخیرے کا ہونا لازمی ہے۔کسی زبان میں ان علوم کی کمی شرح خواندگی پراثر انداز ہوگی کیونکہ جب اس زبان میں سائنسی اورسماجی علوم کا موادنہیں ہوگا تو طالب علم چاہ کر بھی اس زبان میں تعلیم حاصل نہیں کرسکیں گے اورنتیجہ یہ کہ شرح خواندگی میں کمی ہوجائے گی جس کے سبب زبان کےفروغ میں منفی اثرات غالب ہوجائیں گے۔

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کوکس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج : موجودہ عہد'اردو' کے لیے بہت سےخطرات کی نشاندہی کرتا نظرآرہاہے۔اردوزبان کےفروغ میں شعروسخن کے حوالے سےشعرااہم رول اداکرسکتے ہیں۔مگرافسوس آج کل

کے شعرا کی کثیر تعداد اردو رسم الخط سے بے بہرہ ہو چکی ہے یا پھر اردو رسم الخط کا استعمال غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں اس بنا پر ادبی محفلوں کے بینرز، اشتہار اور دعوت ناموں سے اردو رسم الخط غائب ہونے لگا ہے اور اردو زبان کی شناخت مسخ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ اردو کے لیے نقصان دہ ہے کیونکہ اردو کی شکل بگڑ رہی ہے۔ یہ حالات اردو کے تئیں مناسب نہیں۔ نیز یہ کہ نسل نو بڑی تعداد میں ہندی میڈیم یا انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھ رہی ہے جہاں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا اور اردو گھرانے کے بچے اردو زبان سیکھنے سے محروم ہو رہے ہیں۔ اردو والوں کے لیے روزگار سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اردو کی ترقی اور بقا کے لیے ضروری ہے کہ اردو زبان کو روزگار سے وابستہ کیا جائے۔ اردو میں روزگار کی عدم موجودگی اس کی بقا اور ترقی کے راستے میں بڑا خطرہ ہے۔ اسی لیے طالب علم اردو کی تعلیم کو غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: عہد حاضر کے اردو اساتذہ، شعرا، ادبا اور محبان اردو کی کسمپرسی، بے نیازی، لاپرواہی اور احساس کمتری کے چلتے اردو دن بہ دن زوال پزیر ہے۔ ہندوستان کے وہ صوبے جو اردو کے دبستان کہلاتے تھے آج ان دبستانوں میں اردو کا کوئی پرسان حال نہیں صوبہ اتر پردیش جس کی دوسری سرکاری زبان اردو ہے مگر یہاں بھی اس کا برا حال ہے۔ اس ریاست میں سرکاری پرائمری اسکولوں میں بڑی تعداد میں اردو اساتذہ موجود ہیں اور یہاں ہزاروں کی تعداد میں دینی مدارس بھی۔ مگر نوے فیصد اردو اساتذہ اردو زبان کو چھوڑ کر دیگر سبھی مضامین پڑھانے میں مست ہیں، وہ خود کو اردو اساتذہ کہلانا بھی توہین سمجھتے ہیں۔ اردو گھرانوں کے بچے بڑی تعداد میں ہندی اور انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں اور اردو زبان سے انجان ہوتے جا رہے ہیں۔ کہیں اردو پڑھانے والے ناپید ہیں تو کہیں اردو پڑھنے والے طلبہ میسر نہیں۔

اردو ادبا و محبان اردو بھی آج کل اردو جرائد، رسائل، اور خبر نامے وغیرہ خریدنے سے گریز کرنے لگے ہیں نتیجہ یہ کہ بہت سے اردو کے معیاری، قیمتی شمارے بند ہو گئے یا بند ہونے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں اردو کا مستقبل کیا ہوگا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

ج: زبان کو درست رکھنے کے لیے اس کے تلفظ اور رسم الخط سے واقفیت ضروری ہے جو عام طور پر رومن میں شاعری کرنے والے شعرا کو قاتل، قمر، غزل، ظہیر، شاہد، ضمیر، زاہد وغیرہ سیکڑوں اردو الفاظ کو کاتل، کمر، جہیر، ساہد، جمیر، جاہد لکھنے لگے ہیں اور اردو سے نابلد عوام بھی زبان کے بگڑے ہوئے تلفظ کو ہی بولنے اور لکھنے لگی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ زبان کے حروفی مخرج کو سمجھنے پر زور دیا جائے۔ اردو زبان کے رسم الخط کو اپنے پیغامات میں دیگر دوسری زبانوں کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ اردو کا املا خاص طور پر تلفظ کی ادائیگی پر توجہ دینی چاہیے۔ وقت کی تبدیلی کو روکنا مشکل ہے مگر اس تبدیلی سے ہم بہت کچھ حاصل بھی کر سکتے ہیں۔ آج کل سوشل میڈیا کے ذریعے اردو کلاسز شروع ہو رہی ہیں، مزید ان کلاسوں کا اہتمام ہونا چاہیے۔ تا کہ ہندی انگلش پڑھنے والے طلبہ گھر بیٹھے بہ آسانی اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا سیکھ لیں۔ نیز سوشل میڈیا پر اردو لفظ کو غلط لکھنے والوں کی اصلاح ان کے ذاتی انباکس کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ اسکول کالجز میں اردو کے اچھے استاد مامور کرنے چاہیے تا کہ بنیادی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ املا، تلفظ اور قرأت سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ بچوں کو اردو رسائل، خبر نامے، ان کے ذوق کے مطابق عمدہ نظمیں پڑھنے اور خوشخطی کا مقابلہ کرا کر ہونہار اور اچھے طلبہ کو انعام و اکرام دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہنا ضروری ہے۔ اردو کے ماہر استاد کو سوشل میڈیا پر بچوں اور اردو والوں سے روبرو زبان کے تعلق سے سوال جواب کا سلسلہ جاری کرنا چاہیے اس سے طلبہ کے ساتھ پروگرام کو دیگر دیکھنے و سننے والوں کو بھی زبان سے دلچسپی پیدا ہوگی نیز اردو زبان سے نابلد لوگ بھی اردو زبان سے متعارف ہونے لگیں گے اس طرح اردو زبان کی بگڑتی حالت کو کسی حد تک درست کیا جا سکتا ہے۔

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: میرے خیال میں کلاسیکیت یا جدیدیت وغیرہ پر گفتگو کرنے سے قبل ہمیں اردو زبان کے فروغ پر گفتگو کرنی چاہیے۔ یہ ایک بڑا موضوع ضرور ہے مگر اردو کے فروغ میں اہمیت کا حامل نہیں۔ موجودہ عہد میں کلاسیکیت اور جدیدیت پر گفتگو اردو زبان کی زبوں حالی میں درست نہیں۔ اردو زبان کے فروغ میں زبان کی باریکیوں اور بنیادی مسائل پر بحث و مباحثوں کی ضرورت ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: چونکہ میرا تعلق اتر پردیش صوبے کے ضلع بجنور سے ہے۔ یہاں کسی زمانے میں سرکاری و غیر سرکاری بہت سے اردو میڈیم اسکول ہوا کرتے تھے۔ آج بھی کم و بیش سو اردو میڈیم اسکول ہیں۔ جبکہ مدارس کی تعداد کافی ہے جہاں اردو کی تعلیم خصوصی طور پر دی جاتی ہے اور کم و بیش اتنے ہی اردو اساتذہ ہیں۔ سرکاری پریشد اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تعداد ایک سو پچاس سے زائد ہے۔ مگر اردو کے تئیں ان اردو اساتذہ کا رویہ بے نیازانہ ہے جس کے چلتے اردو کی تعلیم تشویشناک حالات سے گزر رہی ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات آتے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں باقائدہ کوئی عوامی بڑی لائبریری نہیں ہے یہاں کے اسکول کالجز وغیرہ میں لائبریریز ضرور ہیں۔ جہاں کورس سے وابستہ ہندی انگریزی کی کتابیں دستیاب ہیں جب کہ اردو کتابیں کسی ایک دو کالج میں ہی ہو سکتی ہیں۔ ان لائبریریز میں ہندی اور انگریزی کے ہی خبر نامے، رسائل و جرائد آتے ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے حوالے سے کام کر رہے ہیں؟

ج: ہمارے ضلع کے ہر قصبے میں اردو کے نام پر مختلف انجمنیں، تنظیمیں اور ادارے ہیں جو اردو کے فروغ کے نام پر مشاعرے، ادبی محفلیں منعقد کراتے ہیں یا شعری ادبی مجموعات کی رسم اجرا کرا کر بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں یہاں زبان سے زیادہ ادب کی اشاعت اور فروغ پر کام ہو رہا ہے۔ اردو زبان کے فروغ کے حوالے سے ان کی کارکردگی قابل افسوس ہے۔ البتہ مدارس میں اردو کی ترویج اور تعلیم کا معقول انتظام دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں؟

ج: اردو کے تعلق سے ضلع بجنور دور قدیم سے ہی ایک زرخیز علاقہ رہا ہے۔ یہاں سجاد حیدر یلدرم، قرۃ العین حیدر، اکبر شاد خان، ڈاکٹر عبدالرحمان، اختر الایمان، قائم چاند پوری وغیرہ مشہور شخصیات نے اردو ادب میں اپنی گرانقدر خدمات انجام دیں اور بین الاقوامی شہرتیں حاصل کی۔ موجودہ عہد میں بھی بہت سی شخصیات نے قومی سطح پر اپنی پہچان بنائی ہے مگر ابھی کچھ شخصیات ایسی ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی سطح پر تو ہوا لیکن قومی سطح پر نہیں ہو سکا۔

س: آپ مقامی سطح پر فروغ اردو کے لیے کیا کوشش کر رہے ہیں؟

ج: میں پریشد کے سرکاری اسکول میں بہ حیثیت اردو ٹیچر فائز ہوں۔ نیز انجمن ترقی اردو شاخ ضلع بجنور، اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن اتر پردیش سے بھی وابستہ ہوں اور اردو زبان کی ترقی و فروغ کے سلسلے میں ہمہ وقت جہد کرتا رہتا ہوں۔ اردو رسم الخط کی بقا کے لیے سوشل میڈیا پر رومن میں لکھنے والے شعرا، ادبا اور تمام اردو والوں سے" اپنے پیغامات اردو رسم الخط میں بھی لکھنے کی تاکید کرتا رہتا

ہوں تا کہ یہ پیاری زبان اپنی پہچان کے ساتھ زندہ رہ سکے۔اردو آپ سے اپنا حق چاہتی ہے۔حق تلفی سے گریز کریں'' لکھ کر اپیل کرتا رہتا ہوں جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔اس کے علاوہ ملک گیر سطح پر ہونے والی 'مردم شماری' کے دستاویز اور اسکول ایڈمیشن و ٹی سی فارم میں مادری زبان کے کالم میں اردو گھرانوں کے طلبہ کی مادری زبان اردو کا اندراج کرانے کے لیے خبر ناموں،سوشل میڈیا عام مقامات پر اشتہار فلیکسی بینرز لگا کر اردو والوں کو وقت وقت پر متوجہ کراتا رہتا ہوں کہ سرکاری دستاویز میں اپنی 'مادری زبان اردو' ہی لکھوائیں۔ نیز اردو سمینار، شعری محفلیں اور اردو رسم الخط کی بقا کے سلسلے میں ادبی اجلاس بھی کراتا ہوں۔کس کالج یا یونیورسٹی میں اردو کے کون کون سے کورس ہیں سوشل میڈیا کے ذریعے اردو طلبہ کو مطلع کرتا رہتا ہوں۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں ؟

ج: اردو ایک شیریں زبان ہے۔عام انسان بھی اس زبان سے لطف اندوز ہوتا ہے اس کے فروغ کے سلسلے میں درج ذیل تجاویز پر عمل ہونا چاہیے۔

* پریشد کے اسکولوں میں مامور اردو اساتذہ کو اردو پڑھانے پر زور دیا جائے۔
* اردو علاقوں میں اردو کوچنگ سینٹر قائم کر کے ہندی انگلش میڈیم کے طلبہ کو اردو پڑھانے کا معقول انتظام کیا جائے۔
* اپنے اپنے علاقوں میں چل رہے اسکول کالجز کے منتظمین سے رابطہ کر کے وہاں اردو زبان کی تعلیم کے لیے کوششیں کی جائیں۔
* سوشل میڈیا پر محبان اردو کو اپنے پیغامات،اپنے اقوال اور اپنا کلام اردو رسم الخط میں بھی لکھنا چاہیے۔ تا کہ اردو کی شناخت باقی رہے۔
* نئی ٹیکنالوجی سے بھر پور فیض حاصل کرنے کے لیے یوٹیوب اور وہاٹس ایپ وغیرہ پر آن لائن اردو کلاسز شروع کی جائیں تا کہ زیادہ سے زیادہ بچوں کو اردو زبان سے آراستہ کیا جا سکے۔
* محبان اردو کو اپنے روز مرّہ کے معاملات اور گفتگو میں اردو الفاظ کا بہ کثرت استعمال کرنا چاہیے۔
* محبان اردو کو چاہیے کہ ادبی، ثقافتی،تجارتی، معاشی یا معاملاتی تقاریب کے دعوت نامے،اشتہار، بینرز و دوکان کے سائن بورڈ اور مکانوں کے نام کی تختیاں اردو رسم الخط میں بھی لکھوئیں۔
* اردو طلبہ کو اردو خوشخطی، مکالمہ آرائی یا مضمون نگاری کے مقابلے کرا کر طلبہ کو انعام و اکرام سے نوازیں اور حوصلہ افزائی کی جائے تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اردو زبان کے جانب راغب ہوں۔
* غربت و افلاس کی زندگی گزارنے والے اردو طلبہ کی مکمل طور پر مدد اور ہر قدم رہنمائی کی جائے۔
* غریب شعرا، ادبا کی عمدہ تخلیقات شائع کرانے میں پوری معاونت کرنی چاہیے۔
* محبان اردو کے ساتھ غیر اردو والوں کو تعلیمی مذاکرے، سمینار اور ادبی محفلوں میں لازمی طور مدعو کیا جائے تا کہ وہ اردو زبان کی لطافتوں سے آشنا ہوں۔

ہم اگر ان چند امور پر سنجیدہ مزاجی کے ساتھ عمل پیرا ہو جائیں تو وہ دن دور نہیں جب اردو زبان اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لے گی۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

ج : اردو رسم الخط کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ہم روزمرہ کے تحریری معاملات میں اردو رسم الخط کو لازمی طور پر شامل کریں یعنی مشاعرے،ادبی سمینار، اور دیگر سبھی تقریبات کے دعوت ناموں میں اردو رسم الخط کو شامل کیا جائے۔ اردو الفاظ کے تلفظ اور املا پر خصوصی توجہ دی جائے۔طالب علم کو اردو الفاظ کا تلفظ۔لفظوں کا مخرج اور املا میں مہارت پیدا کرانی چاہیے۔معیاری اساتذہ کے ذریعے اردو زبان کی تدریس کا معقول انتظام ہر جگہ کیا جانا چاہئے۔سوشل میڈیا پر رومن میں لکھنے والے شعرا و ادبا کو اردو رسم الخط میں بھی لکھنے کے لیے متوجہ کراتے رہنا چاہیے۔اردو تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا رسم الخط زندہ رکھا جائے اس کے لیے رسم الخط کا استعمال ضروری ہے۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: اردو واحد ایسی زبان ہے جو ملک گیر سطح پر بولی و سمجھی جاتی ہے۔اس لیے علاقائی زبانوں کے ذریعے اردو زبان کو سمجھنا نہایت آسان ہے مثال کے طور پر ہم جس علاقے میں رہ رہے ہیں یہاں اکثریت ہندی زبان والوں کی ہے مگر عام بول چال میں اردو الفاظ کا ہی استعمال ہوتا ہے جسے سب آسانی سے بولتے اور سمجھتے ہیں۔مثالاً کھانا، پانی، دن، رات، خاموشی، گفتگو، بات چیت، چاند سورج، ستارے، پہاڑ، دریا،سمندر، کاغذ،قلم وغیرہ اردو الفاظ ہی بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں اردو زبان بہ کثرت بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: الحمدللہ میرے گھر میں اردو بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔میں ادنی سا ایک ادیب،شاعر اور اردو ٹیچر ہوں نیز اردو انجمنوں سے بھی وابستہ ہوں۔تین شعری مجموعے اور ایک نثری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔بچے بھی اردو کی جانب راغب ہو رہے ہیں۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج : جی ان شاءاللہ

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے ؟

ج: ہمارے یہاں یونیورسٹیز تو نہیں ہیں البتہ (287) انٹر کالج ہیں جن میں کم و بیش سو انٹر کالج میں اردو پڑھنے کی سہولت ہے جب کہ 35 ڈگری کالج میں دس ڈگری کالج میں ہی اردو طلبہ برائے نام اردو پڑھ رہے ہیں۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح مدد لی جاسکتی ہے؟

ج: چونکہ ٹیکنا لوجی کا دور ہے۔عوام پرنٹ میڈیا کے بالمقابل الیکٹرانک میڈیا سے زیادہ وابستہ ہے۔ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیمیں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے اگر چاہیں تو ٹی وی چینلز قائم کر کے ملکی و غیر ملکی ادبا، شعرا، صحافی اور اردو کی معتبر شخصیات کو جوڑ کر اردو خبروں، ادبی پروگرام اور مشاعروں کا انعقاد و دیگر صحافتی، معلوماتی، ثقافتی، سماجی پروگرام نشر کیے جائیں۔بالخصوص بچوں کے لیے اردو الفاظ، اردو مکالموں پر مبنی کارٹون، ڈرامے، نظمیں اور مزاحیہ دلچسپ پروگرام بھی نشر کیے جائیں تا کہ مرد، خواتین اور بچے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اردو زبان سے لطف اندوز ہوں۔اگر ایسا کیا جائے تو یقیناً اردو کی ترویج و ترقی میں ایک انقلاب آجائے گا، کیونکہ اردو زبان کی شیرینی سب کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔اسی سبب تمام ٹی وی چینلز پر نشر ہونے والے ڈرامے و دیگر پروگرام اردو الفاظ کی بدولت ہی پسند کیے جاتے ہیں مگر افسوس ان سب چینلز پر نشر ہونے والے پروگرامز کو ہندی سماچار ہندی ڈرامے ہی کہا جاتا ہے۔ جب کہ اردو یوٹیوب یا ٹی وی چینلز اردو کو اس کی شناخت کرانے میں سنگ میل ثابت ہوں گے۔

س: سینٹرل اسکول اور نودیالیہ میں اردو تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ج: جی نہیں۔سینٹرل اسکول اور نودیالیہ میں اردو تعلیم کا کوئی تسلی بخش انتظام نہیں ہے۔

■

Ameer Nehtauri
Rehmat Colony, Khatriyan (B-13)
Bijnor- 246701 (UP)
Cell. No: 9897026992
Email.: ameernehtauri@yahoo.com

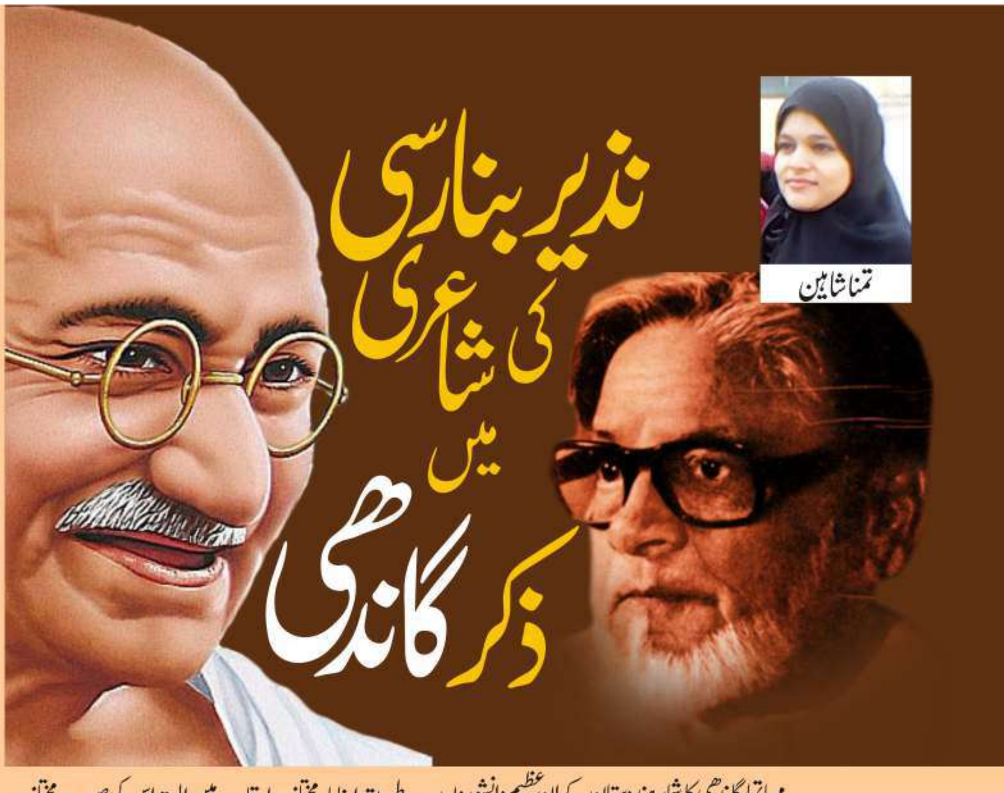

تمنا شاہین

نذیر بنارسی کی شاعری میں ذکر گاندھی

مہاتما گاندھی کا شمار ہندوستان کے ان عظیم دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں میں ہوتا ہے جنھوں نے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ دراصل موہن داس کرم چند گاندھی غلام ہندوستان میں پیدا ہوئے انھوں نے انگریزوں کے مظالم اور جبر و استبداد کو بڑے قریب سے دیکھا۔ ہر لمحہ دم توڑتی انسانیت اور معصوم ہندوستانیوں کی شکست نے ان کے حساس دل ودماغ کو بری طرح متاثر کیا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں انھوں عجلت پسندی سے کام نہ لے کر ہندوستانیوں کی ابتری کا بہ غور جائزہ لیا اور اپنے افکار و نظریات کی وسعت وہمہ گیریت کی بدولت ہندوستانی عوام کو ایسے انقلاب کی دعوت دی جس کی بنیاد سچائی اور اہنسا پر رکھی گئی تھی۔ وہ ایک دور اندیش شخص تھے اور اس بات سے بہ خوبی واقف تھے کہ انقلابی مہم کے ابتدائی دور میں انھیں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن انھیں اپنی ہمت اور حوصلے پر یقین کامل تھا اسی لیے لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ انھوں نے معاشرے میں پھیلی نابرابری اور ناانصافی کے تدارک کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان سے متاثر ہو کر بڑی تعداد میں لوگ ان کی جماعت میں شامل ہوگئے۔ ان کی رہنمائی میں جو تحریکیں چلیں ان میں لاکھوں انسان قید ہوئے اور سیکڑوں نے اپنی جانیں بھی قربان کیں لیکن اپنے قدم پیچھے نہ کیے کیونکہ انھیں گاندھی جی کے طریقۂ کار سے کوئی اختلاف نہیں تھا بلکہ انھیں پختہ یقین تھا کہ وہ جلد ہی اپنے عظیم مقصد میں کامیابی حاصل کریں گے۔ یو۔ آر۔ راؤ۔ نے اپنی کتاب 'ایسے تھے گاندھی' میں ان کے طریقۂ کار پر کچھ یوں روشنی ڈالی ہے:

''باپو نے ملک کو آزادی دلانے کے لیے ستیہ گرہ کا طریقہ اپنایا۔ مختلف اوقات میں البتہ اس کی صورت مختلف رہی 21-1920 میں برطانوی سرکار اور اس کے مختلف اداروں سے عدم تعاون، 32-1930 میں نمک ستیہ گرہ یا نمک سے متعلق قوانین کی سول نافرمانی، 42-1940 میں جنگ کے خلاف انفرادی ستیہ گرہ اور ہندوستان چھوڑ دو جو برطانوی راج کے خاتمے کے لیے ملک بھر میں چلائی گئی، 'کرو یا مرو' کی پُر امن تحریک شاید اس سلسلے کی آخری کڑی ہوتی لیکن 19 اگست 1942 کو گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا۔ جب باپو جیل میں نظر بند نہ ہوتے یا جب وہ ستیہ گرہ کی تحریکوں میں سرگرمی سے شریک نہ ہوتے تب وہ اپنی ساری توجہ اپنے تعمیری پروگرام پر صرف کیا کرتے تھے۔ ان کے تعمیری پروگرام میں سودیشی کا چلن، چھوت چھات کا خاتمہ، ہریجنوں کا سدھار، فرقہ ورانہ ہم آہنگی، نشہ بندی، بنیادی تعلیم، دیہی صنعتوں کی تجدید اور گرام سوراج جیسی اصلاحیں اور اہم سرگرمیاں شامل رہتی تھیں۔''

(ایسے تھے گاندھی: یو آر راؤ، پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند 1969، ص 4-3)

مہاتما گاندھی نے قید و بند کی صعوبتوں کے علاوہ بے شمار اذیتیں بھی برداشت کیں لیکن انھیں غلامی کی موت گوارا نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے آزادی کی جدوجہد میں اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ ان کی زندگی میں بعض ایسے مواقع بھی آئے جب ان کی خودداری، غیرت و حمیت اور عزت نفس کو پامال کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ اس وقت بھی انھوں نے ستیہ گرہ اور اہنسا کا راستہ نہ چھوڑا، بلکہ نفرت، بے رحمی اور خوں ریزی کا جواب دوستی، صلح اور امن و امان سے دیا۔ وہ ہمیشہ ملک و قوم کی فکر میں مبتلا رہے۔ انھوں نے اپنی دور اندیشی سے ہندوستانی عوام کو نہ صرف آنے والے خطرات سے آگاہ کیا بلکہ ان سے نبرد آزمائی کے طریقے بھی بتائے۔ حقوق انسانی کی پاسداری، طبقاتی کشمکش مٹانے اور بے اختیار لوگوں کو با اختیار بنانے کے لیے انھوں نے زبانی دعوے کرنے کے بجائے عملی اقدام اٹھائے۔ پس ماندہ طبقے کے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر معاشرے میں ان کو عزت دلائی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ سماج میں تبدیلی لانے کے لیے پہلے خود کو بدلنا ہوگا۔ اسی لیے انھوں نے اپنی سادگی، شرافت، سچائی اور منکسر المزاجی سے اپنے طور پر لوگوں کو بیدار کرنا شروع کیا۔

مہاتما گاندھی نے عوام و خواص کے ساتھ ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں پر بھی اپنی شخصیت کی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ بعض قلم کاروں نے ان کی زندگی میں ہی ان کی عظمت کا اعتراف کیا۔ ان کی صداقت، رحم دلی، عاجزی وانکساری کے ساتھ ہمت، بہادری اور جواں مردی کے نغمے گائے۔ جب کہ بعضوں نے ان کی وفات کے بعد اپنی تخلیقات کے وسیلے سے ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ دراصل مہاتما گاندھی کا قتل ہندوستانی تاریخ کا ایسا سانحہ ہے جس نے ہندوستانی عوام میں لرزہ طاری کر دیا۔ اپنے محسن، مشفق اور سچے رہنما کی موت ان کے لیے ناقابل یقین تھی۔ ان کے سانحۂ ارتحال پر ہندوستان کی تمام ادبیات میں ان کی شخصیت اور کارناموں پر متواتر تحریریں منظر عام پر آنے لگیں۔ اردو شعرا نے بھی ان کی شخصیت کے منظوم خاکے تحریر کیے جن میں مجاز، جگر، آنند نرائن ملا، بسمل الہ آبادی، نشور واحدی، شمیم کرہانی، نازش پرتاپ گڑھی اور نذیر بنارسی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

نذیر بنارسی قومی یکجہتی اور وطن دوستی کے شاعر تھے۔ ہندوستان کی مٹی سے ان کو گہری محبت تھی جس کا والہانہ اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب وثقافت، تیج تہوار، میلے ٹھیلے، رسم ورواج اور آپسی بھائی چارے کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ پیارا ہندوستان، پیام وطن، عید، ہولی، دیوالی، بسنت پنچمی، رام نومی، جنم اشٹمی، 15 اگست اور 26 جنوری جیسی نظموں میں مادر وطن سے ان کی عقیدت ومحبت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ان کی نظموں کا غالب حصہ قومی مسائل سے متعلق ہے۔ 'کلیات نذیر' کا بہ غور مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری حب الوطنی کے سطحی اظہار سے بلند ہے کیونکہ ان کی بیشتر نظمیں ان کے جذبات واحساسات اور اس عقیدت واحترام کا ثبوت فراہم کرتی ہیں جو ان کو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب سے تھا۔ نذیر بنارسی کو مجاہدین آزادی سے خاص رغبت وانسیت تھی ان کی قربانیوں کو انھوں نے فنی جمالیات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں

نے گاندھی جی کی شان میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔ان کومہاتما گاندھی سے قلبی لگاؤ تھا۔وہ ان کے نظریے کی تائید کرتے تھے نذیر کو معلوم تھا کہ جو کام جذبات و احساسات کی بدولت ہوسکتا ہے وہ تلوار کبھی نہیں کرسکتی اس لیے وہ گاندھی جی کو اپنا رہبر و رہنما تسلیم کرتے تھے۔انھیں یقین تھا کہ مہاتما گاندھی کی قیادت میں جلد ہی ہندوستانیوں کو ان کا کھویا ہوا وقار واپس مل جائے گا اور وہ آزاد فضا میں سانس لے سکیں گے۔گاندھی جی کی موت نے ان کے بے شمار مداحوں کی طرح نذیر کو بھی اشک بار کیا۔ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی نذیر پر رقت کی کیفیت طاری ہوگئی اور ایک قلم برداشتہ نظم 'آہ گاندھی' وجود میں آئی۔نظم کے درج ذیل بند سے نذیر کی عقیدت ومحبت، افسوس اور رنج وغم کی ملی جلی کیفیت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ترے ماتم میں شامل ہیں زمین و آسماں والے
اہنسا کے پجاری سوگ میں ہیں دو جہاں والے
اسی کو مار ڈالا جس نے سر اونچا کیا سب کا
نہ کیوں غیرت سے سر نیچا کریں ہندوستاں والے
مرے گاندھی زمیں والوں نے تیری قدر جب کم کی
اٹھا کر لے گئے تجھ کو زمیں سے آسماں والے
سنے گا اے نذیر اب کون مظلوموں کی فریادیں
فغاں لے کر کہاں جائیں گے اب آہ وفغاں والے

(کلیات نذیر بنارسی: مرتب ناظر حسین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2014، ص 39)

نذیر بنارسی نے مہاتما گاندھی کی حق پرستی، سچائی، امن و آشتی اور ہندوستانیوں کے لیے ان کی جاں نثاری کی عمدہ تصویر کشی کی ہے انھوں نے عشق گاندھی کے جذبے سے لبریز ہوکر ان کو مختلف تشبیہات واستعارات کے ذریعے الگ الگ خطاب دیے ہیں ان کی عقیدت، خلوص اور محبت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے گاندھی جی کو 'امن کا دیوتا' بنادیا۔اس نظم سے ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

روشنی دے کے ہمیں روشنی والا نہ رہا
شانتی کیسے ملے شانتی والا نہ رہا
چلتا پھرتا وہ محبت کا شوالا نہ رہا
وہی گوکل ہے مگر بانسری والا نہ رہا
اب نہیں پوری ملاقات تو آدھی ہی سہی
آج باپو نہیں باپو کی سمادھی ہی سہی

(ایضاً ص 53)

نذیر کی نظروں میں مہاتما گاندھی امن کے دیوتا بھی تھے اور اہنسا کے پجاری بھی۔سچائی کے علم بردار بھی تھے اور خلوص ومحبت کے پیروکار بھی۔ان کا یہ ماننا تھا کہ مہاتما گاندھی ایک باغبان کی طرح ملک وقوم کے تحفظ اور بقا کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔جس طرح مالی اپنے باغ کو خون جگر سے سینچتا ہے، اسے اپنے تمام پھولوں اور پتیوں سے بے انتہا لگاؤ ہوتا ہے اسی طرح مہاتما گاندھی کو بھی اپنے وطن کے نونہالوں، نوجوانوں اور بزرگوں سے اٹوٹ محبت تھی وہ جب تک زندہ رہے، قوم کی فلاح وبہبود کے لیے کوشاں رہے۔انھوں نے ہندوستانی عوام کو ان کے مسائل ومصائب، مایوسی، ناکامی و نامرادی سے نکال کر خود اعتمادی اور جرأت بخشی۔ان کی وفات کے بعد ان کے چاہنے والے ان کی تحریروں سے استفادہ کرکے اپنے مسائل حل کرتے ہیں۔مہاتما گاندھی بھلے ہی ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی باتیں، ان کی تحریریں آج بھی ان ہندوستانیوں کے لیے مشعل راہ ہیں جو محنت، ایمان داری، نیکی، سچائی اور امن و آشتی کے بل بوتے کامیاب ہوکر اپنی شناخت قائم کرنا چاہتے ہیں۔دراصل نذیر بنارسی کی نظموں میں اتنی وسعت اور اثر آفرینی ہے کہ وہ نئی نسل کو مطالعۂ گاندھی پر مجبور کرتی ہیں۔ان کی مشہور نظم 'بوڑھا مالی' سے دو بند ملاحظہ کیجیے جس میں نذیر نے مہاتما گاندھی کی عظمت ورفعت، ہمدردی و رحم دلی اور وسیع النظری وروشن خیالی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

وہ پھول تھے لیکن پھول ایسے اب تک ہے جگت میں جس کی مہک
دیپک تھے مگر اک گھر کے نہیں دنیا کے اندھیرے کے دیپک
ہیرا تھے مگر ایسا ہیرا ہر دیش میں پہنچی جس کی چمک
اس دیش کی سوندھی ماٹی کی سنسار میں پھیلی ان سے گمک
انسان کے قد میں آئی تھی اونچائی ہمالہ پربت کی
وہ پردۂ دنیا پر تنہا تصویر تھے پورے بھارت کی
سینے سے لگایا کرتے تھے ہر غم کو سمجھ کر اپنا غم
غم گین کوئی جب ہوتا تھا ہو جاتی تھیں ان کی آنکھیں نم
بیوہ کے، یتیموں کے ہمدم، مظلوموں کے زخموں کے مرہم
گو روشنی آنکھوں کی مدھم، روشن مگر ان پر اک عالم
ابھری ہوئی ہر نس باپو کی اک موج رواں تھی جمنا کی
سوکھے ہوئے تن کی ہر جھری اک لہر تھی بہتی گنگا کی

(ایضاً ص 212)

جنگ آزادی میں ہندوستان کی ایک بڑی جماعت شہید ہوئی۔انگریزوں کی ٹکر سے ہندوستانیوں کا شیرازہ بکھرنے لگا لیکن ہندوستانیوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ اس وقت تک ڈٹے رہے جب تک کامیاب نہ ہوئے۔آزادی کی اس لڑائی میں مسلم، ہندو، سکھ، عیسائی سب نے قربانیاں دیں ہر شخص خود کو مجاہد تصور کرتا تھا اور واقعی ہر وہ شخص مجاہد آزادی تھا جس نے ملک وقوم کو غلامی کی زنجیر سے نجات دلانے میں تعاون کیا۔نذیر کے نزدیک گاندھی جی ان تمام مجاہدین کے ایسے لیڈر تھے جن کی ہنمائی میں پدرانہ شفقت موجود تھی جنھوں نے اپنے معتقدین کو کبھی مایوس نہیں کیا اور ایک سرپرست کی طرح ہر نشیب وفراز میں ان کا ساتھ دیا۔نذیر نے اپنی نظم 'عقیدت کے پھول' میں مہاتما گاندھی کے ساتھ تمام شہیدان وطن کو اجتماعی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔نظم کا درج ذیل بند دیکھیے۔

گولیاں سینے پہ کھائیں تو مگر آن کے ساتھ
شان والے تھے مرے بھی تو بڑی شان کے ساتھ
مر کے باپو بھی مرے ہوگئے سنتان کے ساتھ
کچھ کمی اب تو نہیں تم کو دلیران وطن
تم پہ ہم پھول چڑھاتے ہیں شہیدان وطن

(ایضاً ص 33)

نذیر بنارسی ایک حساس شاعر تھے۔ملک وقوم پر قربان ہونے کا جذبہ ان کے اندر بھی موجود تھا۔انھوں نے اپنی شاعری کے وسیلے سے نہ صرف مہاتما گاندھی کی حمایت کی بلکہ ان کی وفات کے بعد ان کے پیغام کو بھی عام کیا۔گاندھی جی کو ہندوستانی عوام کے دل ودماغ میں زندہ رکھا۔وہ آنے والی نسلوں کو مہاتما گاندھی کے پیغام سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔وہ جانتے تھے کہ تنگ نظری باہمی اختلاف کو جنم دیتی ہے جو معاشی اور معاشرتی دونوں اعتبار سے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔موجوہ دور میں ہندوستانی عوام جس نا اتفاقی اور تفرقے کی شکار ہے اس سے نکلنے کے لیے نئی نسل کو گاندھی جی کے پیغام سے روشناس کرانا بے حد ضروری ہے۔آج ہندوستان کو گاندھی جی کے ہم نواؤں کی شدید ضرورت ہے۔ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے تحفظ کی ذمے داری ہر اس شخص پر ہے جو ملک میں امن وسکون کا ماحول دیکھنا چاہتا ہے۔قول وفعل میں تضاد رکھ کر ہم گاندھی جی کی پیروی کا دعویٰ نہیں کرسکتے اس کے لیے ضروری ہے گاندھی جی کے نظریے کی تائید کرتے ہوئے ان کے اصولوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ذات پات اور فرقہ پرستی کی آڑ میں کسی کو اذیت نہ پہنچائی جائے جیسا کہ نذیر نے تمام عمر کرنے کی سعی کی اور اپنی شاعری کے ذریعے بار بار عوام کو بھی یہی پیغام دیا:

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی آپس میں ہیں بھائی بھائی
گوندھا ہے جو بوڑھے مالی نے وہ ہار نہ ٹوٹے اے ساتھی
پرچار محبت کا جیسے کرتا ہے برابر کرتا چل
کچھ ٹوٹے نہ ٹوٹے باپو کی تلوار نہ ٹوٹے اے ساتھی

(ایضاً ص 48-49)

■

Dr. Tamanna Shaheen
Guest Faculty DAVPG College
Dayanand Marg, Narharpura, Ausanganj
Varanasi - 221001 (UP)

سعید رحمانی

پروفیسر کرامت علی کرامت
ایک ہمہ جہت شخصیت

شعروادب کے عصری منظرنامہ میں پروفیسر کرامت علی کرامت کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ بنیادی طور پر شاعر تھے مگر بطور ناقد انھیں مستحکم شناخت حاصل تھی۔اس کے علاوہ ترجمہ نگاری کے فن میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی' اڑیا اور ہندی زبانوں پر مضبوط گرفت رکھتے تھے۔حیرت اس بات پر ہے کہ ریاضیات جیسے خشک موضوع کا پروفیسر ہونے کے باوجود ادب اور

> **ایک ناقد کی حیثیت سے بھی کرامت صاحب نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔اس ضمن میں ان کی دو کتابیں 'اضافی تنقید' اور 'نئے تنقیدی مسائل اور امکانات' سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جس کا برملا اعتراف آل احمد سرور' خلیل الرحمن اعظمی' وزیر آغا' ابن فرید' شمس الرحمن فاروقی' گوپی چند نارنگ' سلیم شہزادوغیرہ کرچکے ہیں۔ ان میں سے صرف دو شخصیتوں کا قول یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔وزیر آغا فرماتے ہیں: ''کرامت علی کرامت بہت اچھے نقاد ہیں۔اہل نظر کی امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔کرامت صاحب ہمارے بہت ہی ہوش مند اور کھرے نقاد ہیں اور ان کی کتاب کی اہمیت کا احساس دلانا ضروری ہے۔**

شاعری جیسی صنفِ لطیف میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

1963 سے تا حال ان کی درجن بھر تصنیفات شائع ہوکر اہلِ ادب سے خراج حاصل کرچکی ہیں۔ یہ تصنیفات شعروادب' نقد وتحقیق اور ترجموں پر مبنی ہیں۔ان کی اولین پیشکش 'آبِ خضر' ہے جس میں اڈیشا کے قدیم وجدید شعرا کا تذکرہ شامل ہے۔ یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں مرحوم شعرا' دوسرے میں موجودہ شعرا اور تیسرے میں ان بیرونِ صوبہ کے شعرا کا تذکرہ ہے جن کا قیام اڈیشا میں مستقل یا عارضی رہا ہے۔اس کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اگر کوئی اسکالر اڈیشا میں اردو شاعری کا ماضی اور حال لکھنے بیٹھے گا تو اس کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن 1993 میں شائع ہوا اور دوسرا ایڈیشن 2020 میں جسے اڈیشا اردو اکادمی نے نئی آب وتاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے 'کلیاتِ نجمی' کی تالیف جس کی اشاعت 2017 میں ہوئی اور جس کا پیش لفظ 'گفتنی' کے عنوان کے تحت اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر سید مشیر عالم نے لکھا ہے۔ان کی تحریر کے مطابق حضرت امجد نجمی کی شعری بصیرت کی عکاسی حوالوں کے ساتھ کی گئی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ کتاب ریسرچ اسکالرز' ناقدین اور باذوق قارئین کے لیے ایک بیش بہا سرمایے سے کم نہیں۔

ایک ناقد کی حیثیت سے بھی کرامت صاحب نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔اس ضمن میں ان کی دو کتابیں 'اضافی تنقید' اور 'نئے تنقیدی مسائل اور امکانات' سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جس کا برملا اعتراف آل احمد سرور' خلیل الرحمٰن اعظمی' وزیر آغا' ابنِ فرید' شمس الرحمٰن فاروقی' گوپی چند نارنگ' سلیم شہزادوغیرہ کرچکے ہیں۔ ان میں سے صرف دو شخصیتوں کا قول یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔وزیر آغا فرماتے ہیں: ''کرامت علی کرامت بہت اچھے نقاد ہیں۔اہلِ نظر کی امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔کرامت صاحب ہمارے بہت ہی ہوش مند اور کھرے نقاد ہیں اور ان کی کتاب کی اہمیت کا احساس دلانا ضروری ہے''۔

بقول سلیم شہزاد: ''پروفیسر کرامت کی تنقید میانہ روی اور ادب کے ناقد کے خلوص کی مثال ہے۔ جدیدیت نے جو ناقدین فراہم کیے ہیں ان میں پروفیسر صاحب کا اپنا مقام ہے اور اپنی اعتدال پسندی کی وجہ سے وہ جدید Extremist ناقدین سے الگ اپنی شناخت بناتے ہیں اور تاثراتی تنقید کے ناقدوں، نیاز فتحپوری، سجاد انصاری' فراق اور آل احمد سرور کے خطوط کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کی سائنسی فکر ادب کے مطالعے اور تنقید پر حاوی نہ ہوتے ہوئے اس میں معاونت کرتی ہے''۔

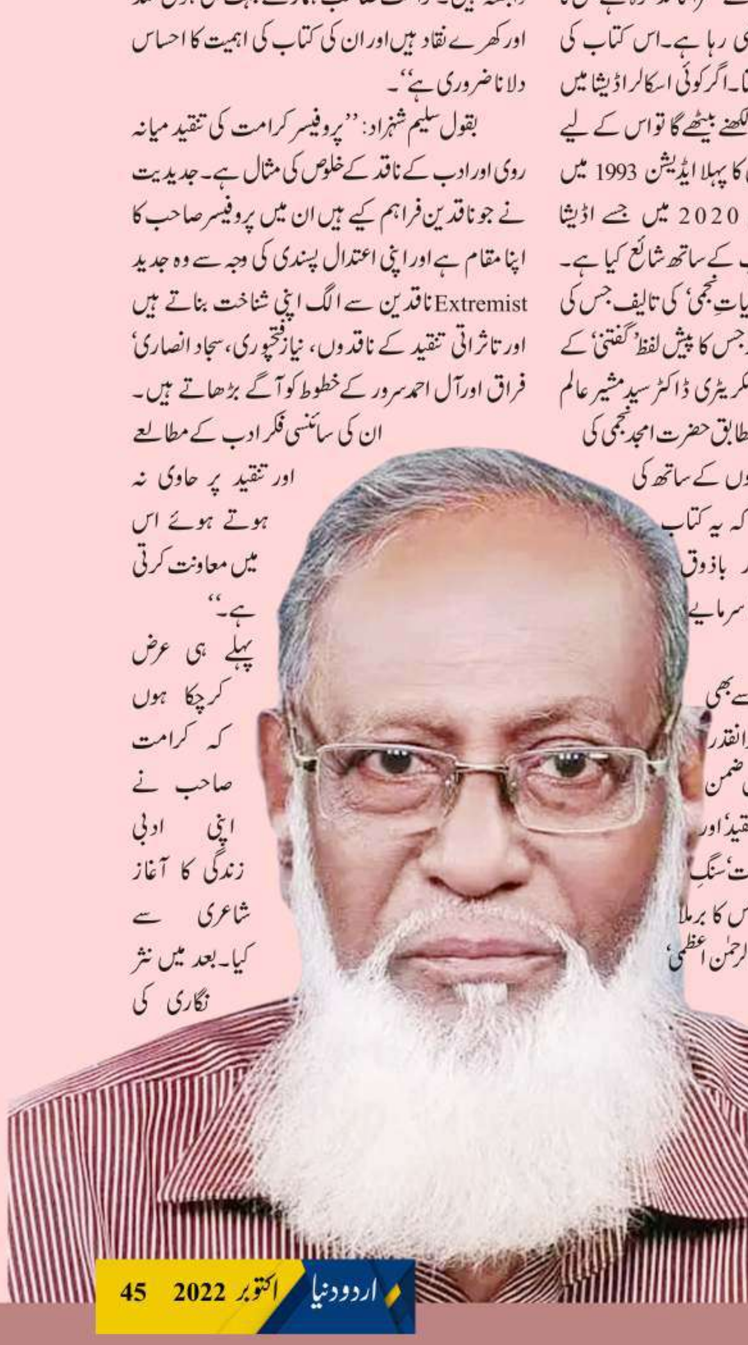

پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ کرامت صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ بعد میں نثر نگاری کی

طرف آئے۔ پھر تنقید کی جانب توجہ مبذول کی تو پہلا مضمون بعنوان 'مجاز کی غنائیت' سپرد قلم کیا اور جو رسالہ 'صبح نو' پٹنہ کے جنوری 1995 کے شمارے کی زینت بنا۔ اس کے بعد ترجمہ نگاری پر توجہ دی۔ سب سے پہلا ترجمہ پروفیسر بدھو بھوشن داس کے ایک اڑیا مضمون کا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اڑیا نظموں کے متعدد مجموعوں کو اردو قالب عطا کیا جن میں سیتا کانت مہاپاترا کی اڑیا نظموں کا مجموعہ بھی شامل ہے جسے انھوں نے 'لفظوں کا آکاش' کے نام سے شائع کروایا تھا۔ ساہتیہ اکادمی انھیں اس مجموعے پر ٹرانسلیشن ایوارڈ برائے 2004 سے نواز چکی ہے۔

صحافت کے میدان میں بھی ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھوں نے 1956 میں دو ماہی 'شاخسار' کا اجرا کیا تھا۔ یہ رسالہ برصغیر ہندوپاک میں کافی مقبول ہوا۔ اس وقت کے تمام اکابرینِ ادب کی تخلیقات اس میں تسلسل سے شائع ہوتی تھیں۔ اس کے ذریعے نو آموز شعرا اور ادبا کو بھی آگے بڑھنے کا موقع ملا جو آج ادب کے آسمان پر درخشندہ ستاروں کی طرح ضیا پاشی کر رہے ہیں۔ اس رسالے کے ذریعے انھوں نے صالح اور صحت مند جدیدیت کو فروغ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ وہ کالج کے پروفیسر ہوا کرتے تھے اور ان کا تبادلہ اڈیشا کے مختلف اضلاع میں ہوتا رہا تھا اس لیے اس کی ترتیب و تزئین کی ذمے داری انھوں نے اپنے استاد محترم حضرت امجد نجمی مرحوم کو سونپ رکھی تھی۔ حضرت نجمی جب تک زندہ رہے 'شاخسار' پابندی سے شائع ہوتا رہا اور ان کے انتقال کے بعد یہ بند ہو گیا۔ اس کے ہر شمارے میں کرامت صاحب کے اداریے اور تبصرے شامل رہتے تھے۔ ان اداریوں کے مطالعے سے کرامت صاحب کی فکری صلابت، دروں بینی اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی اس زمانے کی ادبی سرگرمیوں، تحریکات و رجحانات سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ان اداریوں اور تبصروں کو کتابی شکل میں شائع کیا جا چکا ہے جس کا نام ہے 'شاخسار کے اداریے اور تبصرے'۔ اس رسالے پر تحقیقی کام بھی ہو چکا ہے۔ 'اردو ادب کو شاخسار کی دین' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھنے پر سلمان راغب کو اتکل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہو چکی ہے۔

بہرحال سائنس اور ادب کو ہم آمیز کر کے کرامت صاحب نے جس طرح سائنس کو آرٹ کا ایک حصہ بنا دیا ہے اس کی مثال بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس طرح انھوں نے شیلے، پیٹر، روجر اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اس نظریے کی توثیق کی ہے کہ '' سائنس جب جذبات کے ساتھ مل جائے تو وہ آرٹ بن جاتا ہے۔''

ان کی تخلیقی کاوشوں کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نثر نگاری ان کی شاعری پر حاوی نظر آتی ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جہاں وہ اب تک اردو کی ستر 70 کتابوں کا پیش لفظ لکھ چکے ہیں، وہیں سیکڑوں کتابوں پر بے لاگ تبصرے بھی کیے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کے مضامین و تراجم کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ مگر ان سب سے بڑھ کر ان کی معرکتہ الآرا تصنیف 'اضافی تنقید' کو بہر طور ایک رجحان ساز کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ جس میں پہلی بار انھوں نے ریاضیاتی و شماریاتی اسلوبیات کے

صحافت کے میدان میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے 1956 میں دو ماہی 'شاخسار' کا اجرا کیا تھا یہ رسالہ برصغیر ہندوپاک میں کافی مقبول ہوا۔ اس وقت کے تمام اکابرین ادب کی تخلیقات اس میں تسلسل سے شائع ہوتی تھیں۔ اس کے ذریعے نو آموز شعرا اور ادبا کو بھی آگے بڑھنے کا موقع ملا جو آج ادب کے آسمان پر درخشندہ ستاروں کی طرح ضیا پاشی کر رہے ہیں۔ اس رسالے کے ذریعے انھوں نے صالح اور صحت مند جدیدیت کو فروغ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اصولوں کو منطبق کر کے اسلوبیاتی تنقید کو نئی جہات سے آشنا کرایا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ان کی شاعری کا قد کسی طرح کم ہے۔ بلکہ شاعری میں بھی اپنی فکر رسا کے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ ان کے کلام میں حکیمانہ بصیرت، متصوفانہ اعماق اور توانائی کے ساتھ شعری روایات کے عمدہ نقوش مرتسم نظر آتے ہیں۔ ان کے شعری و فکری رجحان کا پتہ اس شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ۔

لہجہ ہے اپنا گرچہ کرامت بہت ہی نرم
ہے موج تہہ نشیں کی طرح اس میں احتجاج

'شاخِ صنوبر' ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو اولین مجموعے 'شعاعوں کی صلیب' کے پورے 34 سال بعد منظر عام پر آیا۔ ابتدا میں 'لفظ لفظ جستجو' کے عنوان سے حمد، نعت، آزاد نظمیں اور آزاد غزلیں شامل ہیں اور 'خواب خواب لمحہ' غزلوں پر مشتمل ہے جسے ایک مکمل دیوان کی صورت دی گئی ہے۔ کرامت صاحب نے اپنے مندرجہ ذیل شعر کو کتاب کا سرنامہ بنایا ہے ۔

مرجھا گیا ہے پھول کا چہرہ تو کیا ہوا
گل کے عوض ہے شاخ صنوبر مجھے عزیز

ظاہر ہے خاروں کو عزیز رکھنے والا شخص درد آشنا ہوگا ایک ایسا درد جو دوسروں کے دل میں بھی ہو تو اس کی کسک وہ خود بھی محسوس کر سکتا ہے۔ تاہم ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے جس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے دھنک رنگی اجالے جا بہ جا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بقول عنوان چشتی 'فیشن گزیدہ جدیدیت سے اجتناب کرتے ہوئے انھوں نے ادب کی صالح روایات سے اپنا رشتہ مستحکم رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لب و لہجے میں شگفتگی اور زبان و بیان میں لطافت و سادگی پائی جاتی ہے۔ ''شاخ صنوبر' ان سبھی محاسن سے متصف ہے۔''

اس تعلق سے مزید کچھ کہنے کی بجائے بہتر سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری صاحب کا قول دہرادوں جو اسی کتاب کے پیش لفظ سے مستعار ہے۔ بقول ان کے....''شاخ صنوبر ڈاکٹر کرامت علی کرامت کی تخلیقی بوطیقا کا اظہاریہ ہے جس میں اردو غزل کے تہذیبی مزاج، فکری اساس اور فنی ساخت کی تفہیم و ادراک کے در کھلتے ہیں۔'' ایجاز و اختصار کے ساتھ بڑے جامع انداز سے انھوں نے اس مجموعے کی خصوصیات پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کتاب کے آخر میں اور فلیپ پر اکابرین ادب کی گراں قدر آرا بھی شامل ہیں جن میں فراق گورکھپوری، خواجہ احمد فاروقی، احتشام حسین، جمیل مظہری، وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، اسلوب احمد انصاری، بلراج کومل، مظہر امام، وارث علوی، بانی، خلیق انجم، خلیل الرحمٰن اعظمی، شمیم کرہانی، عنوان چشتی کے علاوہ اور بھی بیسوں شخصیتوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ تقریباً سبھوں نے کرامت صاحب کی شاعری کو عمدہ خراج پیش کیا ہے۔ صرف لطف الرحمٰن صاحب انھیں اوسط درجے کا شاعر بھی تسلیم نہیں کرتے جب کہ شمس

الرحمٰن فاروقی صاحب کے خیال میں کرامت صاحب شاعرانہ اسلوب کے عرفان سے عاری ہیں۔

مذکورہ اقوال سے اتفاق کا انحصار صاحب الرائے قارئین پر ہے کہ وہ ان خیالات کو قبول کریں یا رد کردیں، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی غزلیہ شاعری ذاتی تجربات اور مشاہدات کی منہ بولتی تصویر ہے۔ جس میں انھوں نے رعایتِ لفظی سے کام لے کر آشنا لفظوں کو نئی معنویت اور نئے مفاہیم عطا کیے ہیں۔ زبان و بیان کی خوبی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مختصر یہ کہ اپنے مشاہدات کو شعری پیکر عطا کرنے میں انھوں نے جس کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ سبھی غزلیں ان کی تخلیقی صلاحیت اور علوئے فکر کا آئینہ دار ہیں۔

ان کی مطبوعہ تصنیفات حسبِ ذیل ہیں:

1 شاخِ صنوبر (شعری مجموعہ 2006)
1 نئے تنقیدی مسائل اور امکانات (تنقیدی مضامین 2009)
3 لفظوں کا آسمان (سیتا کانت مہاپاترا کی اڑیا نظموں کا ترجمہ مع پیش لفظ از ڈاکٹر وزیر آغا 1990۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ برائے ترجمہ نگاری)
4 کلیاتِ نجمی (تالیف) 2017
5 شاخسار کے اداریے اور تبصرے 2017
6 گلکدۂ صبح وشام (شعری مجموعہ 2016)
7 ماہر اقبالیات: شیخ حبیب اللہ 2019
8 آبِ خضر (تذکرۂ شعرائے اڈیشا۔ دوسرا اڈیشن 2020
9 اڑیا زبان و ادب: ایک مطالعہ 2020
God Particles And Otther poems
(کرامت صاحب کی نظموں کا انگریزی ترجمہ از ایلزبتھ کورین مونا 2021)
10 ایکانت روسورو (تنہائی کی چیخ۔ کرامت صاحب کی اردو نظموں کا اڑیا ترجمہ از انور بھدرکی 2021)
11 میرے منتخب پیش لفظ۔ تنقید و تجزیہ 2021

شعر و ادب کے منظر نامہ میں کرامت صاحب بطور شاعر امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی شاعری جہاں ذاتی تجربات و مشاہدات کی آئینہ دار ہے وہیں ان کے رجحانِ طبع سے بھی روشناس کراتی ہے۔ ان کی شاعری اگر ایک طرف زندگی کو درپیش مسائل کا اظہاریہ ہے تو دوسری طرف سائنسی نظریات اور متصوفانہ موضوعات کی گرہ کشائی بھی کرتی نظر آتی ہے۔ مختلف موضوعات پر مبنی یہاں ان کے چند اشعار بطور نمونہ پیشِ خدمت ہیں۔

کیا زمانے کا اعتبار کروں
اب نہیں اپنا اعتبار مجھے

کڑی دھوپ مجھ کو بلاتی رہی
مگر پیڑ جامن کا راہوں میں تھا

مقابلہ کیا جس پیڑ نے ہواؤں کا
اسی پہ برقِ تپاں کا عتاب اترا تھا

ندی جو پیاس بجھاتی تھی سب کی صدیوں سے
خود اس کی پیاس بجھانے سراب اترا تھا

ہاتھ آئے کرامت کو کیا عالمِ فانی سے
آیا ہے بشر تنہا جائے گا بشر تنہا

ان کے بیشتر اشعار سے سائنس کے جدید اکتشافات سے ابھرنے والے کائناتی شعور کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن تعریف کی بات یہ ہے کہ اس خشک موضوع کو اس طرح جزوِ شاعری بنایا ہے کہ شعریت کہیں بھی مجروح نہیں ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

انجم کا ٹوٹنا ہے محشر کا ایک منظر
کرتا ہے پھر بھی انساں آوازِ صور پر شک

آئینوں کے درمیاں رکھ دو چراغِ آرزو
دیکھتا رہ جائے گا منہ پھر مقابل کا چراغ

جب روزنِ سیاہ میں گم ہوگیا وجود
کرتی رہی مثالِ خضر رہبری شعاع

ہو ذات سے صفات کا کیوں کر مقابلہ
کرتی ہے نورِ عین سے جو ہم سری شعاع

درج بالا اشعار میں انھوں نے سائنس کے مختلف اکتشافات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان سب کی تشریح کی جائے تو مضمون کافی طویل ہوجائے گا۔ اس لیے آخری شعر کی تشریح پر اکتفا کرنا چاہوں گا۔ اس شعر میں شاعر نے فلسفۂ وجودیت کو بڑی آسانی سے شعری جامہ پہنا دیا ہے۔ فلسفۂ وجودیت کی رو سے Existence precedes essence یعنی کسی شے کا وجود اس کے جوہر سے پہلے کی چیز ہوا کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ذات کا وجود اصل ہے اور صفات بعد کی چیز ہے۔ نورِ عین ذات کی طرح ہے اور شعاع صفات سے مشابہ۔ نورِ عین یعنی وہ نور جو نظر میں عین الیقین کی طرح پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کا مقابلہ علم الیقیں کی شعاع نہیں کرسکتی۔

کرامت صاحب ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے مگر اس کے باوجود وہ سائنسی صداقتوں سے انحراف بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے دنیا نیز کائنات میں رونما ہونے والی ہر بات سے ان کے دل میں ایک وجدانی کیفیت پیدا ہوتی اور وہ اس کا سائنسی انداز سے تجزیہ کرکے خود کو تسلی دے لیتے تھے۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ موشگافیوں کے علاوہ پیکر تراشی، علامت پسندی اور ایمائیت جیسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ چونکہ وہ ریاضی کے پروفیسر رہ چکے تھے اس لیے ان کے بعض اشعار میں اس کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

بے ربطیِ حیات سے بے ربط کا سبق
تنظیم کائنات میں اک انتشار دیکھ

اس شعر سے ریاضی کے نظریۂ امکانات (Theory of Probablity) کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ایک مہرہ پھینکیں تو وہ جس جگہ گرتا ہے، دوسری بار پھینکنے پر اسی جگہ گرنے کی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ مہرہ کے گرنے کے واقعات ایک دوسرے سے بے تعلق اور بے ربط ہوتے ہیں، لیکن بار بار پھینکتے رہیں تو نظریۂ امکانات کے ذریعے یہ پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ کوئی خاص عدد کتنی بار آئے گا۔ غرض کہ قدرت کے مختلف بے ربط واقعات میں ایک ربطِ تسلسل برقرار رہتا ہے۔ یہی خیال مندرجہ بالا شعر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جگہ جگہ باصرہ، لامسہ، شامہ، ذائقہ جیسی حسوں کا بھی برملا استعمال کیا ہے، جس کی بدولت ان اشعار میں گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے۔ قوتِ ذائقہ کی صرف ایک مثال دیکھیں۔

تمھاری آنکھوں نے بخشی ہے گل کو نمکینی
تم اپنی آنکھوں میں جلوے نچوڑتے کیوں ہو

اردو دنیا میں بلند مقام پر متمکن ہونے کے باوجود ان میں ذرا بھی خود نمائی نہیں تھی۔ طبیعت میں بلا کی انکساری تھی۔ چھوٹے بڑے سبھوں کے ساتھ بڑے خلوص اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان میں بچوں جیسی معصومیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دوست احباب سے ملتے وقت چہرے پر ہلکا سا تبسم رقصاں ہوتا تھا۔ بہر حال یہ کہنے میں باک نہیں کہ اردو شعر و ادب اور نقد و تحقیق کے باب میں پروفیسر کرامت صاحب نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ ادب کا حصہ بنی رہیں گی۔ ان خدمات کے پیشِ نظر صحیح معنوں میں وہ اردو ادب کے کوہِ نور تھے۔

کٹک میں ان کی ولادت 23 ستمبر 1936 کو ہوئی تھی۔ عمر کے آخری پڑاؤ تک فعال زندگی گزارتے ہوئے بالآخر 5 اگست 2022 کو وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے۔ ان کے انتقال سے اڈیشا کے ادبی حلقے میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ آسانی سے پر نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس اعلیٰ میں مقام عطا کرے۔ آمین

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

■

Sayeed Rahmani
Editor 'Adabi Mahaz'
Deewan Bazar
Cuttack- 753001 (Odisha)

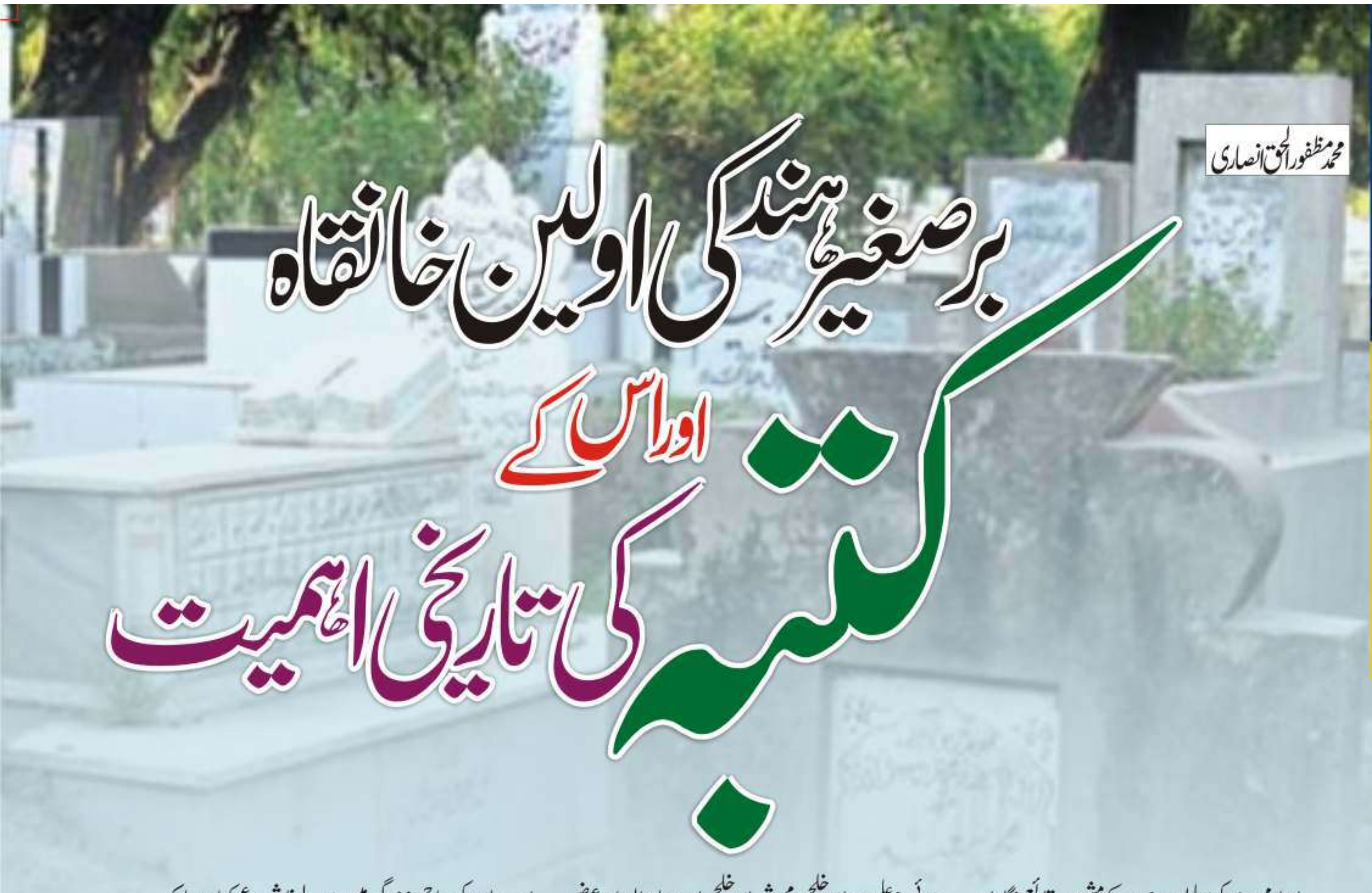

محمد مظفر الحق انصاری

برصغیر ہند کی اولین خانقاہ اور اس کے کتبہ کی تاریخی اہمیت

اسلامی ہند کی سلطنت عہد کے مشہور وقائع نگار اور مورخ منہاج الدین سراج، جس نے سلطان ناصرالدین محمود (1206 / 1198 تا 1246) کے دربار سے وابستہ ہونے کے باعث اپنی تصنیف 'طبقات ناصری' کو اسی بادشاہ کے نام سے منسوب کیا ہے، 'اولین فاتح' بنگال اختیارالدین محمد بن بختیار خلجی (فتح بنگال اغلب 1204) کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ نگر دیپ (ندیا) کو فتح اور لکھنوتی کو پایۂ تخت قرار دینے کے بعد اس کی اور اس کے امرا کی قابل ستائش کوششوں سے مفتوحہ ملک کے اطراف و جوانب میں مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں کا قیام عمل میں آیا۔[1]

افسوس ہے کہ ان مسلم تعمیرات خصوصاً خانقاہوں کے تاریخی آثار اب محفوظ نہیں ہیں کہ ان کی ہیئت ترکیبی کا مطالعہ کیا جا سکے مگر اپنے زمانے کے مسلم معاشرے پر ان کے اثرات اور اس کے ایک طبقے یعنی صوفیا کی اقامتی اور عبادتی ضروریات کا ان کے ذریعے پورا ہونے کا مورخین کو آج بھی اعتراف ہے۔[2]

آئندہ سطور میں 'سیان (بولپور)' میں حال ہی میں دریافت ہونے والی ہندوستان کی ایک ایسی ہی خانقاہ کے کتبے کی عبارت اور اس کے تاریخی مضمرات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی جسے خیر سے برصغیر کی اولین خانقاہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہو رہا ہے۔

1206 عیسوی کے اوائل میں بختیار خلجی کی وفات کے بعد اس کے امرا میں حصول اقتدار کی کش مکش شروع ہوئی جو علی مردان خلجی، محمد شیران خلجی اور حسام الدین عوض خلجی سے ہوتی ہوئی دوبارہ علی مردان خلجی تک پہنچی جو سلطان علاء الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا مگر اپنی بے اعتدالیوں کے باعث جلد ہی اپنے امرا کے ہاتھوں قتل ہو کر حسام الدین عوض خلجی کے سلطان غیاث الدین عوض خلجی (610 ھ تا 624 ھ مطابق 1213 تا 1227) کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہونے کا باعث بنا۔[3]

سلطان غیاث الدین عوض خلجی ایک عقل مند اور باتدبیر بادشاہ تھا۔ اس نے سلطنت کی بقا و استحکام کے لیے بہت سی تدابیر اختیار کیں۔ علما، سادات اور مشائخ کے لیے انعام و وظیفے جاری کیے۔ بنگال کے دریاؤں سے گھرا ہونے کے باعث بحریہ کو منظم کیا اور اسے سیلابوں سے بچانے کے لیے دریاؤں پر پشتے بنوائے۔[4]

منہاج سراج کے بیان کے مطابق عوض خلجی نے اپنی سلطنت کو انتظامیہ کی سہولت کی خاطر دو صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ دریائے گنگا کے جنوب میں رال پا رادھا صوبہ تھا اور شمال میں بارند یا ورندرا صوبہ۔ دونوں صوبے عوض کی بنوائی ہوئی شاہراہوں کے ذریعے دارالخلافہ لکھنوتی سے جڑے ہوئے تھے۔ صوبوں کی یہ تقسیم علاقوں کو طغیانی کے سالانہ معمول سے بچانے اور عوام و فوج کو نقل و حمل کی سہولیات بہم پہنچانے کے لیے تھیں۔[5]

سلطنت کے سیاسی و معاشی استحکام کے باعث بیرونی ممالک سے بھی مسلمانوں نے بنگال میں آ کر بسنا اور یہاں کی سماجی زندگی میں حصہ لینا شروع کیا جیسا کہ آگے کے حالات سے معلوم ہوگا۔

دریائے گنگا کے جنوب میں واقع رال پا رادھا صوبہ عوض خلجی کے لڑکے علی شیر کے زیر انتظام تھا۔ اسی صوبے اور موجودہ ہندوستان کے صوبۂ مغربی بنگال کے ضلع بیر بھوم کی بولپور کوتوالی کے ایک گاؤں 'سیان' میں حال ہی میں وہ خانقاہ اور اس کا کتبہ دریافت ہوا ہے جس کی زبردست تاریخی اہمیت ہمارا موضوع بیان ہے۔ دریافت شدہ کتبے کے مطابق یہ خانقاہ موجودہ ایران کے عین شمال میں واقع آذربائیجان کے ایک قصبہ مراغا کے باشندہ 'محمد' کے گنہ گار صوفی منش (فقیر الخاطی) لڑکے نے تعمیر کرائی اور اس کی کفالت کے لیے جائداد بھی وقف کی۔ محمد المراغی کا یہ لڑکا شاید تاجر یا سلطنت کے صاحب حیثیت امرا میں تھا۔ افسوس ہے کہ کتبے کی شکستگی اور کچھ حصے ضائع ہونے کے سبب اس کا نام محفوظ نہیں رہ سکا ہے اور اس کا تذکرہ صرف ابن محمد المراغی (یعنی المراغی کے لڑکے) کے طور پر ملتا ہے۔[6]

یہ کتبہ ایک اسکول ٹیچر اور قدیمی نوادرات کے شائق بابو سدھیشور مکھو پادھیائے کی کوششوں سے 'سیان' میں ایک غیر معروف بزرگ مخدوم شاہ کی درگاہ میں ملا ہے اور اس کی خواندگی و ترتیب کا سہرا ماہر کتبات اور مورخ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی کے سر ہے جنھوں نے اپنی گرافیا انڈیکا (عربک۔ پرشین سپلیمنٹ) کے مجلّہ مجریہ

(1975) میں اس پر ایک محققانہ مضمون لکھ کر دنیا کو اس سے روشناس کرایا۔[7]

وہ سنگی تختی جس پر یہ کتبہ کندہ ہے شکستہ حالت میں ہے۔اس کی شکستگی کی وجہ تو معلوم نہیں مگر اس کی وجہ سے یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے اور ایک حصے میں اوپر دائیں طرف سے بائیں طرف تک ایک ترچھا بال آ گیا ہے اور کچھ حصے ضائع ہو گئے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تختی کتبہ دراصل ایک ہندو عمارت سے وابستہ تھی اور

دریائے گنگا کے جنوب میں واقع رال پا رادھا صوبہ عوض خلجی کے لڑکے علی شیر کے زیرانتظام تھا۔اسی صوبے اور موجودہ ہندوستان کے صوبۂ مغربی بنگال کے ضلع بیر بھوم کی بولپور کوتوالی کے ایک گاؤں 'سیان' میں حال ہی میں وہ خانقاہ اور اس کا کتبہ دریافت ہوا ہے جس کی زبردست تاریخی اہمیت ہمارا موضوع بیان ہے۔ دریافت شدہ کتبے کے مطابق یہ خانقاہ موجودہ ایران کے عین شمال میں واقع آذر بائیجان کے ایک قصبہ مراغا کے باشندہ 'محمد' کے گنہ گار صوفی منش (فقیر الخاطی) لڑکے نے تعمیر کرائی اور اس کی کفالت کے لیے جائداد بھی وقف کی۔

اس کے دوسری طرف ایک سنسکرت عبارت کندہ ہے جس کا تعلق بنگال کے پال راجا نیا پال (اغلباً 1035 تا 1050) کے عہد سے ہے اور جس پر قدیم تاریخ ہند اور ثقافت کے ایک مشہور محقق پروفیسر ڈی۔سی۔سرکار نے بنگلہ دیش کی تیسری تاریخی کانگریس منعقدہ 1973 بہ مقام ڈھاکہ اپنا مضمون پیش کیا تھا۔[8]

کتبے کی زبان عربی ہے اور خوش خط طغریٰ میں بخط نسخ پتھر پر کھدی ہوئی ہے۔ ہر چند کہ اس میں برصغیر ہند کے مشرقی حصے میں بعد کے لکھے جانے والے طغرائی انداز کی دل کشی اور آرائشی اوصاف نہیں ہیں مگر بحیثیت مجموعی یہ اپنی موجودہ شکستہ حالت میں بھی کافی اچھی ہے۔[9]

کتبے پر ڈاکٹر ڈیسائی کے مضمون کے علاوہ، اینول رپورٹ ان انڈین اپی گرافی نمبرا مجریہ (1972 اور 1973)، انڈین آرکیالوجی (1972 اور 1973) اے ریویو مجریہ 1978 نئی دہلی، کارپس آف دی عربک اینڈ پرشین انسکرپشن آف بنگال از پروفیسر عبدالکریم اور 'بنگال میں مسلم حکمرانی کا ابتدائی عہد' از پروفیسر سکھ مایا مکھو پادھیائے آف شانتی نکیتن یونیورسٹی (بنگلہ) میں بھی تعارفی مضامین شامل ہیں۔

یہ کتبہ چھے سطروں پر مشتمل ہے۔ پہلی دو سطریں اور تیسری سطر کے کچھ الفاظ قرآن شریف کی چوبیسویں سورۃ سورۂ نور کی 36ویں اور 37 ویں آیتوں پر مشتمل ہیں۔ تیسری سطر کے بقیہ الفاظ ایک مختصر حدیث شریف پر مشتمل ہیں۔ چوتھی اور پانچویں سطر کے آدھے حصے میں اس خانقاہ کا 'اہل صفہ' کے لیے وقف ہونے کا ذکر ہے۔ پانچویں سطر کا بقیہ حصہ اور چھٹی سطر اس حکمراں کا نام مع لقب اور تاریخ تعمیر معسنہ بیان کرتی ہے، جس کے عہد میں یہ خانقاہ بنوائی گئی ہے۔

کتبے سے متعلق خانقاہ کی اصل جائے وقوع تو معلوم نہیں ہو سکی ہے مگر ڈاکٹر ڈیسائی کے مطابق اس کا تعلق 'سیان' ہی سے معلوم ہوتا ہے۔[10]

کتبے کا متن اور ترجمہ ڈاکٹر زیڈ۔اے۔ڈیسائی کی خواندگی کے مطابق حسب ذیل ہے:

1 سطر اول: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بُیُوتٍ اذن اللّٰہُ ان تُرفَع ویُذْکر فیھا اسْمُهُ یُسبّح لهُ فیھا بالْغُدُوّ والآصال۔ (سورۃ النور 36)

''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ان گھروں میں جن کے بلند کرنے اور جنھیں اپنے نام کی یاد کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔''

2 سطر دوم: رجالٌ لّا تُلْهِیهِمْ تجارةٌ ولا بیْعٌ عن ذکْر اللّٰه وإقام الصّلاة وإیتاء الزّکاة یخافُون یوْمًا تتقلّبُ فیه القُلُوبُ والأبْصارُ۔ (سورۃ النور 37)

''ایسے لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔''[11]

3 سطر سوم: القلوب و الابصار عن رسول اللّٰه فی الصحیح الناس فی مساجد هم واللّٰه فی یو بهم

''انسان کے مسجدوں میں مصروف ہونے کے باوجود اللہ ان کی ضروریات کی خبر گیری کر رہا ہے۔''

4 سطر چہارم: وقف هذه الخانقاه الفقیر الخاطی الذی یرجون رحمته ربه... محمد المراغی لاهل الصفه الذی یلزمون تحصرة۔

''یہ خانقاہ جو تعمیر کی گئی اور وقف کی گئی ایک گنہ گار فقیر محمد المراغی کے لڑکے کی طرف سے، جو اپنے رب کی رحمت کا خواست گار ہے، اہل صُفہّ [12] کے لیے جو ہمہ وقت لازم رکھتے ہیں (اپنے اوپر) اللہ تعالیٰ کی حضوری

5 سطر پنجم: اللّٰه تعالیٰ و یشغلون بذکره اللّٰه تعالیٰ فی ایام الدولت غیاث الاسلام والمسلمین، صدر الملوك و السلاطین الخصوص

''اور مشغول رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر میں۔ زیر سایہ حکومت اسلام اور بادشاہوں اور سلطانوں کے امیر کے جو خاص کرنوازا گیا ہے۔''

6 سطر ششم: بولایت العهدفی العلمین علی شیر بن عوض برهان امیرالمومنین فی یوم؟ السابع من جماد الآخر ستة ثمان عشر ولتحایة

''راکب ایام کی طرف سے یعنی عہد ولایت علی شیر بن عوض جو مومنین کے امیر کی نشانی ہے (مورخہ 7 جمادی الثانی 618ھ مطابق 29/جولائی 1221)[13]

یہ کتبہ تاریخی نقطۂ نظر سے مختلف وجوہات کے سبب بہت اہم ہے۔

1 پروفیسر عبدالکریم کے بیان کے مطابق بنگال کے مسلم سلاطین کے تا حال دریافت شدہ کتبوں میں یہ سب سے قدیم ہے۔اس کی دریافت سے پہلے مغربی بنگال کے ضلع مغربی دیناج پور میں 'گنگا رام پور' کے مقام پر پایا جانے والا جلال الدین مسعود جانی (644 تا 648ھ) مطابق (1247 تا 1250) کا کتبہ اولین مانا جاتا تھا مگر اب اس کی یہ حیثیت جاتی رہی ہے۔[14]

2 یہ پہلا کتبہ ہے جو مسجدوں اور مدرسوں کے علاوہ ایک دوسری قسم کی مذہبی عمارت یعنی خانقاہ کی تعمیر اور اس کی کفالت کے لیے وقف کی جانے والی جائداد کو ریکارڈ کرتا ہے۔[15]

3 یہ بنگلہ دیش کے ضلع راج شاہی کے محکمہ نوگاؤں کے قریہ 'سیتلمٹ' میں پائے جانے والے بنگال کے تیسرے سب سے پرانے کتبے اور صوفیانہ ریاضت کے لیے دوسری مخصوص عمارت سے بھی، جو مغیث الدین یاذبک (648 تا 655ھ) مطابق (1250 تا 1255ھ) کے عہد میں احمد بن مسعود کے ذریعے (652ھ مطابق 1254 تا 1255) میں تعمیر کی گئی ہے،[16] چونتیس برس پرانا ہے اور اس پر بایں معنی فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں 'اہل صفہ' کے الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔[17] اور شاید یہی وجہ ہے کہ سیتلمٹ کتبہ کے مرتب، مشہور مورخ ڈاکٹر اے بی ایم حبیب اللہ نے اسے چلہ خانہ (بجائے خانقاہ) میں شمار کیا ہے۔ پروفیسر کریم کے مطابق دونوں کتبوں یعنی سیان اور سیتلمٹ کے کتبوں کو سامنے رکھنے سے یہ بات موثر طور پر ثابت ہوتی ہے کہ بنگال کی فتح کے بعد صوفیا اچھی خاصی تعداد میں یہاں وارد ہوئے ورنہ اس طرح کی صوفیانہ

عمارتوں کی تعمیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ 18

4 ڈاکٹر زیڈاے ڈیسائی نے اس کتبے کی اہمیت اور غایت الغایات پر تاریخی انداز میں یوں روشنی ڈالی ہے:

''زیر مطالعہ کتبہ کو تحریری ماخذ کی اس بات کی تصدیق کے لیے لیا (یعنی استعمال کیا) جا سکتا ہے کہ فتح بنگال اغلبًا (1204) کے معاً بعد خانقاہوں کی تعمیر شروع ہوگئی تھی اور لہٰذا یہ اس حقیقت کی بالواسطہ شہادت دیتا ہے کہ بہت سے ان عوامل میں، جنھوں نے بنگال میں اسلام کی ترویج میں معتد بہ کردار ادا کیا ہے، صوفیا کا کردار کچھ کم اہم نہیں ہے۔ یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اس خطے میں جو اصل بنگال کے مغربی علاقوں پر مشتمل ہے صوفیانہ تنصیبات 19 اس عہد میں اپنا کام شروع کر چکی تھی یا اس سے بھی پہلے کے وقتوں سے 20 اس کتبہ کی پائے جانے والی جگہ خاص کر سیان ہی سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ سنسکرت ریکارڈ سے ظاہر ہے (اشارہ ہے کتبہ کے دوسری طرف کندہ سنسکرت عبارت کی طرف) اور یہ اس نظریے کو بھی تقویت دیتا ہے کہ ملک کی دوسری جگہوں کے برخلاف، اسلام ملک کے اس حصے (یعنی بنگال کے مغربی علاقوں میں) گاؤں ہی میں (یعنی دیہی علاقوں میں) پھیلا۔''21

5 اس کتبہ کی قدامت مسلم ہے اور اس سلسلے میں ڈاکٹر ڈیسائی کا کہنا ہے:

''درحقیقت یہ واحد ریکارڈ ہے جو اغلبًا بنگال میں بصراحت کسی خانقاہ کے لیے پایا گیا ہے۔ ہم لوگوں کو ملک کے دوسرے حصوں سے تقریباً دو درجن خانقاہوں کے ریکارڈ ملے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی اس سے پہلے کی تاریخ (تعمیر) کا نہیں ہے۔ پروفیسر کریم نے بھی مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں کتبہ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے 'سیان' کی خانقاہ کو برصغیر ہند کی اولین خانقاہ مانا ہے۔ 22

6 اس کتبہ کی دریافت نے دو مورخین اور ماہرین کتبات کے درمیان ایک دل چسپ تاریخی بحث کو بھی جنم دیا ہے۔ ڈاکٹر ڈیسائی کے نزدیک علی شیر کے نام سے پہلے "غیاث الاسلام و المسلمین صدر الملوك والسلاطين المخصوص بولايت العهدفي العالمين" اور اس کے نام کے بعد 'برہان امیر المومنین' وغیرہ جیسے الفاظ کا اس کے لیے استعمال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ علی شیر دراصل صوبہ دار نہیں ہے بلکہ خود مختار بادشاہ تھا۔ کیونکہ بنگال کے از منہء وسطیٰ کے کتبات، سکوں اور تاریخی کتابوں میں اس طرح کے القاب کا استعمال صرف سلاطین اور بادشاہوں کے لیے مخصوص ہے اور اس طرح یہ کتبہ بنگال کے مسلم سلاطین کے نام کی فہرست میں ایک نام کے اضافے کا بھی باعث بنتا ہے جو ایک بہت ہی اہم بات ہے اور بایں وجہ ڈاکٹر ڈیسائی کو مورخین سے شکایت ہے کہ ان لوگوں نے اس کتبے کو شایان شان اہمیت نہیں دی ہے۔ پروفیسر کریم ڈاکٹر ڈیسائی کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کتبہ میں علی شیر کے لیے 'سلطان' نہیں بلکہ 'علی شیر بن عوض' لکھا گیا ہے جو اس کے صوبہ دار ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ بنگال کے دیگر کتبات میں بھی صوبے داروں کے لیے اس طرح کے القاب استعمال کیے گئے ہیں۔ جیسے کہ:

1 عزل الدین طغرل خاں کی بڑی درگاہ (بہار شریف) کے کتبہ میں صوبے دار طغرل خاں کو "غیاث الاسلام والمسلمین مغیث الملك و السلاطين"

2 جلال الدین مسعود جانی کے گنگا رام پور کے کتبہ میں صوبے دار مسعود جانی کو "ملك ملوك الشرق برهان امير المومنين" اور

3 ابوالفتح پازبک کے سیٹلمنٹ کے کتبے میں صوبے دار ابوالفتح پازبک کو "مغيث الاسلام و المسلمين ناصر امير المومنين" کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ واحد لقب جو بنگال کے کسی دوسرے سلطان کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے اور اس کتبے میں پایا جاتا ہے "صدر الملوك و السلاطين" ہے۔ ان کے مطابق اس طرح کا لقب یعنی "صدر الملت والدين" صرف جلال الدین محمد شاہ (818 تا 836ھ مطابق 1415 تا 1433) کے ایک کتبہ میں استعمال ہوا ہے 23 مگر باوثوق طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صوبے دار کا نام ہے یا لقب اور یہ لقب علی شیر کے لیے استعمال ہونے والے لقب سے مختلف بھی ہے۔ لہٰذا واحد لقب کے استعمال کی بنا پر علی شیر کے لیے خود مختار بادشاہ ہونے کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے۔ پروفیسر کریم نے ڈاکٹر ڈیسائی کے کتبے میں استعمال شدہ الفاظ ''ولایت العہد'' کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کے لیے بھی نکتہ چینی کی ہے اور ایف۔ اسٹنگاس کی ''فارسی انگریزی لغت جامع'' (1480، نقش چہارم، لندن 1957) کے حوالے سے ان کے معنی 'عظمت ولی عہد' بتاتے ہوئے علی شیر کو صوبے دار ہی مانا ہے۔ 24

حواشی

1 طبقات ناصری، ترجمہ از ایچ جی راوَرٹی (انگریزی)، ص 560

2 یہاں بنگال کے از منہء اُوسطیٰ کی تہذیبی اور سکہ جاتی تاریخوں کے مشہور ماہر پروفیسر عبدالکریم کا یہ بیان مدنظر رکھیے کہ ''خانقاہ کا قیام اس بات کا غماز ہے کہ اس مقام پر صوفیا کی ایک تعداد رہتی تھی جن کے لیے یہ تعمیر کی گئی تھی۔''
(کنٹمپر یری ریلیونس آف صوفی ازم، انگریزی، ص 104)

3 اسلام ان بنگلہ دیش تھرو ایجز (انگریزی) ص 37

4 ایضاً، ص 37 تا 38

5 طبقات ناصری، ص 580 تا 586

6 کارپس آف دی عربک اینڈ پرشین انسکرپشنز آف بنگال، پروفیسر عبدالکریم، انگریزی، ص 18

7 ایضاً، ص 17

8 ایضاً، ص 17

9 ایضاً، ص 18

10 ایضاً، ص 20

11 القرآن، سورنور، آیات 36 اور 37

12 اشارہ ہے صحابیوں کی اس جماعت کی طرف جو حضور نبی کریمؐ کے ساتھ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئی اور صاحب حیثیت وثروت نہ ہونے کے باعث دنیا سے کنارہ کش ہوکر مسجد نبوی میں مقیم ہوئی اور ہمہ وقت یادالٰہی میں مشغول رہتی تھی۔ تصوف اور صوفیا کی ابتدا اسی جماعت سے مانی جاتی ہے۔

13 کارپس آف دی عربک اینڈ پرشین انسکرپشنز آف بنگال، پروفیسر عبدالکریم، انگریزی، ص 18 تا 19

14 ایضاً ص 19

15 ایضاً ص 20۔ اور کنٹمپر یری ریلیونس۔ ص 106

16 ایضاً ص 35

17 کنٹمپر یری ریلیونس، ص 107

18 ایضاً ص 107-108

19 ڈاکٹر ڈیسائی کا اشارہ ہے صوفیوں کے ورود، خانقاہوں کے قیام، سلاسل کے اجرا اور ان میں عقیدت مندوں کی بیعت کی طرف۔

20 اس تاریخی نکتے کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ہندوستان میں اسلامی معاشرت وثقافت کے مشہور محقق پروفیسر عزیز احمد کا یہ بیان ذہن میں رکھیے کہ ''ہندوستان میں غیر مسلموں کے درمیان اسلام کی ترویج واشاعت کو تقریباً تمام صوفیا اور سلاسل صوفیا نے اپنی زندگی کے کسی نہ کسی دور میں اپنے اولین مقاصد میں شمار کیا ہے۔'' اسٹڈیز ان اسلامک کلچر ان انڈین انوارنمنٹ، انگریزی، ص 84۔

21 کارپس آف دی عربک اینڈ پرشین انسکرپشنز آف بنگال، پروفیسر عبدالکریم، انگریزی، ص 20

22 کنٹمپر یری ریلیونس، ص 106

23 اشارہ ہے ضلع راج شاہی کی کوتوالی گوداگری کے قریہ 'سلطان گنج' میں پائے جانے والے جلال الدین محمد شاہ کے کتبے کی طرف۔

24 کارپس آف دی عربک اینڈ پرشین انسکرپشنز آف بنگال، پروفیسر عبدالکریم، انگریزی، ص 21-22

■

Mohd Mazfoorul Haq Ansari
Darakhshan Manzil
Q- 480/1, Santosh Pur Road
Matia Burg- 700024 (West Bengal)

سرزمین الہ آباد کو آفریں باد کھتا ہوں کہ شمس الرحمن فاروقی نے زمین سخن شناسی کو اوج وعروج کی جو بلندی بخشی وہ دور حاضرمیں کسی کا نوشتۂ تقدیر نہ بن سکا۔ برصغیر میں انھیں جو وقار ملا وہ بھی دوسروں سے منسوب نہ ہوسکا۔ یہی نہیں ملک کی دوسری زبانوں میں مرحوم نے اردو کی عظمت کے اعتراف کے لیے ادیبوں کو ہم خیال وہم نوا بنایا۔ صدیوں میں کوئی حریف پیدا ہو یا نہ ہو وہ اپنے زمانے میں رشک ورقابت کا سبب ضروربنے۔

عبدالحق

دو ہمدمِ فرزانہ

شمس الرحمٰن فاروقی مرحوم ایک نازآفریں شخصیت کے مالک تھے۔ادب ودانش کے کئی زاویےان کی ذات میں مجتمع اورمربوط تھے۔مختلف اصناف اورعلوم کی جہات سے مرکب ایسی ذات نایاب نہ سہی کم یاب ضرور تھی۔ سرزمینِ الہ آبادکوآفریں باد کہتا ہوں کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے زمینِ سخن شناسی کو اوج وعروج کی جو بلندی بخشی وہ دورِحاضر میں کسی کا نوشتۂ تقدیر نہ بن سکا۔ برصغیر میں انھیں جو وقار ملا وہ بھی دوسروں سے منسوب نہ ہوسکا۔ یہی نہیں ملک کی دوسری زبانوں میں مرحوم نے اردو کی عظمت کے اعتراف کے لیےادیبوں کو ہم خیال وہم نوا بنایا۔صدیوں میں کوئی حریف پیدا ہو یا نہ ہو وہ اپنے زمانے میں رشک ورقابت کا سبب ضرور بنے۔انھیں اردواساتذہ کی کم کوشی سے شکایت تھی۔جو بے جا بھی نہ تھی۔مگر ہم اساتذہ کوان کے وجود سے بڑی طمانیت اورتفاخر کا احساس ملتا رہا درس وتدریس سے تعلق رکھنے والوں نے ان کی قدرشناسی میں کوئی کمی نہیں کی۔ ہمارے لیے مفر کی راہ بھی نہیں ہے۔ زبان ولسان کے آغاز وارتقا سے لے کر کلاسیکی ادب تا حال کی تخلیقات پر ان کے تصورات اور تحریریں محیط ہیں۔ ایسی جامعیت اور وسعتِ نگاہ مردِخود آگاہ کو ہی ملتی ہے۔ وہ جدیدیت کی تحریک کے جیالوں میں تھے۔تحریک نے گمراہی پھیلائی۔ ادب کا سنگین نقصان ہوا۔تنقید ترک کرکے تخلیق کی پہنائیوں میں پناہ نشیں ہوئے۔ داستان کی تنقید کرتے ہوئے افسانہ سرائی میں داخل ہوئے اور بے مثل مقبولیت حاصل کی۔ تاریخ کو تخیل کی قوت بخشی اوراوج آسماں سے ادب کوآشنا کیا۔ ان کی تنقیدی اورتخلیقی نگارشات پر احتساب کا عمل جاری رہے گا۔ گویا کسی نہ کسی بہانے وہ مدتوں زیر بحث رہیں گے۔ہمیں اس حقیقت کا بڑافخریہ احساس تھا کہ دیارشرق میں تثلیث ادب کے تین فرزندوں نے ادب ودانش کی سرفرازی کا رشک آفریں سرچشمہ جاری کیا تھا۔ فاروقی وصدیقی (ظفراحمد) اوررضوی (سیدمحمدعقیل) بساطِ ادب کو جہاں تاب کرگئے۔

حریفاں بادہا خوردند ورفتند تہی خم خانہا کردند و رفتند

کبھی کبھی فخرِ بے جا کا بھی منصفانہ جواز موجود ہوتا ہے اس دیارِشرق کا ماضی وحال بقول آتش ہمیشہ زربکف رہا ہے یہاں پرزیرزمیں بکھرے دانوں میں قوتِ نمواور روئیدگی روش عام ہے۔ ملاداؤد ہوں یا ملک محمد جائسی، کبیر ہوں یا تلسی داس سب کے سرچشمۂ تخلیق کے سدابہار شعری نغمے مطرب قبلہ نما کا فرض انجام دیتے رہیں گے۔ تخلیقی تسلسل نے عصرِ رواں کی شعری فضا کوبھی فروزاں کیا۔ اردو کے مایۂ ناز آفاقی فلسفی شاعر نے اسرارِخودی میں اعتراف کیا ہے۔

کشتۂ اندازِ ملا جامیم نظم ونثر او علاجِ خامیم

اس اعتراف کے باوجود وہ ملا جامی کے رنگِ سخن کی پیروی سے قاصر رہے۔طنزیہ شاعری کے مہرِ جہاں تاب اکبرالہ آباد کے طرزِ بیاں کو اپنانے کی کوشش کی جو حکیمانہ شاعری کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی یہ شاعری اقبال کوراس نہ آئی۔اقبال طنزیہ تحریر کے بے مثل فن کار رشید احمد صدیقی کے مداح اور قدرشناس تھے۔ خانوادۂ شبلی کی مایۂ نازعلمی بازیافت نے ایک عالم کوفرزانگی بخشی ہے۔فراق ومجروح اور نرالابھی اسی دیار کے رہ روانِ شوق ہیں۔ داستان سرائی میں قرۃ العین حیدر کا کوئی حریفِ سنگ نہ بن سکا۔شمس الرحمٰن فاروقی نے ان علمی روایتوں کی نگہداری کے ساتھ اپنی شناخت قائم کی۔ وہ جادۂ علم وہنر کے شوق میں مردانِ کار کی طرح بھولتے اور بھٹکتے بھی رہے۔ مگر بے برگ وساماں مدام چلتے رہنے پرکار بندرہے۔

تجھ کوتو ہی چلنا ہے کیا پوچھے ہے راہی سے

ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ تنقید وتحقیق اورتخلیق میں ہر طرف رواں دواں رہے۔ جو اکثر کسی ایک خاص میدان کا میرِلشکر بننے میں حارج ہوتا ہے۔شاہ حاتم کی یہ تاکید قابل غور ہے۔

حاتم کہے ہے تجھ سے سجن ایک جاتو رہ
آنکھوں میں آ بسو یا مرے دل میں گھر کرو

یہ طرزتفہیم وتخلیق بہت سے فن کاروں اورفرزانوں کے لیے لغزشِ پا بن گئی۔اختصاص وامتیاز کے گہرہائے شاہوارآبرومندی سے ہم کنار نہ ہوسکے۔مرحوم کی تنقیدی تحریریں، کلام میر کی شرحیں یا شاعری میں جاوداں زندگی کے عناصر بہت کم ہیں۔ داستان سرائی بھی دیرپا نظر نہیں آتی۔ یوں بھی اس آنی وفانی دنیائے بے ثبات میں کس کو قرار ہے؟ صرف ایک ذات ہے جو لافانی ولازوال ہے۔ رہے نام اللہ کا

مرحوم ناچیز کی تحریروں کو پڑھتے اوراپنے تاثرات بھی خطوط میں قلم بند کرتے۔ جنھیں شائع کیا جاچکا ہے۔شاہ

حاتم کے مقدمے کی بڑی تعریف کی۔ اقبال اور اقبالیات، اقبال کا حرف شیریں بھی انھیں پسند آیا۔ 2013 مارچ کے موسم بہار میں سول لائن الہ آباد کی مسجد میں جمعہ کی نماز میں ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت سے ملے۔ ان کے گھر کئی بار حاضر ہوا۔ گھنٹوں گفتگو ہوئی بڑا سکون ملتا۔ آپریشن کے بعد بھی حاضر ہوا۔ تفاخر کا احساس ہوتا۔ ان کے سرمایہ علمی سے مستفیض ہوتا۔ ان لمحات کو دولتِ بیدار بوجھ کر محفوظ رکھتا۔

از بزم جہاں خوشتر از حور و جناں خوشتر
اک ہم دمِ فرزانہ و زبادہ و پیمانہ

2

پروفیسر ظہورالدین کے عزیز شاگرد ڈاکٹر عبدالحق نعیمی نے فرمائش کی تھی کہ مرحوم کی خدمات پر مرتب کردہ کتاب کے بارے میں کچھ لکھوں۔ ایک مختصر تبریک میں مرحوم سے متعلق دو صفحے تحریر کیے تھے۔ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھنے کا ارادہ تھا مگر بدتوفیقی حائل رہی۔ اردو اساتذہ کی برادری میں ظہورالدین سے مجھے ایک خاص نسبت تھی۔ جو ان کے اخلاص وعمل سے مرکب تھی۔ ان کی فعالیت اور تحرک نے مجھے متاثر ہی نہیں مرعوب بھی کیا۔ وہ ایک عزمِ جواں اور پرجوش سرگرمی سے معمور شخصیت کے حامل تھے۔ درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف میں مشغولیت کے باوجود اردو کی بقا و بہبود کے لیے فکرمند رہتے۔ تنظیمی معاملات کے انتظام وانصرام میں بھی انھیں بصیرت حاصل تھی۔ جب وہ رجسٹرار ہوئے تو ناچیز نے اندیشے کا اظہار کیا کہ اردو کے پروفیسروں کو تاجِ کج کلاہی راس نہیں آتی۔ جتنے پروفیسروں کو رتبۂ بلند ملا، سب کو رسوائی سے سابقہ پڑا۔ خواہ وہ پروفیسر مسعود حسین خاں ہوں یا پروفیسر شکیل الرحمٰن یا پروفیسر حامدی کشمیری۔ مگر مرحوم نے قلم قبیلے کو آبرومندی بخشی۔ شعبے کے ہر سال مذاکروں اور مختلف محفلوں میں ان کے فکروعمل کے مشاہدات دیکھنے کو ملتے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں مختلف دانش گاہوں کے شعبہ ہائے اردو کا علمی چراغ ٹمٹمانے لگا اور اساتذہ کی علمی کم نگہی کی آہٹ دستک دینے لگی تھی مگر جموں یونی ورسٹی کے شعبے میں علمی فرزانگی کی شمع تثلیث کی صورت میں روشن تھی۔ ڈاکٹر شیام لال کالرا، ڈاکٹر منظر اعظمی اور ڈاکٹر ظہورالدین علمی میراثِ خلیل کے فرزندانِ ارجمند نے مایوس نہ ہونے دیا۔ ان تینوں کی دوستی، رفاقتِ کار اور ہمرہی کے آہنگ پر رشک آتا۔ کیونکہ اردو کے تین اساتذہ کا ہم خیال ہونا کسی عجوبے سے کم نہ تھا۔ میرے تینوں سے عزیزانہ مراسم تھے۔ مراسم کی نوعیت حبیبِ عنبردست کی تھی۔ ہر سال دو چار بار ملاقاتوں کا سلسلہ تھا۔ یہ حضرات بھی باجماعت اساتذہ کی کانفرنس میں شریک ہوتے۔ رانچی کی کانفرنس میں نصف شب کی بات تھی۔ ڈاکٹر شیام لال کالرا کی سرشار طبیعت نے سرخوشی کا مظاہرہ کیا۔ پروفیسر ظہورالدین کی دستِ مسیحائی نے ڈاکٹر شیام لال کالرا کو سکونِ خواب میں سلا دیا۔ ڈاکٹر کالرا صبح دم شرمسار تھے اور مرحوم ظہورالدین سرخرو ہو رہے تھے۔ سیکڑوں یادیں مرحوم سے وابستہ ہیں۔ جنھیں اب نہ قلم بند کرنے کی توفیق ہے اور نہ بیان کرنے کی تاب وتوانائی ہے۔ یہ بے بال وپری کا وقت ہے۔ ان دوستوں کی خوش گوار یادیں ستاتی ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی میں تین بار سلیکشن کمیٹی میں ان کے ساتھ ناچیز بھی کارشناس تھا۔ وہ صدر شعبہ کے بڑے قریبی ہم دم وہم راز بھی تھے۔ مگر خوشی ہوئی کہ انھوں نے علاقائی اور دوسری تمام نسبتوں کو درگزر کر کے میرا ساتھ دیا اور شعبے کے تین اساتذہ کا بھلا ہوا۔ پروفیسر نذیر ملک، پروفیسر مجید مضمر مرحوم اور پروفیسر عبدالقدوس جاوید منصب اعلیٰ پر فائز ہوئے۔ کئی سال سے یہ آسامیاں بوجوہ تعویق میں پڑی تھیں۔ ان تینوں عزیزوں کے جائز حقوق صدر شعبہ نے کئی برس سے سلب کر رکھے تھے۔ بھلا ہو پروفیسر جلیس ترین وائس چانسلر کا کہ جنھوں نے انتخابی کمیٹی منعقد کی۔ لکھنؤ، اورنگ آباد، ٹونک، جے پور، دہلی، بمبئی کی کانفرنسوں میں ان کی سروقدی اور فکر کی بالا بلندی ان کے مشوروں کو منوانے کے لیے شرکائے کار کو مجبور کرتی یہ ان کے فکرونظر کی بشاشت اور دردل کی کشادگی تھی۔ جو قربت ورفاقت سے سرشار بھی تھی۔ ان کی شخصیت میں مردِ کار کا جلال بھی تھا اور تحریروں میں تمثیل وتنقید کی صورت گری حسن آفرینی سے مزین ہوتی۔

ترقی پسندی کے بعد جدیدیت اور وجودیت کے پُر فریب آسیب نے اساتذہ کے بڑے حلقے کو حصار میں محبوس کیا۔ تخلیق کے بہت سے بدھومیاں بھی آندھی کے ساتھ ہوئے اور نام وناموس کھو بیٹھے۔ نشاط کار سے بھی محروم ہوئے۔ موہوم نظریہ کے دم توڑتے ہی اساتذہ اور تخلیق کارکمیں گاہوں کی تلاش میں دربہ در ہوئے۔ ایسے آشوب میں پروفیسر ظہورالدین اور ان کے احباب پروفیسر منظر اعظمی اور پروفیسر شیام لال کالرا میراثِ ادب کے محافظ بنے رہے۔

ترقی پسندی کے بعد جدیدیت اور وجودیت کے پُر فریب آسیب نے اساتذہ کے بڑے حلقے کو حصار میں محبوس کیا۔ تخلیق کے بہت سے بدھومیاں بھی آندھی کے ساتھ ہوئے اور نام وناموس کھو بیٹھے۔ نشاطِ کار سے بھی محروم ہوئے۔ موہوم نظریہ کے دم توڑتے ہی اساتذہ اور تخلیق کار کمیں گاہوں کی تلاش میں دربہ در ہوئے۔ ایسے آشوب میں پروفیسر ظہورالدین اور ان کے احباب پروفیسر منظر اعظمی اور پروفیسر شیام لال کالرا میراثِ ادب کے محافظ بنے رہے۔ یہ تینوں منہ کا مزہ بدلنے کے لیے شعر بھی کہتے رہے۔ شیام لال کالرا دوہا کے مبلغ بنے باقی دونوں کو غزل خوانی ہی یاد آتی رہی۔ ان دوستوں کی شاعری نجی محفلوں میں شریکِ محفل ہونے کے لیے ہوتی۔ ان سے پہلے ڈاکٹر منظر اعظمی کے پروفیسر ہونے پر انھیں مایوسی ہوئی مگر حفظِ مراسم کا ہمیشہ پاس رکھا۔ معاملات کو قضا وقدر کے حوالے کر کے مطمئن ہوئے۔

نہ گلا ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

شعبے میں ایک اہم مذاکرہ ہوا مجھے بھی عزت بخشی گئی۔ ناچیز نیا نیا لکچرر تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں میرے ساتھ بمبئی سے آئے ہوئے ایک مہمان کو بھی جگہ دی گئی۔ وہ مے سے غرض نشاط پرعمل پیرا تھے۔ ڈاکٹر ظہور صاحب اس نزاکت سے واقف تھے۔ مگر مجبوری بھی تھی۔ ڈاکٹر ظہور الدین صبح کو تشریف لائے اور مجھے مطمئن دیکھ کر محظوظ ہوئے۔ معذرت بھی کی۔ میزبان کی پشیمانی سے مجھے مسرت ہوئی خاص طور پر طرز ندامت دیکھ کر سروقد کو سلام کرتا رہا۔ جب وہ صدر ہوئے تو نصابی کمیٹی میں شریک ہوا۔ رات کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ ان کی رہائش شہر کے گنجان علاقے میں تھی جو دوکانوں سے گھرا ہوا تھا۔ ان کی جلوت پسندی اچھی لگی۔ بازار سے نکلتے وقت سلام وپیام کی بارش کا منظر دیدنی تھا۔ وہ اس فرطِ محبت کا جواب دیتے اور خیروخیریت دریافت کرتے۔ اردو کے کسی استاد کا شہر میں آبرومند کا یہ مظاہرہ کم دیکھا وہ کسی کے مصاحب تھے اور نہ ہی فقیہ شہر کے مرید ومبلغ، بزرگوں نے کسی شخصیت کو پرکھنے کا ایک پیمانہ بشر اور بازار سے معاملات کو بھی بتایا ہے۔ ان کی زندگی کے مجاہدات کی کہانی بھی دل چسپ ہے اور دل نواز بھی۔

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

■

Prof. Abdul Haq
2315, Ground Floor, Hudson Lane
Kingsway Camp
Delhi - 110009
Mob.:9350461394

محمد مظاہر

امداد صابری

حیات وخدمات

امداد صابری بچپن سے ہی انقلابی ذہن کے آدمی تھے اور اپنے سینے میں ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ ظلم اور ناانصافی کو کبھی بھی پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فریضہ تصور کرتے تھے۔ ان کی عمر محض سترہ برس کی ہی تھی کہ انھوں نے ایک پولس افسر کو اس وقت دھکا دے دینا چاہا جب وہ ایک خاتون پر ڈنڈا چلانے کی کوشش میں تھا۔ ان کے اس اقدام پر اس انگریزی پولس افسر نے ان کی زدوکوب کیا تھا اور وہ بیہوش ہوگئے تھے۔

امداد صابری کی پیدائش ہندوستان کی راجدھانی، دہلی کے معروف علاقہ چوڑی والان کے چوراہے پر واقع ایک چھوٹے سے مکان میں ہوئی۔ پورا گھرانہ علمی قمقموں کی روشنی سے جگمگ تھا۔[1] ان کے دادا قاری جلال الدین خدا رسیدہ بزرگ اور انگریزی حکومت کے سخت مخالف تھے۔ لال قلعے میں ان کی آمد ورفت تھی اور یہ بہادر شاہ ظفر کے خاص معتمدین میں سے تھے۔[2] امداد صابری کے والد مولانا شرف الحق بھی مشہور روحانی شخصیت مولانا رحیم بخش کے تربیت یافتہ تھے۔ مولانا شرف الحق کی تعلیم وتربیت ملک کے مشہور ومعروف ادارہ دارالعلوم دیوبند میں ہوئی تھی۔ ان کے مشہور اساتذہ میں مولانا رشید گنگوہی کا نام سرفہرست ہے۔ ان بڑے اساتذہ کے روحانی فیوض کا اثر یہ ہوا کہ مولانا شرف الحق اپنے وقت کے بڑے علما میں شمار ہوتے تھے۔ وہ عربی وفارسی کے علاوہ عبرانی اور سنسکرت جیسی زبانوں میں ید طولی رکھتے تھے۔ وقت کے بڑے بڑے پادری ان کی صلاحیت کے قائل تھے اور ان سے مناظرہ کرنے سے ڈرتے تھے۔[3] مولانا شرف الحق کو کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ بڑی دعاؤں کے بعد 16 اکتوبر 1914 کو مولانا امداد صابری نے اس عرصہ ہستی میں قدم رکھا۔ چونکہ ان کو اپنے استاد حاجی امداد اللہ اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے بڑی عقیدت تھی اس لیے انھوں نے اپنے فرزند کا نام اپنے استادوں کے نام پر امداد الرشید رکھا۔ پنڈت ہرسروپ شرما اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا شرف الحق صاحب مرحوم کو اپنے پیر حضرت حاجی امداد اللہ اور اپنے استاد مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیحد عقیدت ومحبت تھی۔ آپ کے نرینہ اولاد نہیں ہوئی تھی۔ بڑی دعاؤں کے بعد 16 اکتوبر 1914 کے جنگی دور میں مولانا امداد صابری پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے فرزند کا نام پیرو استاد کے نام پر امداد الرشید رکھا۔ ان دونوں انقلابی ناموں کے اثرات مولانا امداد صابری کی زندگی پر بھی پڑے۔''[4]

10 سال کی چھوٹی عمر میں انھیں انگریزی زبان میں تعلیم دی گئی۔ انھوں نے سہارنپور میں فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے 1930 میں پنجاب یونیورسٹی سے کالج کی تعلیم مکمل کی۔ بعدازاں انھوں نے 1937 میں جیل کے احاطے میں ہندی زبان سیکھی اور ادب میں دلچسپی پیدا کی۔ مولانا امداد صابری نے ادیب، فاضل وغیرہ کا امتحان پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جامعہ ازہر جانے کا ارادہ تھا اور اس سلسلے میں کارروائی چل ہی رہی تھی کہ والد مولانا شرف الحق کا انتقال 28 جنوری 1936 میں ہوگیا اور پھر گھر کی ساری ذمے داری ان کے سر پر آگئی۔ پنڈت ہرسروپ شرما لکھتے ہیں:

''مولانا امداد صابری ادیب، فاضل وغیرہ کا امتحان دے چکے تھے۔ ان کے والد ان کو جامعہ ازہر (مصر) بھجوانے کے لیے پاسپورٹ بنوانے کی تیاریاں کررہے تھے کہ ان کے والد کا انتقال 28 جنوری 1936 کو ہوا۔ گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ان پر پڑگئی۔''[5]

امداد صابری بچپن سے ہی انقلابی ذہن کے آدمی تھے اور اپنے سینے میں ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ ظلم اور ناانصافی کو کبھی بھی پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فریضہ تصور کرتے تھے۔ ان کی عمر محض سترہ برس کی ہی تھی کہ انھوں نے ایک پولس افسر کو اس وقت دھکا دے دینا چاہا جب وہ ایک خاتون پر ڈنڈا چلانے کی کوشش میں تھا۔ ان کے اس اقدام پر اس انگریزی پولس افسر نے ان کی زدوکوب کیا تھا اور وہ بیہوش ہوگئے تھے۔ اس کی تفصیل پنڈت ہرسروپ شرما کی کتاب میں اس طرح ہے:

''مولانا امداد صابری کی سترہ برس کی عمر ہوگی غالبا 1930 یا 1931 کا واقعہ ہے کہ یہ شام کے وقت کوتوالی کے سامنے ایک کانگریسی جلوس اور پولس کا تصادم کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے کہ اتنے میں ایک انگریزی پولس افسر نے ایک جوان لڑکی پر، ڈنڈا مارنے کے لیے اٹھایا تو مولانا صابری نے اس انگریزی پولس افسر کو دھکا دینے کی کوشش کی۔ پولس افسر سنبھلا اور اس نے پوری قوت سے مولانا صابری کے سر پر ڈنڈا کھینچ کر مارا۔ مولانا صابری فوراً زمین پر گر گئے اور بیہوش ہوگئے۔ بھیڑ میں بھگدڑ مچ

گئی۔ دوتین گھنٹے کے بعد راگیروں نے مولانا صابری کے گھر کا پتہ دریافت کر کے ان کے گھر پہنچا دیا۔"[6]

ماحول کا اثر حساس شخصیتوں پر بہت تیزی سے پڑتا ہے۔ امداد صابری جب 21 یا 22 برس کے تھے کہ ملک کے حالات نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ قوم کی ناگفتہ بہ حالت نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اس جانب متوجہ ہوں۔ اوقاف کی حالت اس وقت نہایت خراب تھی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اگر ان کا صحیح استعمال کیا جائے تو قوم کی اقتصادی حالت مضبوط و مستحکم ہوسکتی ہے۔ انھوں نے اوقاف کی حفاظت اور اس کے صحیح استعمال کا بیڑا اٹھایا اور انھوں نے 1936 میں دہلی کی جامع مسجد کے مکبر پر اصلاحی تقریریں کرنی شروع کر دیں۔ آگے چل کر بات اتنی بگڑ گئی کہ 1937 میں انھیں پولس نے دفعہ 107 نقض امن کے تحت گرفتار کرلیا اور پھر بعد میں ایک ہزار روپیہ کی ضمانت پر رہا کر دیا۔ پنڈت ہرسروپ شرما رقمطراز ہیں:

"آپ نے دیکھا کہ قوم کی حالت ناگفتہ ہے اور انتہائی برے مدارج پر پہنچ گئی ہے تو آپ سے نہ رہا گیا۔ آپ نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی کی وجہ شریف ٹولیاں اور اڈے ہیں جو مسلمانوں کے اوقاف پر قابض ہیں اور مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اوقاف کے سرمایے کی حفاظت اور اس کے صحیح مصرف کرانے کا بیڑا اٹھایا اور 1936 میں جامع مسجد دہلی کے مکبر پر اصلاحی تقریروں کا سلسلہ شروع کیا... جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 9 جولائی کو نماز جمعہ سے قبل جامع مسجد کے اردگرد تقریباً پانچ سو پولس کی جمعیت نے مولانا صابری کو جامع مسجد دریبہ والے دروازے سے داخل ہوتے وقت دفعہ 107 نقض امن کے تحت گرفتار کر لیا جس میں سال بھر کی ضمانت ایک ہزار روپیہ کی لی گئی۔"[7]

امداد صابری نے متعدد سیکولر سیاسی جماعتوں کے انتخابی نشان پر الیکشن میں قسمت آزمائی۔ بیشتر انتخابات میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ وہ دہلی کارپوریشن کے ڈپٹی میئر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔[8] انھوں نے دہلی میونسپل کمیٹی میں قابل ستائش کام کیا اور لوگوں کو ان معاملات میں دلچسپی لینے کے لیے متحرک کیا جو ان کے علاقوں میں بہتری کے متقاضی تھے۔ انھوں نے شہر میں بجلی کی مقامی فراہمی کی حمایت میں بھی آواز بلند کی۔ ان کی طرف سے چلائی جانے والی دیگر تحریکوں میں ٹرام چلانے کے خلاف تحریک،[9] ہاؤس ٹیکس کو دوگنا کرنا[10]، سائیکل ٹیکس کا خاتمہ، ایک لاکھ روپے کے سرمائے پر اناج کی دکانیں کھولنا[11]، اور ہفتہ اخبار چنگاری کی اشاعت

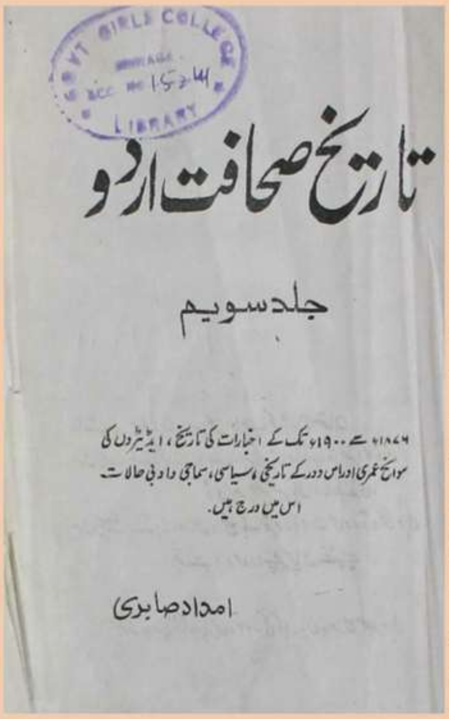

شامل تھی۔ انھیں 15 اگست 1942 سے 30 نومبر 1943 تک گھر میں نظر بند رکھا گیا۔

ضمانت پر ہونے کے باوجود، انھیں گرفتار کرلیا گیا اور 1945 میں نیتا جی سبھاش چندربوس کے جاپانی ساتھیوں کی مدد کرنے کے الزام میں انھیں شاہی قیدی بنا دیا گیا[12]۔ انھوں نے نیتا جی کے ساتھیوں کو اپنے گھر پر رکھا اور ان کے لیے ریلوے اسٹیشن تک پہنچنے کا انتظام کیا۔ چونکہ یہ الزام ثابت نہیں ہو سکا اس لیے ان پر دوسرے الزامات کے تحت مقدمہ چلایا گیا اور انھیں 13 ماہ کی سزا سنائی گئی۔[13] اس مدت کو سیشن کورٹ نے منسوخ کر دیا۔ اس طرح انھوں نے دہلی جیل، ملتان جیل میں وقت گزارا اور فیروز پور میں گھر میں نظر بند بھی رہے۔[14]

امداد صابری ایک بڑے مجاہد آزادی بھی تھے۔ انھوں نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا۔ جب ہندوستان میں 1942 کے اندر جنگ آزادی کی آخری تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ اس جرم کی پاداش میں گرفتار بھی ہوئے اور نظر بند بھی کیے گئے۔[15]

مولانا امداد صابری گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک طرف وہ اگر سیاست داں اور مجاہد آزادی تھے تو دوسری طرف وہ کہنہ مشق صحافی اور ادیب بھی۔ ان کی صحافتی زندگی حکومت سے پنجہ آزمائی سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنے قلم کے ذریعے حالات پر بے لاگ تبصرہ کیا۔ جہاں جس طرح کی خرابی نظر آئی اس پر نوک قلم سے حملہ بول دیا۔ جیل کے اندر خرابی نظر آئی تو اس جانب بھی حکومت کو متوجہ کیا۔ مزدوروں پر ظلم ہوا تو اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ محکمہ پولس میں خرابی نظر آئی تو اس پر خامہ فرسائی کی۔ تعلیم کے شعبے میں اگر کچھ خامیاں نظر آئیں تو اس جانب بھی اشارہ کیا۔ غرض کہ ایک سچے صحافی کا فریضہ ادا کیا۔ امداد صابری نے تقریباً آٹھ اخبارات نکالے یا ان میں بحیثیت ایڈیٹر اپنی خدمات پیش کیں۔ ان اخبارات میں شائع خبروں و مضامین کے اچھے اثرات مرتب ہوتے تھے اور حکومت کے محکموں میں اصلاح کا کام بھی ہوتا تھا۔

امداد صابری نے سب سے پہلے 1940 میں ہفتہ وار اخبار اتحاد کے ایڈیٹر کی ذمے داری نبھائی۔ دہلی میں 1947 سے قبل کوئی اسمبلی نہیں تھی اور میونسپل کمیٹی ہی اسمبلی کی طرح کام کرتی تھی۔ اخبار اتحاد نے میونسپل کمیٹی کی خرابیوں کی نشاندہی کی اور ساتھ ہی ساتھ جامع مسجد اور فتح پوری کی منتظمہ کمیٹی کی بدعنوانیوں کو بھی اجاگر کیا۔ اس اخبار کی نکتہ چینی کے سبب جامع مسجد اور مسجد فتح پوری کمیٹی کو اصلاحی رویہ اختیار کرنا پڑا۔ چیف کمشنر کا محکمہ بھی اس اخبار کی خبر پر حرکت میں آجاتا تھا۔[16]

اخبار اتحاد جب فروری 1947 میں بند ہوگیا تو امداد صابری اخبار 'تیغ' کی ادارتی ٹیم میں شامل ہوگئے۔ یہ اخبار صابری صاحب کے پرانے دوست علامہ ابوالبیان آزاد نکالتے تھے۔ یہ ماہانہ اخبار تھا جو بعد میں ہفتہ واری ہوگیا تھا۔ پنڈت ہرسروپ شرما لکھتے ہیں:

"اخبار اتحاد فروری 1947 میں بند ہوگیا تھا۔ صابری صاحب کے قدیمی دوست علامہ ابوالبیان آزاد ہفتہ وار تیغ اخبار نکالتے تھے۔ یہ پہلے ماہانہ رسالہ تھا بعد میں ہفتہ واری ہوگیا تھا۔ آزاد صاحب کے ایما اور خواہش پر صابری صاحب اس کی ادارت میں شامل ہوئے۔"[17]

امداد صابری نے ہفتہ وار اخبار 'چنگاری' کی بھی ادارت کی۔ اس اخبار کے مالک عبداللہ شمیم تھے جو امداد صابری کے دیرینہ دوست تھے۔ امداد صابری اس اخبار کی ادارت پانچ چھ مہینے ہی کر پائے کیونکہ انھیں پھر نظر بند کر دیا گیا۔ مذکورہ تینوں اخبارات میں امداد صابری نے اعزازی کام کیا تھا۔[18]

1947 میں جب مسلم لیگ اور کانگریس کی مشترکہ حکومت بنی تو امداد صابری نے 9 مئی 1947 کو اپنا ذاتی ہفتہ واری اخبار 'قومی حکومت' نکالا۔ قومی حکومت کا آخری پرچہ 23 اگست 1947 کو شائع ہوا۔ اس کے بعد ملک میں فسادات شروع ہوگئے اور اس اخبار کا نکلنا مشکل ہوگیا۔ اس اخبار کا آخری شمارہ 7 اکتوبر 1947 کو منظر عام پر آیا اور پھر یہ اخبار بھی بند ہوگیا۔ ایک سال بعد 17 کتوبر 1948 کو یہ اخبار دوبارہ جاری ہوا۔[19]

1949 میں جب ماہانہ رسالہ 'آزاد ہندوستان'

جاری ہوا تو امداد صابری اس کے مدیر بنے۔ اس اخبار میں حالات حاضرہ، کسٹوڈین اور میونسپل کمیٹی اور محکمہ پولس وغیرہ کی بدعنوانیوں کی خبر کے ساتھ ساتھ ادبی، تاریخی اور سیاسی مضامین بھی شامل ہوتے تھے۔[20] 11 جولائی 1952 کو انھوں نے اپنا ذاتی ہفتہ وار اخبار 'انگارہ' جاری کیا۔ اس اخبار کی عمر بھی بہت رہی اور دو مہینے کے قلیل عرصے میں یہ بھی بند ہوگیا۔ اس اخبار کے کل آٹھ شمارے ہی نکل پائے۔ آخری شمارہ 14 نومبر 1952 کو شائع ہوا تھا۔[21]

1954 میں انھوں نے ایک اور ہفتہ واری اخبار 'جماعت' جاری کیا۔ یہ اخبار بھی انگارہ کا ہم عمر ہوکر لقمہ اجل بن گیا۔ 10 ستمبر 1954 کو اس اخبار کا آخری شمارہ شائع ہوا تھا۔ اس اخبار کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں ایک نئی بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ تذکرہ شعرائے دہلی مرتب کیا جائے گا اور بالاقساط شعرا کے حالات اور ان کے کلام شائع کیے جائیں گے اور پھر انھیں کتابی شکل دی جائے گی۔ اس اخبار میں جگن ناتھ آزاد، حافظ منیرالدین منیر دہلوی اور حکیم رفیق احمد رسا دہلوی کے حالات زندگی اوران کے کلام کو شائع کیا گیا۔[22]

20 جنوری 1956 میں امداد صابری نے 'عوامی رائے' دہلی سے شائع کیا۔ یہ اخبار ایک سال تک تواتر کے ساتھ شائع ہوتا رہا اور بالاخر یہ بھی بند ہوگیا۔ اس اخبار کا آخری شمارہ 28 دسمبر 1956 کو منظر عام آیا تھا۔[23]

امداد صابری نے درجنوں کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

تاریخ صحافت اردو (تین جلدوں میں)، تاریخ جرم وسزا (تین جلدوں میں)، فرنگیوں کا جال، داستان پر غم، تاریخ آزاد ہند فوج، نیتا جی سبھاش چندر بوس کے ساتھ، سبھاش بابو کی تقریر، آزاد ہند فوج کا البم 1857 کے مجاہد شعرا، 1857 کے غدار شعرا، حاجی امداداللہ اوران کے خلفا، رسول خدا کا دشمنوں سے سلوک، رسول خدا کی غریبوں سے محبت، فیضان رحمت، دہلی کی یادگار شخصیتیں، دہلی کے قدیم مدارس اور مدرّس، سیاسی رہنماؤں کی مائیں اور بیویاں، اللہ کے گھر میں بار بار حاضری، اخبار مخبر عالم مراد آباد اور تحریک آزادی، آثار رحمت، جنوبی افریقہ کے اردو شاعر روح صحافت۔[24]

امداد صابری دیواری صحافت سے بھی شغف رکھتے تھے۔ وہ نہایت خوبصورت پوسٹر لکھا کرتے تھے۔ پوسٹروں کی زبان بڑی شستہ ہوتی تھی اور یہ نہایت دیدہ زیب ہوا کرتے تھے۔ یہ پوسٹر راتوں کو جاگ جاگ کر لکھے جاتے اور صبح فجر سے قبل دیواروں پر چسپاں کردیے جاتے۔ مولانا کا پوسٹر سب سے پہلے آیا کرتا تھا۔ ظفر انور اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''مولانا دہلی کی دیواری صحافت و سیاست یعنی پوسٹروں میں بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے، مولانا کا پوسٹر منفرد ہوتا، زبان و بیان کے علاوہ انتہائی خوبصورت و دیدہ زیب تو ہوتا ہی تھا حالات کے تناظر میں لوگوں کے لیے نوشتہ دیوار بھی ثابت ہوتا تھا۔ دہلی کے پوسٹروں کی صحافت کا دور بھی بڑا ہی دلچسپ تھا۔ رات بھر جاگ کر تیاری ہوتی اور صبح فجر سے قبل ہی یہ پوسٹر دیواروں پر آویزاں کر دیے جاتے تھے۔ مولانا کا پوسٹر سب سے پہلے سامنے آتا تھا۔ یہ سلسلہ بہت قدیمی تھا جو مولانا کے دور تک ہی اپنی معنویت کے ساتھ قائم رہ سکا۔''[25]

امداد صابری 74 سال کی عمر میں 13 اکتوبر 1988 کو اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ دہلی کے مہندیان کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔[26] ان کے دو فرزند شرف صابری اور احمد صابری دہلی میں قیام پذیر ہیں۔ دونوں ہی اپنے والد گرامی کی روایتوں کے امین و پاسبان ہیں۔[27] ان کے شاگردوں میں دہلی کے مشہور صحافی قاری محمد میاں مظہری کا نام بھی لیا جاتا ہے۔[28]

امداد صابری کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ ان میں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ ہمہ وقت دوسروں کے کام میں مصروف رہا کرتے۔ اپنے ساتھ مہر اور پیڈ لے کر چلا کرتے۔ جس نے بھی اپنی ضرورت کا فارم آگے بڑھایا فوراً دستخط کر کے مہر ثبت کر دیا۔ گرمیوں کے دنوں میں بجلی گل ہونے کی صورت میں دستی پنکھا کا استعمال کرتے اور اپنے کام میں مصروف رہتے۔

مولانا امداد صابری سچے اور پکے مجاہد آزادی اور سبھاش چندر بوس سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ بیباک صحافی، کہنہ مشق ادیب اور مجاہد صفت سیاست داں تھے۔

حوالہ جات

1 دہلی کے پچاس صحافی، ظفر انور، ص 230 اصیلہ آفسیٹ پریس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی 2015
2 مختصر حالات زندگی مولانا امداد صابری، ص 2، پنڈت ہرسروپ شرما، کھنہ پریس، دہلی
3 ایضا، ص 4
4 ایضا، ص 5
5 ایضا، ص 5
6 مختصر حالات زندگی مولانا امداد صابری، ص 5 پنڈت ہرسروپ شرما، کھنہ پریس، دہلی
7 ایضا، ص 5-7
8 دلی جوایک شہر ہے، ظفر انور، ص 90 شالیمار آفسیٹ پریس، کوچہ چیلان، نئی دہلی، 2019، دہلی کے پچاس صحافی، ظفر انور، ص 234، اصیلہ آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی، 2015
9 مختصر حالات زندگی مولانا امداد صابری ص 20-19، پنڈت ہرسروپ شرما، کھنہ پریس، دہلی
10 ایضا، ص 31
11 ایضا، ص 38
12 ایضا، ص 11
13 ایضا، ص 11
14 ایضا، ص 11
15 ایضا، ص 63
16 مختصر حالات زندگی مولانا امداد صابری، ص 59-58، پنڈت ہرسروپ شرما، کھنہ پریس، دہلی
17 ایضا، ص 62
18 ایضا، ص 64
19 ایضا، ص 71
20 ایضا، ص 76-75
21 ایضا، ص 84-83
22 ایضا، ص 84
23 ایضا، ص 84
24 دہلی کے پچاس صحافی، ظفر انور، ص 87، شالیمار آفسیٹ پریس، کوچہ چیلان، نئی دہلی، 2015 مختصر حالات زندگی مولانا امداد صابری، ص 46,55، پنڈت ہرسروپ شرما، کھنہ پریس، دہلی، دلی جوایک شہر ہے، ظفر انور، ص 87 شالیمار آفسیٹ پریس، کوچہ چیلان، نئی دہلی، 2019
25 دلی جوایک شہر ہے، ظفر انور، ص 90، شالیمار آفسیٹ پریس، کوچہ چیلان، نئی دہلی، 2019، دہلی کے پچاس صحافی، ظفر انور، 233، اصیلہ آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی، 2015
26 دہلی کے پچاس صحافی، ظفر انور، ص 239، اصیلہ آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی، 2015 دلی جوایک شہر ہے، ظفر انور، ص 86 شالیمار آفسیٹ پریس، کوچہ چیلان، نئی دہلی، 2019
27 دلی جوایک شہر ہے، ظفر انور، ص 87، شالیمار آفسیٹ پریس، کوچہ چیلان، نئی دہلی، 2019، دہلی کے پچاس صحافی، ظفر انور، 231، اصیلہ آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی، 2015
28 دلی جوایک شہر ہے، ظفر انور، ص 87، شالیمار آفسیٹ پریس، کوچہ چیلان، نئی دہلی، 2019، دہلی کے پچاس صحافی، ظفر انور، 230، اصیلہ آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی، 2015

Mohd Mazahir
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

انیس الحسن صدیقی

بیرونی سیاروں[1] کی دریافت کس طرح کی جاتی ہے

اس صدی کے نوجوان بہت ہی خوش قسمت ہیں کیونکہ وہ سائنس اور تکنیک کی صدی میں پل بڑھ رہے ہیں۔ یہ ان کے لیے علم فلکیات کا سنہرا دور ہے۔ علم فلکیات میں روز بہ روز دریافتوں کا انبار لگتا چلا جا رہا ہے۔ سائنسداں اور تکنیکی ماہروں نے کائنات کے بارے میں اچھی طرح جان لیا ہے کہ کائنات کی کوئی حد نہیں ہے اور کائنات میں نہ ختم ہونے والا خزانہ موجود ہے۔ بس ضرورت ہے کہ کون اس مینا کو بڑھ کر اٹھاتا ہے۔ لہٰذا وہ ملک بہت ہی تیزی سے ترقی کر رہے ہیں جو علم فلکیات میں دن اور رات کام کر رہے ہیں۔ اب اپنے ملک کو شدید ضرورت ہے کہ علم فلکیات کو عام اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا جائے اور اس میدان میں دن اور رات کام کیا جائے۔ شہید راشٹریہ پتا مہاتما گاندھی جی کا بھی یہی خواب تھا کہ ہندوستان کے تمام اسکولوں اور کالجوں میں علم فلکیات ہر طالب علم کو اس کی مادری زبان میں دستیاب ہو۔ وہ خود بھی اس علم میں دلچسپی رکھتے تھے اور قید کے دوران آسمانی اجرام کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔

آج کل دنیا کے فلکیاتی ماہرین اور سائنسداں اپنی زمین جیسے بیرونی سیاروں کی تلاش میں منہمک ہیں۔ ان کو پوری امید ہے کہ ایک نہ ایک دن کائنات میں کہیں نہ کہیں ہمارے جیسی ذہین زندگی مل جائے گی۔ اس تلاش میں روز بہ روز سائنسی اور تکنیکی آلات بہتر سے بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا اثر انسانی زندگی کی بہتری پر پڑ رہا ہے۔ اس زمین پر انسانی زندگی بہتر سے بہتر ہوتی جا رہی ہے۔

حال ہی میں دنیا کے فلکیاتی اور تکنیکی ماہرین کی ایک ٹیم نے ہماری زمین جیسا چٹانی سیارہ سورج کے پڑوسی ستارہ نیر قنطورس (Proxima Centaury) کے نظام میں دریافت کیا ہے۔ ستارہ نیر قنطورس، سورج کے سب سے نزدیک ستاروں میں سے ایک ہے۔ یہ سورج سے صرف 4 نوری سال[2] کے فاصلہ پر موجود ہے۔ اس کا اپنا ایک سیاروی نظام[3] ہے۔

اگست 2016 میں ستارہ قنطورس کے سیاروی نظام میں سیارہ قنطورس۔بی دریافت ہوا تھا۔ جنوری 2020 میں سیارہ قنطورس۔سی دریافت ہوا تھا۔ جنوری 2022 میں سیارہ قنطورس۔ڈی دریافت ہوا ہے۔ 10 فروری 2022 میں امریکہ کے مشہور رسالہ اسٹرونامی و فلکیاتی طبیعیات میں ستارہ نیر قنطورس کے گرد ایک ننھا سیارہ قنطورس۔ڈی دریافت ہونے کا اعلان شائع ہوا ہے۔ اس اعلان کے مطابق یہ سیارہ ہماری زمین جیسا چٹانی سیارہ ہے۔ گو کہ اس کا مادہ ہماری زمین کے مادے کا ایک چوتھائی ہے۔ یہ سیارہ ستارہ نیر قنطورس کے رہائشی علاقے میں پایا گیا ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح ہماری زمین سورج کے رہائشی علاقے میں موجود ہے۔ اس سیارے پر مائع پانی پایا گیا ہے۔ ابھی اس سیارے کی باقی تفصیلات موصول نہیں ہوئی ہیں لیکن تحقیق دانوں کو ان دو خاصیتوں کی بنا پر ان کو اس سیارے پر ہماری جیسی ذہین زندگی کی بھرپور امید ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تحقیق دانوں نے کس طریقے سے معلوم کیا کہ اس ستارے کے سیاروی نظام میں کون کون سے سیارے ہیں؟

چلی میں یورپی جنوبی رصد گاہ (European Southern Observatory) کی ایک بہت ہی بڑی دوربین جدید آلات کے ساتھ نصب ہے۔ اس دوربین پر فلکیاتی ماہرین اور تحقیق داں دن رات کام کرتے ہیں۔ اس دوربین پر ایک خاص آلہ ایکلے اسپیکٹروگراف (Echelle Spectrograph) بھی نصب ہے۔ اس آلے کے ذریعے کسی بھی ستارے کے طیف (Spectrum) کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ دوربین کے ذریعے ستارے کا مستقل مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ مشاہدے کے دوران اگر ستارہ اپنے مرکز سے ڈگمگاتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ اس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ اس کے گرد کوئی بھاری مادے والا جرم اپنی کشش کے ذریعے اس ستارے کو اپنے مرکز پر ڈگمگا رہا ہے۔ ایچلے اسپیکٹروگراف کے ذریعے اس ستارے کے

1 بیرونی سیارہ (Exoplanet) جس طرح سورج کے گرد گردش کرتے ہوئے جرم کو سیارہ کہا جاتا ہے بالکل اس طرح دوسرے تمام ستاروں کے گرد گردش کرتے ہوئے جرم کو بیرونی سیارہ کہا جاتا ہے۔

2 نوری سال (Light year) کائنات میں روشنی سب سے تیز سفر کرتی ہے۔ اس کے جیسے کسی کی چال نہیں ہے۔ سائنسدانوں نے اس کی رفتار کو ناپنے کا تجربہ کیا ہے اور پایا ہے کہ یہ تقریباً 3 لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کے حساب سے سفر کرتی ہے۔ اس لیے ایک سال میں یہ جتنا سفر کرتی ہے اس کو نوری سال کہا گیا ہے یعنی 9.46 کھرب کلومیٹر۔

3 سیاروی نظام (Planetary aystem) جس طرح سورج ک نظام کو نظام شمسی کہا جاتا ہے بالکل اسی طرح دوسرے ستاروں کے نظام کو سیاروی نظام کہا جاتا ہے۔

طیف کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔اس ستارہ کا طیف اگر نیلے رنگ سے لال رنگ میں تبدیل ہوتا ہے تو یہ ڈوپلر شفٹ[4] کہلاتا ہے۔ یہ طیف ستارے کے گرد ستارے کو ڈگمگانے والے جرم کا پتہ دیتا ہے۔اگر ڈگمگانے والے جرم کا مادہ ستارے کے مادے سے کم ہوتا ہے تو تو وہ کوئی دوسرا ستارہ نہیں بلکہ اس ستارہ کا سیارہ ہی ہوتا ہے۔اس آلے کے ذریعے ستارے کو ڈگمگانے والے جرم کا مادہ اس ستارے سے اس کے درمیان کے فاصلے کا پتہ لگتا ہے۔ایسا بھاری سیارہ نظام شمسی کے سیارہ مشتری (Jupiter) جیسا ہوتا ہے۔جب تحقیق دانوں کو ستارے کے سب سے بھاری مادہ والے سیارے کا مادہ اور دونوں کے درمیان کا فاصلہ پتہ معلوم ہوجاتا ہے تو کیپلر[5] کے قوانین کے مطابق ستارے کے باقی سیاروں کے مادوں اور درمیانی فاصلوں کا پتہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔پھر اس ستارے کے تمام سیاروں کی دوربین کی مدد سے نشاندہی کی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر 1995 میں تحقیق دانوں نے ایک اورنزدیکی ستارہ فرس اعظم(Pegasus) کا اسی دوربین سے مشاہدہ کیا تھا۔

دوربین کے مشاہدے نے اس ستارے کا ڈگمگاتے ہوئے مشاہدہ کیا تھا۔پھر اس آلے کے ذریعے ستارہ فرس اعظم کے طیف کا مطالعہ کر کے اس کے سب سے بھاری مادے والے سیارے کی نشاندہی ڈوپلر شفٹ کے ذریعے کی گئی تھی۔اس کے طیف کے ذریعے ستارے کے اس بھاری والے مادہ سیارہ کا مادہ اور اس کے ستارہ کے درمیان کا فاصلہ بھی پتہ لگایا گیا تھا۔ پھر کیپلر کے قوانین کے مطابق باقی کے تمام سیاروں کی نشاندہی کی گئی تھی۔

بالکل اسی طرح ستارہ نیر قنطورس کے سیاروں کا پتہ چلا تھا۔اس ستارے کا مستقل مشاہدہ کرنے سے پتہ چلا کہ یہ اپنے مرکز سے تھوڑا ڈگمگا رہا ہے۔ تحقیق دانوں کو یقین ہوگیا کہ ضرور اس ستارے کے سب سے بھاری مادے کا سیارہ جو اس کے گرد گردش کر رہا ہے اس کے مادہ کی کشش کی وجہ سے ستارہ اپنے مرکز سے تھوڑا ڈگمگا رہا ہے۔ ڈوپلر شفٹ کے ذریعے اس بھاری مادہ والے سیارے کا مادہ اور ستارہ اور اس کے درمیانی فاصلہ کا پتہ چلا۔ یہ بھاری مادہ والا سیارہ بھی نظام شمسی کے سیارہ مشتری جیسا تھا۔کیپر قوانین کے مطابق ان دونوں معلومات سے باقی کے سیاروں کی نشاندہی ہوئی ہے۔

آج تک تقریباً 400 ایسے ستاروں کے سیارے دریافت ہوئے ہیں جو نظام شمسی کے سیارہ مشتری جیسے ہیں۔آسمان میں ایسے ستارے اپنے مرکز سے تھوڑا ڈگمگانے کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ کائنات میں ایسے ستارے بھی ہیں جن کے بھاری مادہ والے سیارے نہیں ہیں۔ایسے ستاروں کی تعداد زیادہ ہے۔ضروری نہیں کہ ہر ستارہ نظام شمسی جیسا ستارہ ہو۔کسی ستارے کے دو سیارے بھی ہو سکتے ہیں تو کسی کے تین یا چار بھی ہو سکتے ہیں۔ تعداد متعین نہیں ہے۔

ایسے ستاروں کی تلاش کس طرح کی جاتی ہے؟

ایسے ستاروں کی تلاش قران سیارہ (Transit of planet)[6] سے کی جاتی ہے۔

قران سیارہ:

سب سے زیادہ سیاروں کی تلاش کیپلر خلائی دوربین کے ذریعے کی گئی تھی۔ یہ خلائی دوربین 2009 میں خلا میں داغی گئی تھی۔اس دوربین کو خاص طور پر قران سیارے کی تلاش کے لیے ڈیزائین کیا گیا تھا۔اس دوربین نے خلا میں تقریباً تین سال کا عرصہ گزارہ تھا۔اس نے خلا میں شروعات ایک دھبے سے کی تھی۔ خلا میں یہ دھبہ ستاروں سے بھرا ہوا تھا لیکن خاص طور پر یہ چمکدار مثال سے خالی تھا۔ یہ آسمان کے شمالی حصے میں مجمع النجوم دجاجہ (Cygnus) اور مجمع النجوم شلیاق (Lyra) کے درمیانی حد پر تھا۔کیپلر خلائی دوربین نے ہر 30 منٹ میں تقریباً 150 ستاروں کی چمک ناپی اور ہر منٹ پر چنے ہوئے نظاموں کی ایک چھوٹی تعداد کا مشاہدہ کیا تھا۔اس خلائی دوربین کا ارادہ ان سیاروں کی تلاش تھا جہاں ہماری جیسی ذہین زندگی شاید موجود ہوسکتی تھی یعنی سیاروی دنیائیں سورج جیسے ستاروں کے گرد خاص طور پر ستارہ سے ایک فاصلے پر درجۂ حرارت، مائع پانی کی اجازت دیتا ہو۔

ناسا کا ایک نیا سیٹلائٹ ٹس (TESS)(Short for Transiting Exoplanet Surver Satellite)

اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے بنایا گیا جو نزدیکی ستاروں کے گرد سیاروں کو قران سیارہ کے ذریعہ تلاش کرے۔اس سیٹلائٹ کے ذریعہ کافی تعداد میں ایسے سیاروں کی تلاش ہوئی جو تقریباً ہماری زمین جیسے ہیں۔ ایسے سیاروں کی تلاش جاری ہے جن پر ہمارے جیسی ذہین زندگی بستی ہو۔

■

A. H. Siddiqui
7 B, Tippet Street
Hills Borough
New Jersey- 08844 (USA)
Email.: aneessiddiqui2003@gmail.com

4 ڈوپلر شفٹ (Doppler shift) برقی مقناطیسی شعاع افشانی کی ارتعاش میں تبدیلی جو منظری خط میں ایٹم یا سالمے کے مرکزہ کی وجہ سے ہوئی ہو۔کسی ستارہ یا فلکی جرم کے منظر کی روشنی کی طیفی لائن کا ڈوپلر اثر کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہٹنا۔ڈوپلر اثر (Doppler effect) حوالہ دیتا ہے کہ کسی موج کے منبع اور اس کا مشاہدہ کرنے والے کے درمیان اضافی حرکت میں موج کے ارتعاش میں تبدیلی۔ یہ آسٹریلیا کے فلکیاتی ماہر کرسچین جوہان ڈوپلر نے دریافت کیا تھا۔

5 جوہانس کیپلر (Johannes Kepler)(1571-1620) جرمن کے فلکیاتی ماہر، فلاسفر و میوزک مصنف جو ستارھویں صدی کے خاص شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سائنسی انقلاب اور سیاروی نقل وحرکت کی وجہ سے مشہور تھے۔آپ نے سیاروی نقل وحرکت کے تین قانین بنائے تھے جو آج بھی استعمال ہو رہے ہیں۔

6 قران سیارہ (Transit of planet) بیرونی سیارے زیادہ تر قران سیارہ کے طریقہ سے دریافت ہوئے ہیں۔قران سیارہ اس وقت واقع ہوتا ہے جب ایک سیارہ ایک قرص کی شکل میں مشاہدہ کرنے والے اور سیارہ کے ستارہ کے درمیان ستارہ پر سے گزرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔نظام شمسی میں قران سیارہ ہماری زمین سے دیکھا جا سکتا ہے جب سیارہ زہرہ یا سیارہ عطارد، سورج اور مشاہدہ کرنے والے کے درمیان گزرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اس وقت سیارہ کی قرص سورج کی سطح پر سے گزرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔اس وقت سورج کی روشنی تھوڑا مدہم ہو جاتی ہے۔

نظریہ تعمیریت اور سماجی علوم کی تدریس

شیخ وسیم شیخ شبیر

سماجی علوم کی تعلیم اسکولی نصاب کا ایک اہم حصہ ہے۔ سماجی علوم کا بنیادی مقصد طلبا کو موثر شہری بننے کے طریقوں کی تعلیم دینا ہے۔ یہ ایک قابل اطلاق شاخ ہے جو مستقبل کے شہریوں میں مناسب رویوں، احساسات اور مہارتوں کی نشوونما کے لیے نصاب میں شامل ہے۔ سماجی علوم میں اکتساب کے مقاصد، علم، تفہیم اور مہارت کے حصول میں امدادی درس واکتساب کے طریقوں کا دوبارہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ چونکہ وقت بہت تیزی سے بدل رہا ہے اور اس بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ سماجی علوم میں تدریس کے وہ طریقے اپنانا چاہیے جو تخلیقی صلاحیتوں، جمالیاتی حساسیت اور تنقیدی نقطہ نظر کو فروغ دیتے ہیں۔

تاہم، سماجی علوم کی تعلیم میں، متعامل درس واکتساب کے ایسے ماحول کو بنانے پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے، جس میں طلبا کی تعلیم بہتر ہو۔ سوشل سائنس کی تعلیم میں ایک ترقی پسند نقطہ نظر کو جمالیاتی افہام وتفہیم، تنقیدی استدلال اور تخلیقی سوچ وغیرہ متعدد تعلیمی اصولوں کو اپنانا اور اسے فروغ دینا ضروری ہے۔ اس تحریر میں، درس و تدریس کے لیے تعمیری نظریے کا تجزیہ، سماجی علوم کی تدریس اور تعمیری نظریہ کے مابین تعلق پر غور کیا گیا ہے۔

تعمیری نظریہ : تعمیری نظریہ تعلیم کا وہ نظریہ ہے جس کی جڑیں فلسفہ اور نفسیات دونوں میں ملتی ہیں۔ اس نظریے کی جڑیں برسوں سے بہت سارے فلسفیوں کی فکر میں پائی جاتی ہیں، جن میں ڈیوے، ہیگل، کانٹ شامل ہیں۔ تعمیری نظام کا بنیادی جزیہ ہے کہ سیکھنے والے اپنے تجربات سے فعال طور پر اپنے علم اور معنی کو تعمیر کریں۔ تعمیریت کے نظریے کو اسلوب تعلیم کے انداز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جو طالب علم کو حصول علم اور تفہیم کے کارگزار/ فاعل کے طور پر ترجیح دیتا ہے (Bada and Olusegun, 2015)۔ جیسا کہ بڈا اور اولوسیگن (2015) نے نوٹ کیا ہے، یہ نقطہ نظر متعلم مرکوز ہے، اور طلبا کو محض معلومات کو ہلکے سے سننے اور جذب کرنے کی بجائے اپنی تعلیم کے لیے فعال طریقے استعمال کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ تعمیر نو اس نظریے پر مبنی ہے کہ لوگ فعال طور پر اپنا علم تشکیل دیتے ہیں، اور اس حقیقت کا تعین آپ اپنے تجربات سے بطور متعلم طے کرتے ہیں (WGU,2020)۔

ادراکی اور سماجی تعمیر نو (Cognitive And Social Constructivism): تعمیر کاروں کو بڑے پیمانے پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ جو نفسیاتی زاویے پر توجہ دیتے ہیں، اور وہ جو زیادہ معاشرتی ذہنیت رکھتے ہیں:

1 نفسیاتی تعمیر کار (جیسے جین پیاجے) سیکھنے کے عمل کو ایک ایسا عمل سمجھتا ہے جس میں علم کی تبدیلی اور (دوبارہ) تنظیم شامل ہوتی ہے جو طالب علم کے پاس پہلے ہی سے موجود ہے۔

2 دوسری طرف، سماجی تعمیر کار کے لیے، علم کی تعمیر اور جذب سماجی روابط کی فائدہ مند نوعیت پر زور دیتا ہے (خاص طور پر لیوا ویوگسکی)۔

وقوفی تعمیری نظریہ اور پیاجے کے مطابق علم کی تعمیر: وقوفی تعمیری نظریہ جین پیاجے کے کام پر مبنی نظریہ ہے، یہ بیان کرتا ہے کہ علم ایک ایسی چیز ہے جو سیکھنے والے اپنے موجودہ علمی ڈھانچے کی بنیاد پر فعال طور پر تعمیر کرتے ہیں۔ لہٰذا، تعلیم ان کی اکتسابی ترقی کے مرحلے سے متعلق ہے۔

پیاجے کے اکتسابی نظریے کے مطابق، اکتساب یا سیکھنا ایک ایسا عمل ہے جو تبدیلی کے حالات میں ہی سمجھ میں آتا ہے۔ لہٰذا، جزوی طور پر سیکھنا ان تبدیلیوں کو اپنانے کا طریقہ ہے۔ یہ نظریہ امتزاج (Assimilation) اور مطابقت (Accommodation) کے عمل کے ذریعے موافقت (Adaptation) کی حرکیات کی وضاحت کرتا ہے، جسے خاکہ (Schema) کہتے ہیں۔

پیاجے کی وقوفی نشوونما یہ بتاتی ہے کہ ایک بچہ دنیا کا ایک ذہنی خاکہ کس طرح تیار کرتا ہے۔ انھوں نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا کہ ذہانت ایک طے شدہ خصلت ہے، اور ساتھ ہی وہ وقوفی ترقی کو ایک عمل کے طور پر مانتے ہیں جو حیاتیاتی پختگی اور ماحولیات کے ساتھ تعامل کی وجہ سے ہوتا ہے۔

پیاجے کا پیش کردہ اسکیما/ خلکہ (Schema): ایک اسکیما، سمجھنے اور جاننے میں شامل دونوں ذہنی اور جسمانی اعمال کو بیان کرتا ہے۔ اسکیما علم کی وہ قسمیں ہیں جو دنیا کی ترجمانی اور سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔ پیاجے کے نظریہ کے مطابق، اسکیما میں علم کا ایک زمرہ اور اس علم کے حصول کا عمل شامل ہے۔ جیسے جیسے تجربات ہوتے ہیں، اس نئی معلومات کا استعمال پہلے سے موجود اسکیموں میں ترمیم کرنے، شامل کرنے یا تبدیل کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔

امتزاج، توازن، نئی صورت حال، عدم توازن کی حالت، مطابقت، موافقت

امتزاج : (Assimilation) امتزاج سے مراد ایسی صورت حال جس میں ایک بچہ بطور متعلم نئی چیزیں دیکھتا، سمجھتا اور ان سے متعلق اپنا ذاتی تصور قائم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بچہ چار ٹانگوں والا ایک جانور دیکھتا ہے اور کوئی اس سے کہتا ہے کہ، وہ جانور گھوڑا ہے۔ اب یہ تصور کہ چار پیر والا جانور گھوڑا ہوتا ہے، اُس متعلم کے ذہن میں یہ خاکہ تیار ہو جاتا ہے۔

توازن (Equilibration): توازن سے مراد کسی فرد کا ذہنی خاکہ یا فریم ورک اور اس کا اس کے ماحول کے ساتھ میل کہلاتا ہے۔ اس طرح کا توازن اس وقت ہوتا ہے جب ہماری توقعات، سابقہ علم پر مبنی نئے علم کے ساتھ

میل کھاتی ہیں۔ پیاجے کا خیال ہے کہ توازن اس وقت ہوتا ہے جب کسی بچے کے ذہنی خاکہ (schema) امتزاج کے ذریعے زیادہ تر نئی معلومات سے نمٹ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بچہ اس معلومات کے ساتھ امتزاج قائم کرتا ہے اور یہ تصور بناتا ہے کہ چار پیروں والا جانور گھوڑا ہی ہوتا ہے۔

نئی صورت حال(New Situation): نئی صورت حال سے مراد وہ حالت ہے جس میں سیکھنے والا ایسی معلومات یا تصورات سے متعارف ہوتا ہے جو اُس کی سابقہ معلومات سے ہٹ کر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ متعلم جو چار پیر والا جانور یعنی گھوڑے کا تصور بنا چکا تھا، اب ایک دوسرا چار پیر والا جانور دیکھتا ہے اور اُسے بھی گھوڑا ہی تصور کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ جانوار ایک بیل ہوتا ہے اور جب اس بات سے وہ واقف ہوتا ہے کہ یہ گھوڑا نہیں بلکہ ایک بیل ہے۔

عدم توازن کی حالت(Disequilibrium): عدم توازن کی حالت وہ ہوتی ہے جب متعلم اپنی سابقہ معلومات کو نئی معلومات سے جوڑ نہیں پاتا یعنی وہ جو تصور کرتا ہے وہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ وہ اپنی سابقہ معلومات میں اور نئی معلومات میں کوئی یکسانیت نہیں دیکھتا۔ مثال کے طور پر وہ متعلم جو چار پیر والا جانور یعنی گھوڑا یہ تصور بنا چکا تھا یہ جانتا ہے کہ یہ چار پیر والا جانور تو ہے لیکن گھوڑا نہیں ہے۔

مطابقت(Accommodation): مطابقت میں نئی معلومات یا نئے تجربات کے نتیجے میں موجودہ ذہنی خاکوں (Schemas)، یا نظریات میں ردوبدل شامل ہے۔ یہ موافقت(Adaptation) کا ایک اور حصہ ہے جس میں نئی معلومات کی روشنی میں ہمارے موجودہ اسکیموں کو تبدیل کرنا یا اس میں ردوبدل شامل ہے، یہ عمل مطابقت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس عمل کے دوران نئے اسکیموں کو بھی تیار کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ متعلم جو چار پیر والا جانور یعنی گھوڑا یہ تصور بنا چکا تھا یہ جانتا ہے کہ یہ دوسرا جانور چار پیر والا جانور تو ہے لیکن گھوڑا نہیں ہے بلکہ بیل ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ چار پیر والا کوئی دوسرا بھی جانور ہوسکتا ہے اس تصور کو قائم کرتا ہے۔ یعنی اپنی سابقہ معلومات میں نئی معلومات جوڑتا ہے۔

سماجی /معاشرتی تعمیری نظریہ اور لیو ویوگسکی کے مطابق علم کی تعمیر: معاشرتی تعمیری نظریے کے مطابق سیکھنا ایک باہمی تعاون کا عمل ہے، اور علم ان کی ثقافت اور معاشرے کے ساتھ افراد کے باہمی تعامل سے فروغ پاتا ہے۔ معاشرتی تعمیری نظریہ لیو ویوگسکی (1978) کے فلسفے پر مبنی ہے جس نے تجویز کیا تھا کہ، بچے کی ثقافتی نشوونما میں ہر کام دوبار ظاہر ہوتا ہے: پہلے، معاشرتی سطح پر اور بعد میں انفرادی سطح پر۔ پہلے، لوگوں کے درمیان (Psychological -Inter) اور پھر بچے کے اندر(Psychological -Intra)۔

لیو ویوگسکی کے مطابق علم کی تعمیر اور متعلم:

• ہر ایک بچہ توجہ، ادراک اور یادداشت ان بنیادی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے • بچے اپنے علم کی تعمیر خود کرتے ہیں • بچے کو ایک فعال سالک علم کے طور پر دیکھا جاتا ہے • خود رابطہ کاری بچوں کو اعلی سطح کی فکر کی جانب راغب کرتی ہے • زبان اور خیالات آزادانہ طور پر تشکیل پاتے ہیں، لیکن آخر کار ضم ہوجاتے ہیں• بچے کا ذہن معاشرتی طور پر تعمیری ہوتا ہے •نشوونما کو اس کے معاشرتی سیاق وسباق سے الگ نہیں کیا جاسکتا• نشوونما ماحول کے ساتھ براہ راست رابطے کا نتیجہ ہے • اکتساب میں مصالحت ضروری ہے۔• اکتساب دوبار ظاہر ہوتا ہے/ دو سطح پر ظاہر ہوتا ہے۔(بین نفسیات اور خود سر نفسیات)

تعمیری نظریہ کے ضروری علمی اصول: تعمیری نظریہ اور اس کے اقسام کے تفصیلی مطالعے کے بعد مندرجہ ذیل تعلیمی اصول سامنے آتے ہیں:

اکتساب فعال ادراکی عمل ہے: اس تھیوری کا ماننا ہے کہ سیکھنے کو نظریاتی طور پر نہیں لیا جاسکتا۔ اس میں فعال شرکت کی ضرورت ہے۔ طالب علم ایک خاص چیز اس وقت سیکھ سکتا ہے جب اس نے اس صورت حال کا تجربہ کیا اور یہ اس وقت ممکن ہے جب وہ اپنے آپ کو اس صورت حال میں متحرک طور پر شامل کرتے ہیں۔

اکتساب حسب منشا ہوتا ہے: ادراک/ cognizing ایک حسب منشا عمل ہے جو کسی خاص ماحول کے پیش نظر کسی فرد کے طرز عمل کو زیادہ سے زیادہ قابل عمل بناتا ہے۔ سیکھنے والا تب تک نہیں سیکھ سکتا جب تک وہ خود سیکھنا نہیں چاہتا۔ یہاں یہ خیال سامنے آتا ہے کہ ہم اساتذہ کو اپنے طالب علم کو سب سے پہلے سیکھنے کے لیے تیار کرنا ہوگا۔ طالب علم تب تیار ہوں گے جب وہ اُس مخصوص صورت حال اور تصور سے خود کو جوڑیں گے۔

اکتساب موضوعی ہے معروضی نہیں: ہر ایک متعلم اپنے موجودہ نظریات اور اقدار پر مبنی ایک الگ نقطہ نظر رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہی سبق، درس یا سرگرمی کے نتیجے میں ہر متعلم کا اکتساب مختلف انداز میں ہوسکتا ہے، کیونکہ ان کی شخصی تشریحات میں فرق ہوتا ہے۔ اس لیے اکتساب موضوعی ہے معروضی نہیں۔

اکتساب میں معاشرتی / ثقافتی اور انفرادی عمل دونوں شامل ہیں: علم کی جڑ حیاتیاتی / اعصابی تعمیرات اور معاشرتی، ثقافتی اور زبان پر مبنی تعامل دونوں میں ہے۔ یہ اور بات کہ اکتساب موضوعی ہے معروضی نہیں۔ سیکھنا ایک معاشرتی سرگرمی ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ مصالحت کے ذریعے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، ویاگٹسکی (1978) کا کہنا ہے کہ معاشرتی تعامل کی وجہ سے بچوں اور ان کے ساتھی کے تعاون سے علم کو فروغ ملتا ہے۔ اس طرح، تمام درس وتدریس، سماجی طور پر تشکیل دیے گئے علم کو بانٹنے اور مصالحت کرنے کا معاملہ ہے۔

درس و تدریس اور تعمیری نظریہ: مذکورہ بالا گفتگو سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم میں تعمیری نظام بہت اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ لہذا اب ہم دیکھیں گے کہ ہمارے نظام تعلیم کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے میں کمرہ جماعت میں تعمیری نظریہ درحقیقت کس طرح مدد کرسکتا ہے۔

تعمیری کلاس روم کے تدریسی (Pedagogical) اهداف؟: Honebein(1996) نے تعمیری اکتسابی ماحول کے سات تعلیمی اصولوں کا خلاصہ اس طرح کیا ہے۔

(1) علم کی تعمیر میں عمل کے ساتھ تجربہ فراہم کرنا (طلبہ طے کرتے ہیں کہ وہ کس طرح سیکھیں گے)

(2) متعدد نقطہ نظر (متبادل حل کی تشخیص) کے لیے تجربہ اور تعریف فراہم کرنا۔

(3) حقیقت پسندانہ ماحول (مستند کام) میں سیکھنے کو سرایت کرنا۔

(4 سیکھنے کے عمل میں ملکیت(Ownership) اور آواز(Voice raise) کی حوصلہ افزائی کرنا۔ (سیکھنے میں طالب علموں کی مرکزیت)۔

(5) سماجی تجربے(باہمی تعاون)میں سیکھنے کو سرایت کرنا۔

(6) پیشکش کے متعدد طریقوں، (ویڈیو، آڈیو متن، وغیرہ) کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرنا

(7) علم کی تعمیر کے عمل (عکاسی/، میٹا شناسی) کے بارے میں شعور کی حوصلہ افزائی کرنا۔

یہاں اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ اساتذہ ایک انوکھا تعلیمی ماحول پیدا کرنے کے لیے اپنے کلاس روم میں تعمیری نظام کیسے استعمال کرسکتے ہیں۔

تعمیراتی کلاس روم میں، اساتذہ کا کردار ایک باہمی تعاون کے ساتھ ماحول تیار کرنا ہے جہاں طلبا خود اپنی تعلیم واکتساب میں سرگرم عمل ہوں۔ اساتذہ اصل انسٹرکٹرز کے مقابلے زیادہ سہولت کار بنیں۔ اساتذہ کو لازمی ہے کہ وہ طلبا کے پہلے سے موجود تصورات اور افہام و تفہیم کو سمجھیں، پھر ان شعبوں میں علم کو شامل کرنے کے لیے کام کریں۔

اساتذہ کو بھی سیکھنے والے کی افہام وتفہیم کی سطح کے مطابق ہونے کے لیے اپنی تدریس کوڈھالنے کی ضرورت ہوگی۔

ایک کامیاب تعمیراتی کلاس روم چار کلیدی شعبوں پرانحصار کرتی ہیں:

i اساتذہ اور طلبہ کے مابین مشترکہ علم
ii اساتذہ اور طلبہ کے مابین مشترکہ اختیار
iii اساتذہ ایک رہنما یا سہولت کار کے طور پر کام کرتے ہیں۔
iv طلبا کے گروہ کم تعداد پر مشتمل ہوتے ہیں۔

تعمیراتی کمرہ جماعت روایتی کمرہ جماعت سے بہت سے معنوں میں الگ ہوتا ہے۔تعمیری کلاس روم طلبا کے سوالات اور مفادات یا دلچسپی پر مرکوز ہوتے ہیں، اساتذہ اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ طلبا پہلے ہی سے کچھ جانتے ہیں، وہ انٹرا یکٹو سیکھنے پر توجہ دیتے ہیں اور پورا اکتسابی ماحول طالب علم مرکوز ہوتا ہے، اساتذہ طلبا سے بات چیت کرتے ہیں تا کہ وہ اپنے علم کی تعمیر میں مدد کرسکیں، وہ مذاکرات میں معلومات کی جڑوں پر بات کرتے ہیں اور طلبا بنیادی طور پر گروہ میں کام کرتے ہیں۔تعمیراتی کلاس روموں میں اکثر اساتذہ ہوتے ہیں جو چھوٹے گروہی کام، باہمی تعاون اور انٹرا یکٹو سرگرمیاں کرتے ہیں، اور اُس عمل کی کامیابی کے حصول کے لیے طلبا کو کیا ضرورت ہے اس کے بارے میں بھی مکالمہ کرتے ہیں۔

تعمیری نظریہ پر مبنی تدریسی طریقے: تعمیریت میں تدریس کا کوئی طے شدہ طریقہ موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کے تعلیمی اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور ان کو اپناتے ہوئے ہم مختلف حکمت عملیوں کا منصوبہ بناسکتے ہیں جو بالآخر تعمیری انداز میں تدریسی اہداف کے حصول میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

پیشگی منتظمین (Advanced Organizers**):** اس حکمت عملی میں طلبا کو ہدایت سے پہلے عام بیانات دیے جاتے ہیں، جوانھیں اپنے موجودہ علم کو نئی معلومات سے مربوط کرنے میں مدد کرتے ہیں، جس سے متعلمین نئے نظریات سے مطابقت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تشبیہات (Analogies**):** اس طریقہ کار میں چیزوں کے درمیان مماثلت کی نشاندہی کی جاتی ہے، اس سے طلبا کو نئی معلومات سیکھنے اور پچھلے علم کے ساتھ روابط قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

وضاحت / توسیع (Elaboration**):** نئی چیزوں کے بارے میں اس طرح سوچنے کا عمل جو اسے موجودہ علم سے مربوط کرنے میں معاون ہو۔

تفتیش پر مبنی اکتساب :(Inquiry Based Learning**):** تفتیش پر مبنی اکتساب فعال اکتساب کی ایک قسم ہے, جو سوالات، مسائل یا منظرنامے پیش کرتے ہوئے شروع ہوتی ہے۔ یہ سیکھنے اور درس و تدریس کا وہ طریقہ ہے جو طلبا کے سوالات، نظریات اور مشاہدات پر زور دیتا ہے۔ اس میں طلبا کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں میں تبادلہ خیال کریں۔سیکھنے کی اس شکل سے صرف حقائق کو حفظ کرنے اور نوٹ لینے کی بجائے طلبا کی تفہیم میں اضافہ ہوتا ہے۔

تفتیش پر مبنی اکتساب کیوں؟

- یہ طریقہ مستند اکتساب کوفروغ دیتا ہے
- یہ تعمیریت کے نظریے پرمبنی ہوتا ہے
- یہ معاشرتی، اور باہمی تعاون کے ساتھ عمل میں لایا جاتا ہے
- یہ اکتساب کومزیدار اور دلچسپ بناتا ہے
- اس طریقے میں طالب علم توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔
- یہ تنقیدی سوچ اور مسئلہ حل کرنے کی مہارت کو بڑھاوا دیتا ہے۔
- یہ طریقے براہ راست تجربات فراہم کرنے میں معاون ہوتا ہے۔
- اس طریقہ سے سیکھنے کی منتقلی (حقیقی زندگی) بہت زیادہ ہوتی ہے۔

مسئلہ پر مبنی اکتساب(Problem Based Learning**):** مسئلے پرمبنی اکتساب وہ عمل ہے جس میں ایک انجان صورت حال کے تناظر میں علم و مہارت کو حاصل کرنا اور سمجھنا اور اس کے اکتساب کو اس صورت حال (مسئلے) پر لاگو کرنا۔مسئلے پرمبنی اکتساب طالب علموں پر مرکوز حکمت عملی ہے جس میں طلبہ باہمی تعاون سے مسائل کوحل کرتے ہیں اور یہ ان کے تجربے کی عکاسی کرتا ہے۔ پی بی ایل میں، نقطہ آغاز ایک مسئلہ، سوال، یا ایک پہیلی ہوتا ہے جسے متعلم حل کرنا چاہتا ہے۔

دریافتی اکتساب(Discovery Learning**):** دریافتی اکتساب تفتیش پرمبنی اکتساب کی ایک تکنیک ہے اور یہ تعمیریتی نظریے کا اطلاق کرتی ہے۔اس کو مسئلے پرمبنی اکتساب، تجرباتی اکتساب اور 21 ویں صدی کی تعلیم بھی کہا جاتا ہے۔ ڈسکوری لرننگ جیروم برونر نے متعارف کروائی، اور یہ انکوائری پرمبنی ہدایت کا ایک طریقہ ہے۔ یہ مقبول تھیوری متعلم کو ماضی کے تجربات اور جانکاری کو فروغ دینے، ان کے الہام، تخیل اور تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کرنے اور حقائق، ارتباط اور نئی سچائیوں کو، نئی معلومات کو دریافت کرنے کے لیے ترغیب دیتی ہے۔

5E Model: Atkin اور Karplus نے 5E ماڈل کی تخلیق کی، جس میں طلبا کو متعین اقدامات یا مراحل کی ایک سیریز کے ذریعے وقت کے ساتھ ساتھ کسی تصور کو سمجھنے کی جانب راغب کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ان مراحل میں مشغول (Engage)، کھوج (Explore)، وضاحت (Explain)، تفصیل (Elaborate) اور اندازۂ قدر یا تعین قدر (Evaluation) شامل ہیں-

ٹکنالوجی کا استعمال: آج ہم ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جو جدید ٹیکنالوجی کے استعمال پر منحصر ہے، خاص طور پر کمپیوٹرز۔تعلیم معاشرے کا ایک ایسا شعبہ ہے جس میں آج ٹیکنالوجی اہمیت حاصل کر رہی ہے۔معاشرتی سائنس کے کلاس روم میں، تعمیراتی نظام کے بہت سے پہلوؤں کی تائید کے لیے ٹکنالوجی شامل کی جاسکتی ہے۔کمپیوٹر ٹیکنالوجیز ایسے بہت سارے آلات مہیا کرتی ہیں جن کو سوشل سائنس کے درس و اکتساب کے دوران کمرۂ جماعت میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔کچھ مختلف اقسام میں simulative اور حکمت عملی والے سافٹ ویئر، ملٹی میڈیا پیشکشیں، ڈیٹا بیس، اور ٹیلی مواصلات شامل ہیں (Rice & Wilson - 1999)۔اس طرح کمرۂ جماعت میں ٹکنالوجی کا استعمال کر کے طلبا کو زیادہ متحرک اور انٹرا یکٹو ماحول فراہم کیا جاسکتا ہے۔

اختتام: تعمیری نظریہ تعلیم کے بارے میں ایک متبادل نظریہ پیش کرتا ہے۔تعمیریت ایک نظریہ ہے جس کے بارے میں افراد کو حصول علم کا پتہ چلتا ہے۔اس کی بنیاد یہ ہے کہ علم اور حقیقت معاشرتی اتفاق رائے پرمبنی ہے۔یہ ایک نظریہ ہے جو روایتی طریقوں کو چیلنج کرتا ہے جسے سوشل سائنس اساتذہ کی اکثریت طلبا کو پڑھانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔یہ نظریہ معاشرتی سائنس کے کلاس روم میں متعدد تبدیلیاں کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔اس کا ایک اہم پہلو یہ ہوگا کہ مواد ایسے پیش کرنا شروع کیا جائے جو پیچیدگی کو ظاہر کرتا ہو اور حقیقی دنیا کے حالات کے متعدد تناظر بتاتا ہو۔

براؤن کے مطابق، 'اس نظریے میں اساتذہ کا کردار بدل جائے گا وہ ایک گائیڈ اور سہولت کار کی طرح کام کرے گے۔کلاس روم کا ماحول 'سیکھنے کی برادری' کی شکل اختیار کرنا شروع کردے گا جہاں بات چیت ایک اہم کلیدی حیثیت رکھتی ہوں۔ کلاس روم میں اس نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہونے کے لیے اساتذہ کو اپنے مواد پر مہارت اور اس نظریے کو اور اس کے مضمرات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔(براؤن 2000)۔

■

Dr. Shaikh Wasim Shaikh Shabbir
Associate Prof. of Education, MANUU
College of Teacher Education
Darbhanga- (Bihar)

بھارتی ڈاک ٹکٹ اور اردو قلم کار

اسمٰعیل وفا

محکمۂ ڈاک میں رقم کی ادائیگی کی رسید کے طور پر سب سے پہلے انگلستان میں ڈاک ٹکٹ کی ابتدا ہوئی۔ Penny Black نام سے مشہور پہلا ڈاک ٹکٹ 1840 میں انگلستان میں استعمال کیا گیا تھا۔ اس ڈاک ٹکٹ پر ملکۂ برطانیہ 'وکٹوریہ' کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ انگلستان کی ہی نوآبادیات ہونے کی وجہ سے بھارت میں محکمۂ ڈاک اور ٹیلی گراف کی شروعات ہوگئی تھی۔ 1931 میں بھارت میں ڈاک ٹکٹ کی اشاعت کی شروعات ہوئی۔ اس وقت بادشاہوں اور شہزادوں کی تصاویر کو ڈاک ٹکٹ پر جگہ ملی۔ آزادی کے بعد بھارت کی تہذیب اور ہمارے قومی مزاج کے مطابق اس میں تبدیلی آئی۔

ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا شوق Philately کہلاتا ہے۔ کسی بھی ملک کی طرح بھارت کے بھی ڈاک ٹکٹ، ملک کی تاریخ، ثقافت، قدرتی مناظر، تاریخی واقعات، جنگلاتی دولت، ملک کی ترقی کے مناظر، پنج سالہ منصوبے اور دیگر حکومتی اسکیموں کی کامیابیاں، مفکرین، مجاہدینِ آزادی اور ملک کے لیے جان دینے والے بہادروں کی کامیابیاں وغیرہ پیش کرتے ہیں۔ ڈاک ٹکٹ پر کسی شخص کی تصویر شائع ہونا اپنے آپ میں ایک بڑا اعزاز ہے۔ اس تناظر میں اردو زبان و ادب سے وابستہ افراد کی فہرست غالب سے کرشن چندر تک محیط ہے۔

مرزا غالب (27 دسمبر 1797 تا 15 فروری 1869):

غالب اردو کے مشہور اور مقبول شاعر تو ہیں ہی، لیکن بھارت کی تہذیب اور زبان کو انھوں نے جس انداز میں پیش کیا ہے، لاجواب ہے۔ یکم اکتوبر 1952 کو Saints of India سیریز میں سنت کبیر، تلسی داس اور میرابائی، سورداس اور رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ مرزا اسد اللہ خان غالب کی بھی تصویر پر مبنی ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا، اس ٹکٹ کی قیمت ساڑھے چار آنہ تھی اور اس پر غالب کی پینٹنگ کو شامل کیا گیا تھا جو مروج تصاویر سے تھوڑا مختلف ہے۔ 1952 کی مذکورہ بالا سیریز کے علاوہ غالب کی صدسالہ برسی کی تقریبات میں سرکاری طور پر اہتمام کے ضمن میں اس برس 17 فروری 1969 کو ایک اور ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا اس کی قیمت 20 پیسے تھی۔ غالب پر نہ صرف انڈیا بلکہ پاکستان میں بھی ڈاک ٹکٹ جاری ہوئے۔ 15 فروری 1969 کو پاکستان سے جاری ہونے والے دو ڈاک ٹکٹوں پر غالب کے الگ الگ شعر لکھے گئے۔ اول ٹکٹ پر تحریر تھا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

دوسرے ڈاک ٹکٹ پر دوسرا شعر شامل کیا گیا تھا:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

غالب کی شخصیت اور شاعری پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ان کے کلام کی تشریحات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا۔ ان کی حیات پر مبنی فلم 'مرزا غالب' (ڈائرکٹر: سہراب مودی 1954) اور سیریل 'مرزا غالب' (ڈائرکٹر: گلزار، 1988) کے علاوہ بھارت کی پارلیمنٹ کے مختلف برسوں کی بجٹ تقریروں میں غالب کے مختلف اشعار کے برجستہ اور چست استعمال سے غالب کی اہمیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ مزید برآں مشہور مورخ رام چندر گوہا کی شاہکار India After Gandhi کی شروعات غالب کی مثنوی 'چراغِ دیر' کے ترجمے اور تشریح سے ہونے سے جدید زمانے میں غالب کی معنویت کی تفہیم کی جاسکتی ہے۔ حتیٰ کہ مائکروسافٹ CEO ستیہ نڈیلا نے اپنی تقریر میں غالب کا مندرجہ ذیل شعر استعمال کیا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

مولانا ابوالکلام آزاد (11 نومبر 1888 تا 22 فروری 1958):

مولانا آزاد نے کریئر کی شروعات صحافی اور مدیر کے طور پر کی تھی۔ درجنوں اخبارات سے وابستہ رہے اور

کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی تین کتابیں شاہکار سمجھی جاسکتی ہیں۔ تذکرہ، غبارِ خاطر اور ترجمان القرآن۔ تذکرہ، سوانحی کتاب ہے جس میں خاندانی بزرگوں کا تذکرہ شامل ہے۔ 'غبارِ خاطر' مضمون کے طرز پر لکھے خطوط ہیں جو انھوں نے قلعۂ احمد نگر میں دورانِ اسیری اپنے دوست حبیب الرحمٰن خان شیروانی کو لکھے تھے۔ 'ترجمان القرآن'، تفسیر قرآن ہے جو بلاشبہ مولانا آزاد کی شاہکار کتابوں میں بھی اولیت کی حامل ہے۔ اس کی ہر سطر سے صاحبِ تفسیر کی ذہانت، وسعتِ نظر و فکر اور علمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا آزاد نے متحدہ قومیت پر اس وقت بھروسہ کیا جب مذہب و سیاست سے وابستہ ایک بڑا طبقہ پاکستان کو کلمۂ حق کے ذریعے ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وقت نے ثابت کردیا کہ ان لوگوں کا نعرہ غلط تھا اور مولانا کا استدلال درست۔ خواہ سو برس گذر جائیں یا دو سو برس، غلط تقسیم کو صحیح ثابت نہیں کرسکتے۔ مولانا آزاد کی یاد میں 11 نومبر 1966 کو ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا تھا اس ٹکٹ کی قیمت 15 پیسے تھی۔ 11 نومبر 1988 کو جاری ڈاک ٹکٹ کی قیمت 60 پیسے تھی جبکہ 2015 میں ڈاک ٹکٹ کی قیمت 5 روپے تھی۔ الختصر ان کی شخصیت پر تین ڈاک ٹکٹ جاری ہوئے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین: (8 فروری 1897 تا 3 مئی 1969)

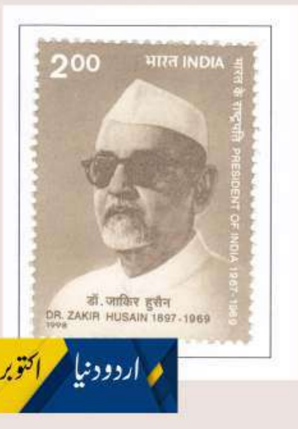

ڈاکٹر ذاکر حسین ماہرِ تعلیم تھے۔ انھوں نے خونِ جگر سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی آبیاری کی اور کڑے وقت میں مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خدمت کی۔ جامعہ ہو یا علی گڑھ، انھوں نے طلبہ کی ترقی اور ان کے مستقبل کو مقدم رکھا۔ نوجوانوں کی تربیت اور ان میں صالح اقدار پیدا کرنے کے لیے ہی انھوں نے 'پیامِ تعلیم' رسالہ اور معیاری کتابوں کی اشاعت کے لیے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ قائم کیا۔ انھوں نے تعلیمی مصروفیات کے باوجود بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں جو تعداد میں کم ہونے کے باوجود ہر دور کے بچوں کے لیے تفریح طبع کے ساتھ صالح اقدار کی جانب رہنما ہے۔

ذاکر صاحب راجیہ سبھا کے رکن اور بہار کے گورنر بننے کے بعد نائب صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔ 1967 میں انھیں صدر جمہوریۂ ہند کے طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ وہ 3 مئی 1969 کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ اسی سال 11 جون 1969 کو ان کا یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا اس کی قیمت 20 پیسے تھی۔ 3 مئی 1998 کو دوبارہ ان کے اعزاز میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا اس کی قیمت 2 روپے تھی۔

منشی نول کشور: (3 جنوری 1836 تا 19 فروری 1895)

صحافی کے طور پر کریئر کی شروعات کرنے والے منشی نول کشور نے 1858 میں لکھنؤ میں چھاپہ خانہ 'مطبع نول کشور' قائم کیا۔ انھوں نے نایاب کتابوں، قلمی نسخوں اور ادبی شہ پاروں کو پتھروں کی سِلوں سے گزار کر کاغذ پر اس طرح نقش کر دیا کہ بلاشبہ انھیں مشرقی علوم کا محافظ کہا جاسکتا ہے۔ 1859 میں ان کے جاری کردہ اخبار 'اودھ اخبار' کو اس قدر مقبولیت ملی کہ تعداد اشاعت 10 سے 12 ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

ادبی شہ پاروں کے ضمن میں 'داستانِ امیر حمزہ'، شاہنامۂ فردوسی (بڑی سائز میں تین حصے) پیر ہن یوسفی منظوم کا اردو ترجمہ، چھ جلدوں میں، جواہر الاسرار تین جلدوں میں، کلیاتِ شمس تبریز، کلیاتِ عارفی اور کلیاتِ غالب وغیرہ اسی پریس سے شائع ہوئیں۔ غالب کے الفاظ میں، 'اس چھاپہ خانے میں جس کا بھی دیوان چھپا، اس کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیا'۔ منشی جی کا چھاپہ خانہ اس معنوں میں بے حد مشہور اور مقبول تھا کہ اس میں کلام پاک کی کتابت کرنے والے خوش نویسوں اور خطاطوں کو سخت ہدایت تھی کہ کبھی بھی بلا وضو کتابت نہیں کریں گے۔ گویا اسلامی تصنیفات کے سلسلے میں طہارت و پاکیزگی کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ یہاں سے جو مذہبی نسخے شائع ہوتے تھے وہ دنیا بھر میں جاتے تھے۔

سماج کے تئیں خدمات کے پیش نظر برطانوی حکومت نے 1877 میں انہیں قیصرِ ہند تفویض کیا۔ ان کی 75 ویں یوم وفات 19 فروری 1970 کو محکمۂ ڈاک نے ان کا یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ اس ٹکٹ کی قیمت 20 پیسے تھی۔

سرسید احمد خان: (17 اکتوبر 1817 تا 27 مارچ 1898)

سرسید احمد خان کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ نے برصغیر کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی بدولت اردو نثر میں سادگی اور پرکاری در آئی۔ انھوں نے نثر کو عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکال کر سائنسی فکر اور ملکی، سیاسی، اخلاقی و تاریخی مضامین سے آشنا کیا۔ تہذیب الاخلاق، نامی پرچے کی تحریروں کے ذریعے انھوں نے انشا پردازی کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ 'آثار الصنادید'، اسبابِ بغاوتِ ہند، مضامینِ سرسید وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

حکومتِ ہند نے سرسید کی یاد میں سرسید ڈے 17 اکتوبر 1973 کو ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا، اس ٹکٹ کی قیمت 20 پیسے تھی۔ 27 مارچ 1998 کو ان کی صد سالہ برسی کے موقع پر بھی ڈاک ٹکٹ جاری کیا اس ٹکٹ کی قیمت 200 پیسے یعنی 2 روپئے تھی۔

میر انیس: (1803 تا 10 دسمبر 1874)

بے مثل مرثیہ نویس اور مرثیہ خواں میر انیس نے اردو غزل کے گیسو سنوارنے کی بجائے دین و آخرت کی کامیابی کو مقدم رکھا اور والد محترم کی نصیحت کی پاسداری کرتے ہوئے مرثیہ گوئی اختیار کی۔ انھوں نے اپنے اجداد کی مرثیہ گوئی کی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے لکھا،

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

منظر نگاری، فارسی ترکیبات کی دل نشینی، بیان کی سادگی، خیالات کی نفاست نزاکت اور آلِ بیت کے مراتب کا لحاظ، پیمبرِ سخن میر انیس کے کلام کی خصوصیات تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کے کلام کی طرح ان کا پڑھنا بھی بے مثل تھا یہی وجہ تھی کہ اس زمانے کے رؤسا اور امرا ان کی مجلس میں شمولیت کو باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔

غمِ حسین منانے کی بدولت انھیں نہ صرف عزت و شرف حاصل ہوا بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی تکریم کا سلسلہ جاری رہا۔ 4 ستمبر 1975 کو محکمۂ ڈاک نے ان کا یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ اس ٹکٹ کی قیمت 25 پیسے تھی۔

امیر خسرو (1253 تا اکتوبر 1325)

امیر خسرو نہ صرف اردو بلکہ ہندی کے بھی بنیاد گذار شاعر تھے۔ ایک ہی وقت میں آپ مفکر بھی تھے اور باعمل انسان بھی۔ صوفی بھی تھے اور دربار سے وابستہ معزز فرد بھی۔ وہ بھارت کی روایت اور ماحول سے حد درجہ متاثر رہے۔ انھوں نے زندگی کی رنگینیوں اور عوامی جذبات کے ساتھ بھارتی تہذیب، ثقافت، رہن سہن، موسم اور ماحول کو اس طرح شاعری میں سمو دیا کہ متحدہ قومیت کا وجود ہوا۔ امیر خسرو کی خدمات کے اعتراف میں ان کے 700 سالہ یوم پیدائش کے جشن کے طور پر 24 اکتوبر 1975 کو حکومتِ ہند نے ڈاک ٹکٹ جاری کیا، اس ٹکٹ کی قیمت 50 پیسے تھی۔ اسی دن یعنی 24 اکتوبر 1975 کو ہی پاکستان سے دو ڈاک ٹکٹ جاری کیے گئے ایک ٹکٹ کی قیمت 20 پیسہ اور دوسرے کی 2.25 روپئے درج تھی۔ ساتھ ہی اس پر تحریر تھا 'طوطی شکر مقال'۔ ساتھ ہی پس منظر میں طبلہ اور ستار بنائے گئے تھے۔

بہادر شاہ ظفر: (24 اکتوبر 1775 تا 7 نومبر 1862):

آخری مغل تاجدار محمد سراج الدین مرزا ابوظفر بہادر شاہ ثانی کو اردو، فارسی اور عربی پر دسترس حاصل تھی۔ قرآن کی تعلیم کے علاوہ سپاہیانہ فنون میں بھی مہارت حاصل کی۔ موصوف موسیقی، خوش نویسی اور شاعری میں نہ صرف حصہ لیتے بلکہ ان کی سرپرستی بھی فرماتے تھے۔ شاعری میں شیخ محمد ابراہیم ذوق سے اور بعد میں غالب سے اصلاح لیتے رہے اور ظفر تخلص اختیار کیا۔

1875 کے خونیں معرکے میں حصہ لینے کی پاداش میں برطانوی حکومت نے انھیں مجرم قرار دیتے ہوئے رنگون (موجودہ برما) میں جلاوطن کردیا۔ انھوں نے شاعری بھی کی اور راہِ سلوک سے بھی وابستہ رہے۔ ان کا مجموعۂ کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کے بہت سارے اشعار اور غزلیں لوگوں میں عام ہیں۔ اسی بنا پر 24 اکتوبر 1975 کو ان کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا تو ان کی تصویر کی بجائے درج ذیل چار مصرعے شائع کیے گئے۔

لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

محمد علی جوہر (10 دسمبر 1878 تا 4 جنوری 1931)

جنگِ بلقان اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد بھارت میں جاری خلافت تحریک کے سرخیل، مولانا محمد علی جوہر بنیادی طور پر بہترین صحافی اور پرجوش شاعر تھے۔ ترکی میں خلافت کی بقا کے لیے انگریزوں پر دباؤ پیدا کرنے کے مقصد کے تحت ہی دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی رکھنے والے ملک بھارت میں خلافت تحریک شروع کی گئی تھی۔ 1924 میں ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بعد بھارت کی یہ تحریک اپنی موت آپ مرگئی۔

محمد علی جوہر بہترین خطیب اور پرجوش شاعر تھے۔ ان کے چند مشہور اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
ساری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ سودائی ہے
اب مرا ہوش میں آنا تیری رسوائی ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ زمانے سے خفا میرے لیے ہے

10 دسمبر 1978 کو مولانا محمد علی جوہر کی 100ویں یومِ پیدائش کے موقع پر بھارت نے ڈاک ٹکٹ جاری کیا جس کی قیمت 25 پیسے تھی۔

پروفیسر سید محمد ضامن علی ضامن:
(25 جون 1880 تا 25 اپریل 1955)

مشرق کے آکسفورڈ کہلائے جانے والے تعلیمی ادارہ 'الٰہ آباد یونیورسٹی' میں اولین صدر شعبۂ اردو اور اردو کے پہلے پروفیسر، سید ضامن علی ضامن تھے۔ شمالی ہند میں یہ عروج کسی اور اردو استاد کو نصیب نہیں ہوا حتیٰ کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی پروفیسر کی جگہ بعد میں قائم ہوئی تھی۔

ضامن صاحب کا تقرر 1924 میں اردو کے استادِ اول کے طور پر ہوا تھا۔ وہ بڑی محنت سے طلبہ کو پڑھاتے اور ادب کی باریکیوں سے واقف کراتے تھے۔ ان ہی کی محنت کا ثمرہ تھا کہ شعبۂ اردو نے نہایت ترقی کی۔ طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے شعبۂ اردو کا میگزین رسالہ 'نیساں' 1934 میں جاری کیا۔ صدر شعبۂ اردو کے طور پر آپ اس رسالے کے مدیر رہے جبکہ نائب مدیران میں سید حامد حسین بلگرامی، سید طالب علی طالب، سید رفیق حسین رفیق اور سید احتشام حسین رضوی شامل تھے۔ اس ٹیم میں سید اعجاز حسین کو ناظم و معتمد کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ شعبے کی دفتری ذمے داریوں کی بدولت آپ تصنیف و تالیف کی جانب توجہ نہ دے سکے۔ لیکن اردو کے تئیں ان کی خدمات کی بدولت نہ صرف انھیں بلکہ شعبۂ اردو کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

پروفیسر ضامن کی 100ویں یومِ پیدائش یعنی 25 جون 1980 میں ان کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا۔ اس ٹکٹ کی قیمت 30 پیسے تھی۔

منشی پریم چند: (31 جولائی 1880 تا 8 اکتوبر 1936)

منشی پریم چند اردو کے عظیم افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو افسانے کو رومانوی، طلسماتی اور داستانی فضا سے باہر نکال کر حقیقت سے بہرہ ور کیا۔ انھوں نے مروج اسلوب سے اعراض کرتے ہوئے سادہ زبان میں ہندوستانی سماج اور مشترکہ تہذیب اس طرح پیش کی کہ ان افسانوں میں روحِ عصر کی موجودگی نے انھیں انسانیت اور دردمندی کا مرقع بنا دیا۔

1905 میں ان کا افسانوی مجموعہ 'سوزِ وطن' شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کی وجہ سے ان پر بغاوت کو ہوا دینے کا الزام عائد کرتے ہوئے مقدمہ چلایا گیا اور کاپیاں ضبط کرلی گئیں۔ ان کے بہت سارے ناول اور تخلیقات دونوں زبانوں اردو اور ہندی میں شائع ہوئے۔ پریم چند کا افسانہ 'کفن' ان کا اہم ترین افسانہ کہا جاسکتا ہے، جو غربت کے سماجی اور نفسیاتی اثرات کو محیط کرتا ہوا ایسا شاہکار ہے جس کا اردو ہی نہیں دیگر کسی بھارتی زبان میں بھی کوئی جواب نہیں۔

پریم چند کو حکومتی سطح پر بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ 31 جولائی 1980 کو ان کے 100ویں یومِ ولادت کے موقعے پر ان کی شخصیت پر مبنی ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا اس ٹکٹ کی قیمت 30 پیسے تھی۔ ان کے مشہور ناول 'گئو دان' سے منسوب ایک ریل 'گئو دان ایکسپریس' 2001 میں شروع کی گئی جو لوکمانیہ تلک ٹرمنس (ممبئی) سے اعظم گڑھ (اتر پردیش) کے درمیان سفر کرتی ہے۔ 2005 میں ان کی رہائش گاہ (لمہی گاؤں، وارانسی) کو سرکاری سطح پر اسمارک کا درجہ دیا گیا۔

حکیم اجمل خان: (11 فروری 1868 تا 20 دسمبر 1927)

حکیم اجمل خان بے مثل طبیب اور نڈر مجاہدِ آزادی تھے۔ انھوں نے نہ صرف جذباتی اور جسمانی طور پر ملک کی آزادی کی کوشش کی بلکہ مالی طور پر تحریک عدم تعاون کو استحکام بخشا۔ انھوں نے خاندان شریفی سے تعلق اور طبابت میں مہارت کی بدولت جو دولت کمائی قومی تعلیم کے مقصد کے تحت کام کرنے والے ادارے کے لیے خرچ کردی جہاں کے وہ چانسلر تھے۔

حکیم صاحب اپنے زمانے کے بارسوخ اور معزز ترین افراد میں شمار کیے جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ تحریک ترک موالات کے دوران آپ کا حکومتی اعزاز واپس کرنا ایک اہم واقعہ تھا۔ حکیم صاحب نے طبابت کا پیشہ تو اپنایا لیکن آپ دامنِ سخن سے بھی وابستہ رہے اور 'شیدا' تخلص اختیار کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جرمنی میں قیام کے دوران آپ کے مجموعۂ کلام کی اشاعت بھی کروائی تھی گو کہ 13 فروری 1987 کو آپ کی یاد میں ڈاک ٹکٹ (قیمت 60 پیسے) مجاہدِ آزادی کے طور پر آپ کی خدمات کا اعتراف تھا لیکن اردو ادب سے آپ کی وابستگی، دیوان کی موجودگی میں نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

ڈاکٹر محمد اقبال (9 نومبر 1877 تا 21 اپریل 1938)

ڈاکٹر محمد اقبال اردو اور فارسی کے اہم ترین شاعر اور برصغیر کی بااثر ترین شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ کی شاعری میں اول وطنی موضوع شامل رہے بعدۂ فلسفیانہ انداز، مشرقیت اور اسلامی موضوعات در آئے۔ انھوں نے یورپ کی مادّیت کے جواب میں مشرق کی روحانیت سامنے کردی۔

1938 میں اقبال سفر آخرت پر روانہ ہوئے تو 50 ہزار سے زائد نفوس نے جلوسِ جنازہ میں شرکت کی۔ انھیں لاہور کی بادشاہی مسجد کے مینار کے سائے تلے دفن کیا گیا۔ ان کی شخصیت اور شاعری کو نہ صرف بھارت اور پاکستان بلکہ برصغیر اور عالمِ اسلام کی میراث سمجھا گیا۔ اسی لیے بھارتی حکومت نے 21 اپریل 1988 کو ان کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ جس کی قیمت 60 پیسے تھی اور اس پر ان کا مصرع درج تھا ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

جبکہ حکومت پاکستان نے 1967، 1974، 1977، 1988 اور 2017 میں ڈاک ٹکٹ جاری کیے۔ اس کے علاوہ ترکی (1977) اور ایران (1997) سے بھی ان کا یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا۔

11 مئی 1989 کو آصف علی کی شخصیت پر مبنی ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا۔ اس ٹکٹ کی قیمت 60 پیسے تھی۔

امام احمد رضا خان بریلوی: (14 جون 1856 تا 28 اکتوبر 1921)

امام احمد رضا خان صاحب بہ یک وقت عالم دین، عاشقِ رسول، نعت گو شاعر، اعلیٰ پائے کے مصنف، فتویٰ نویس اور مفکر تھے۔ ان کی بہت ساری تصانیف اور علمی سرمایے میں دو شاہکار خاصے مشہور ہیں۔ فتاویٰ رضویہ (12 جلدیں) اور قرآن مجید کا ترجمہ 'کنز الایمان'۔ ان کا نعتیہ دیوان 'حدائقِ بخشش' بھی مقبول عام ہے۔

31 دسمبر 1995 کو حکومتِ ہند نے آپ کے اعزاز میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ اس ٹکٹ کی قیمت 100 پیسے یعنی ایک روپیہ تھی۔

فراق گورکھپوری: (28 اگست 1869 تا 3 مارچ 1982)

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے بے حد مقبولیت اور شہرت حاصل کی تھی۔ بقول محمد حسن عسکری، ''فراق صاحب اردو شاعری میں ایک نئی آواز نیا لب ولہجہ، نیا طرز احساس، ایک نئی قوت بلکہ ایک نئی زبان لے کر آئے۔''

ان کی شاعری کے بہت سارے انتخابات شائع ہوئے۔ 1960 میں انھیں 'گل نغمہ' کے لیے ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا۔ 1969 میں ادب کے لیے دیا جانے والا سب سے بڑا ایوارڈ گیان پیٹھ ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ انھیں حکومت ہند کی جانب سے تیسرا سب سے بڑا شہری انعام پدم بھوشن (1968) بھی تفویض کیا گیا تھا۔

فراق کی شخصیت اور شاعری کے اعتراف میں 28 اگست 1997 کو حکومتِ ہند نے ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ اس ٹکٹ کی قیمت 200 پیسے یعنی 2 روپئے تھی۔

اسرار الحق مجاز (19 اکتوبر 1911 تا 5 دسمبر 1952)

اسرار الحق مجاز نے کم ہی عرصے میں بے پناہ مقبولیت اور شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کی غزلوں سے زیادہ ان کی نظمیں مشہور ہوئیں جن میں 'نوجوان خاتون'، 'آوارہ' اور 'رات اور ریل' وغیرہ شمار کی جاسکتی ہیں۔ گو کہ ان کی نظموں کو فلموں میں بھی استعمال کیا گیا لیکن گیت کار کے طور پر وہ فلم نگری میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انھوں نے 'نیا ادب' اور 'پرچم' کی ادارت بھی کی۔ ان کا شعری سرمایہ 'آہنگ' کے نام سے ترتیب دے کر شائع کیا گیا تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ترانہ تحریر کرنے والے اس البیلے شاعر پر 28 مارچ 2008 کو ڈاک ٹکٹ جاری ہوا (قیمت 500 پیسے یعنی 5 روپئے) تو اس پر ان کی تصویر کے ساتھ ان کا شعر درج تھا

بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں مجاز
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے ہم

مینا کماری: (1 اگست 1933 تا 31 مارچ 1972)

مینا کماری پردۂ سیمیں پر بے حد کامیاب اداکارہ تھیں۔ بے مثل اداکاری کے لیے انھیں فلم فیئر ایوارڈ 1954 میں فلم 'بیجو باورا' کے لیے، 1955 میں فلم 'پری نیتا' کے لیے اور 1963 میں فلم 'صاحب بی بی اور غلام' کے لیے تفویض کیا گیا تھا۔ نیز ان کی اداکاری سے سجی فلمیں 36ویں اور 41ویں اکیڈمی ایوارڈ کی غیر ملکی زمرہ کے لیے بھارت کی جانب سے بھیجی گئی تھیں۔ یہ فلمیں بالترتیب 'صاحب بی بی اور غلام' اور 'منجھلی دیدی' تھیں۔

شوہر کی توجہ نہ ملنے کے سبب مینا کماری کی نجی زندگی ناکام رہی۔ انھوں نے 'ناز' تخلص اختیار کیا۔ ان کی موت کے بعد 1972 میں گلزار نے ان کی شاعری کو مرتب کیا

جسے شمع گروپ نے اہتمام سے شائع کیا تھا جس میں لکھا تھا ''خونِ دل سے لکھی ہوئی نظمیں' آہوں اور سسکیوں سے ترتیب دی ہوئیں غزلیں، کاجل بھرے آنسوؤں کی روشنی سے بنی ہوئی تصویروں کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔''

بینا کماری ناز کی یاد میں 13 فروری 2011 میں محکمۂ ڈاک نے ڈاک ٹکٹ جاری کیا، اس ٹکٹ کی قیمت 500 پیسے یعنی 5 روپے تھی۔

مولانا حسین احمد مدنی: (6 اکتوبر 1879 تا 5 دسمبر 1954)

مولانا حسین احمد مدنی دارالعلوم دیوبند سے وابستہ مشہور عالمِ دین اور مجاہد آزادی تھے۔ انھوں نے تحریکِ ریشمی رومال میں شرکت کی تھی اور اس کی پاداش میں مالٹا میں انگریزی حکومت کی قید کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ انھوں نے جمعیۃ العلما کے صدر کے طور پر خدمات انجام دینے کے علاوہ تقسیم ہند کے نازک موڑ پر متحدہ قومیت کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے وہ تنقید کا نشانہ بھی رہے۔

مولانا حسین احمد مدنی نے بہت ساری کتابیں تصنیف کیں۔ یہ کتابیں مذہبی نوعیت کی حامل ہیں۔ ان کی خود نوشت سوانح حیات 'نقشِ حیات' بھی شائع ہو چکی ہے۔ 1954 میں حکومتِ ہند نے انھیں شہری اعزاز پدم بھوشن تفویض کیا تھا لیکن انھوں نے قبول کرنے سے معذرت کر لی کہ بزرگوں کی روش کے خلاف ہے۔ 29 اگست 2012 کو ان کی شخصیت پر مبنی ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا، اس ٹکٹ کی قیمت 500 پیسے یعنی 5 روپے تھی۔

مجروح سلطانپوری: (1 اکتوبر 1919 تا 24 مئی 2000)

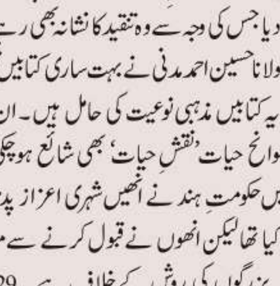

اسرار الحسن خان المعروف مجروح سلطانپوری نے درسِ نظامی کی بھی تکمیل کی اور طب یونانی سے بھی وابستہ رہے لیکن دامنِ سخن سے وابستگی کی بدولت انھیں کامیابی اور شہرت نصیب ہوئی۔ انھوں نے 300 سے زائد فلموں کے لیے ہزار ہا گیت تحریر کیے۔ مقبول گیت کار ہونے کے باوجود ادب کے وقار اور تہذیب کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ انھوں نے غزل کو اس وقت سینے سے لگایا جب اسے دوسری اصناف پر فوقیت دی جا رہی تھی۔ ان کا اولین مجموعۂ کلام 'غزل 1956' میں شائع ہوا 1999 میں اس مجموعے کو ترتیب و اضافے کے ساتھ 'مشعلِ جاں' نام سے پیش کیا گیا۔

فلم نگری اور اردو شاعری دونوں جگہ انھیں اعزاز و اکرام نصیب ہوا۔ ادبی خدمات کے لیے جہاں ان کی خدمات میں 'اقبال سمان' پیش کیا گیا وہیں فلم نگری میں سب سے بڑا اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ (1993) سے سرفراز ہونے والے اولین گیت کار ہونے کا شرف انہیں حاصل ہوا۔

3 مئی 2013 کو مجروح سلطانپوری پر ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا، اس ٹکٹ کی قیمت 500 پیسے یعنی 5 روپے تھی۔

شکیل بدایونی: (3 اگست 1916 تا 20 اپریل 1970)

شکیل بدایونی شاعر بھی تھے اور گیت کار بھی۔ ان کے فلمی گیتوں کی مقبولیت کے سبب ہی 'گیت کار اعظم' پکارے گئے۔ فلم فیئر ایوارڈ برائے نغمہ نگاری مسلسل تین برس پانے والے شکیل اکلوتے شاعر ہیں۔ انھیں 1961 میں فلم 'چودھویں کا چاند' کا نغمہ 'چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو...' کے لیے، 1962 میں فلم 'گھرانہ' کے نغمہ 'حسن والے تیرا جواب نہیں' کے لیے اور 1963 میں فلم '20 سال بعد' کے گیت 'کہیں دیپ جلے کہیں دل' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ دیا گیا۔ ان کے پانچ عدد شعری مجموعے غمِ فردوس، صنم وحرم، رعنائیاں، رنگینیاں اور 'شبستاں' شائع ہوئے۔

3 مئی 2013 کو شکیل بدایونی کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا۔ اس ٹکٹ کی قیمت 500 پیسے یعنی 5 روپے تھی۔

ساحر لدھیانوی: (8 مارچ 1921 تا 25 اکتوبر 1980)

ساحر کے مجموعۂ کلام 'تلخیاں' نے جہاں بے مثل کامیابی حاصل کی وہیں پردۂ سیمیں کے لیے لکھے ان کے گیت، فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ رعنائی خیال، حسنِ بیان اور اجنبی تشبیہوں اور استعاروں سے گریز کی بدولت ان کے فن کو اردو ادب میں ممتاز مقام حاصل ہوا۔ الفاظ کے بیش قیمتی موتیوں سے ساحر نے دولت بھی کمائی اور دنیا کو خواب بھی دکھائے لیکن عمر بھر ماضی سے گریزاں، حال سے ناآسودہ اور مستقبل سے ہراساں سے رہے۔

8 مارچ 2013 کو ساحر کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا، اس ٹکٹ کی قیمت 500 پیسے یعنی 5 روپے تھی۔

مولانا حسرت موہانی: (1875 تا 13 مئی 1951)

سید فضل الحسن حسرت موہانی سیاسی رہنما، رومانوی شاعر اور راہِ سلوک سے وابستہ، شریعت کے پیروکار باعمل مسلمان تھے۔ انھوں نے اردوئے معلیٰ کی ادارت بھی کی اور احمد آباد کانگریس اجلاس میں مکمل آزادی کی وکالت بھی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی سے بھی وابستہ رہے اور دستور ساز اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ مختار مسعود کے مطابق، 'ان کی ذات کی تقسیم یوں ہوئی کہ دماغ سیاست کو ملا، دل شاعری کو بخشا گیا اور پیشانی عبادت کے لیے وقف ہو گئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حسرت نے جسم کے ہر حصے کو تین خانوں میں تقسیم کر رکھا ہو۔ کہنے کو دل ایک تھا مگر محض سیاست، سلوک اور شاعری سے بھی سنگ وخشت۔ کبھی گداز و نرم اور کبھی شوخ و گستاخ۔ حسرت کا کمال ہے کہ بیک وقت تین راہوں پر مختلف سمتوں میں چلتے رہے۔ نہ کوئی راہ گم کی اور نہ کسی منزل سے محروم رہے۔ ان کے یہاں سیاست، سلوک اور شاعری خلط ملط نہیں ہوتے۔ وہ باغیانہ تقریریں کرتے ہیں مگر باغیانہ اشعار سے پرہیز کرتے ہیں۔ شعر میں کھل کر معاملہ کے مضامین باندھے اور زندگی میں سختی سے آداب و اخلاق کی پابندی روا رکھی۔ ان میں شاعر جتنا نرم خو چھپا ہوا تھا۔ لیڈر اتنا ہی تند خو تھا۔ ان کے شعر حریر و پرنیاں تھے، ذات خشک و درشت اور صفات منبر ومحراب۔' (مختار مسعود، آوازِ دوست، 1972، ص 104-05)

کرشن چندر: (23 نومبر 1914 تا 8 مارچ 1977) کرشن چندر ایشیا کے مقبول ترین مصنّفین میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں۔ ان کے تحریر کردہ افسانے اور ناول علاقائی زبانوں کے علاوہ بین الاقوامی زبانوں میں ترجمے کیے گئے۔ ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ روسی زبان میں کتابوں کے ترجمے کے علاوہ روس کے مختلف ثقافتی دوروں میں انھیں یاد رکھا گیا۔

افسانے اور ناول کے علاوہ انھوں نے فلموں کے لیے مکالمے بھی لکھے۔ 50 سے زائد فلموں میں خصوصاً ممتا، شرافت، دو چور، منچلی، ہمراہی، چمبل کی رانی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

■

Ismail Wafa
S. No 114/1-4, Near Pawarwadi Police Station
Pawarwadi, Malegaon
Distt.: Nasik - 423203 (Maharashtra)
Mob.:8857959406

عتیق الرحمن

گلستان سعدی

فارسی کی ایک اہم نثری تصنیف

سوانح حیات

فارسی ادب کے مشہور و معروف نثر نگار اور شاعر شیخ سعدی شیرازی کی پیدائش ایران کے مردم خیز خطہ شیراز میں ہوئی جو صدیوں سے ایران کا پایہ تخت اور علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ نام شرف الدین، لقب مصلح، تخلص سعدی اور شیراز کو وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ شیخ نے جب آنکھ کھولی تو شیراز میں علما، فضلا و مشائخ کا ہجوم تھا اور اس ماحول میں سعدی میں تحصیل علم کا ولولہ پیدا ہونا لازمی تھا۔ لیکن ان دنوں ایران اور خاص طور سے شیراز طوائف الملوکی کے دور سے گزر رہا تھا اور سعدی نے اپنے تعلیمی مشغلے کو جاری رکھنے کے لیے بغداد کا رخ کیا اور شہرۂ آفاق مدرسہ دارالعلوم نظامیہ سے فراغت حاصل کی۔

گلستان سعدی ان کی مقبول ترین کتاب ہے۔ شیخ سعدی نے یہ کتاب 656ھ میں شہزادہ سعد بن ابو بکر زنگی کے نام معنون کی، گلستاں اخلاق و موعظت کا ایک بہترین مرقع ہے، اس میں ایک مقدمہ اور آٹھ ابواب ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے وسائل نہ ہونے کے باوجود گلستاں شیخ سعدی کی زندگی ہی میں ایران، ترکستان، تاتار اور ہندوستاں میں پھیل گیا تھا۔

مولانا قاضی سجاد حسین گلستاں کی مقبولیت پر لکھتے ہیں:

''غور تو کرو گلستاں میں نہ غزل عاشقانہ ہے نہ قول عارفانہ، نہ بہادروں کے کارنامے، نہ فوق العادت قصے، نہ حقائق و معارف، نہ اسرار شریعت، نہ نقاط طریقت بلکہ اس کی بنیاد محض اخلاق و پند و موعظت پر رکھی گئی جس سے زیادہ بے نمک مضمون نہیں ہوسکتا۔ اس پر بھی وہ اس قدر مقبول ہوئی، اور محض اس لیے ہوئی کہ فصاحت و بلاغت، حسن بیان اور لطائف ادا کے لحاظ سے تمام فارسی ادب میں بے مثل اور لاجواب ہے اس لیے دنیا کی ہر زندہ قوم نے گلستاں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور گلستاں زندۂ جاوید بن چکی ہے۔''

(گلستاں، ترجمہ قاضی سجاد حسین، سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ص4)

گلستاں کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سات سو سال سے زائد کا وقفہ گزر جانے کے بعد بھی اس کی ادبی معنویت اور چاشنی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ گلستان سعدی مندرجہ ذیل آٹھ ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: در سیرت پادشاہاں (بادشاہوں کی سیرت کے بارے میں)
باب دوم: در اخلاق درویشاں (درویشوں کے اخلاق کے بیان میں)
باب سوم: در فضیلت قناعت (قناعت کی فضیلت کے بیان میں)
باب چہارم: در فوائد خاموشی (خاموشی کے فواید کے بارے میں)
باب پنجم: در عشق و جوانی (عشق اور جوانی کے بارے میں)
باب ششم: در ضعف پیری (بڑھاپے کی کمزوری کے بارے میں)
باب ہفتم: در تاثیر تربیت (پرورش کی تاثیر کے بارے میں)
باب ہشتم: در آداب صحبت و حکمت (صحبت اور حکمت کے آداب میں)

گلستاں کے آٹھوں ابواب اپنے موضوع کے لحاظ سے، حکمت، پند، موعضت و منفرد بیان اور جا بہ جا عربی مقولے کی آمیزش کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہیں اور یہی پر لطف بیان گلستاں کو اور فارسی کی دوسری نثری کتابوں کے درمیان انشا پردازی میں صف اول میں لا کھڑا کرتا ہے گلستاں کا دیباچہ اس کی افادیت کو اور جلا بخشتا ہے:

گلستاں سعدی کا پہلا باب جو بادشاہوں کی سیرت کے بیان میں ہے اس میں مختلف حکایتیں منفرد انداز میں بیان کی گئی ہیں مثلاً میں گلستاں کی تیسری حکایت کو اردو ترجمہ کے ساتھ نقل کرتا ہوں:

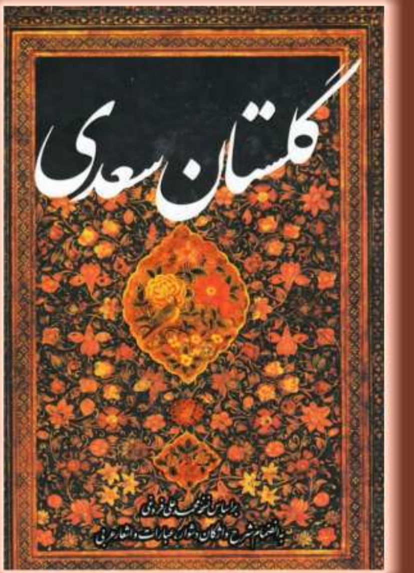

غور تو کرو گلستاں میں نہ غزل عاشقانہ ہے نہ قول عارفانہ، نہ بہادروں کے کارنامے، نہ فوق العادت قصے، نہ حقائق و معارف، نہ اسرار شریعت، نہ نقاط طریقت بلکہ اس کی بنیاد محض اخلاق و پندوموعظت پر رکھی گئی جس سے زیادہ بے نمک مضمون نہیں ہو سکتا۔ اس پر بھی وہ اس قدر مقبول ہوئی، اور محض اس لیے ہوئی کہ فصاحت وبلاغت، حسن بیان اور لطائف ادا کے لحاظ سے تمام فارسی ادب میں بے مثل اور لا جواب ہے اس لیے دنیا کی ہر زندہ قوم نے گلستاں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور گلستاں زندئہ جاوید بن چکی ہے۔

''ایک شاہزادے کو میں نے سنا کہ وہ چھوٹے قد کا اور حقیر صورت والا تھا اور اس کے دوسرے بھائی لمبے اور خوبصورت تھے۔ ایک مرتبہ باپ نے کراہت اور حقارت سے اسے دیکھا تو بیٹے نے اپنی دانائی اور چالاکی سے سمجھ لیا اور کہا اے باپ چھوٹے قد کا عقلمند بہتر ہے لمبے قد کے بے وقوف سے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو چیز قد میں بڑی ہو قیمت میں بھی بہتر ہو۔''

دوسرا باب فقیروں کے اخلاق کے بارے میں ہے اور یہ باب بھی اپنی ادبی خوبیوں کی وجہ سے اپنا مقام رکھتا ہے۔ شیخ سعدی نے اس میں درویشوں، فقیروں اور بزرگوں کے مختلف اخلاق و خصائص کو بہت عمدہ اور اعلی انداز میں بیان کیا ہے اور اس کی خوبی کا اندازہ اس باب کی پہلی حکایت سے لگایا جا سکتا ہے۔ میں اس باب کی

حکایت کا اردو ترجمہ پیش کرتا ہوں:

''بزرگوں میں سے ایک نے ایک پارسا سے دریافت کیا کہ فلاں عابد کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جبکہ دوسروں نے ان کے حق میں عیب بیان کیے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ میں اس کے ظاہر میں کوئی عیب نہیں دیکھتا ہوں اور اس کے باطن کا پوشیدہ حال میں نہیں جانتا ہوں اس لیے کہ علم غیب خدا کے سوا کسی اور کو نہیں ہے۔''

تیسرا باب قناعت کی فضیلت کے بیان میں ہے
اس میں سعدی نے قناعت کی بڑائی اور مختلف خوبیوں کو منفرد انداز میں بڑے ہی حسن وخوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ایک حکایت مندرجہ ذیل ہے:

''میں نے ایک درویش کے متعلق سنا کہ وہ فاقے کی آگ میں جلتا تھا اور پیوند پر پیوند لگاتا تھا اور دل کی تسلی کے لیے یہ شعر پڑھتا تھا، جس کا مفہوم یہ ہے۔

ہم خشک روٹی اور پھٹے پرانے کپڑوں پر قناعت کرتے ہیں کیونکہ اپنی جان پر محنت وسختی برداشت کرنا خلقت کے احسان کا بوجھ اٹھانے سے بہتر ہے۔

باب چہارم خاموشی کے فوائد کے بیان میں ہے
جس میں شیخ سعدی نے کم گوئی یا کم بات کرنے کے فائدے کے بارے میں بحث کی ہے اور اس کے مختلف جزو کو گنائے ہیں اسی موضوع پر میں اس باب کی پہلی حکایت نقل کرتا ہوں:

''میں نے ایک دوست سے کہا مجھے گفتگو سے باز (خاموش رہنا) اس لیے پسند آیا کہ اکثر اوقات اچھی اور بری بات کرنے کا اتفاق ہوتا ہے اور دشمنوں کی آنکھیں سوائے برائی کے نہیں پڑتی ہیں یعنی دشمنوں کی نظروں میں برائی ہی پر پڑتی ہیں۔ اس دوست نے کہا اے بھائی دشمن وہی اچھا ہے جو نیکی نہ دیکھے۔''

باب پنجم میں عشق وجوانی کے مختلف پایے کو حکایت کے پیرایہ میں بیان کر کے شیخ سعدی نے انشا پردازی کے جوہر کو بخوبی نبھایا ہے اور اس کو متعدد حکایتوں کے ذریعے اس باب میں بہترین پیرایے میں بیان کیا ہے اسی ضمن میں میں ان کی ایک حکایت یہاں پر نقل کرتا ہوں:

''لوگوں نے حسن میمندی سے پوچھا کہ سلطان محمود اتنے حسن والے غلام رکھتا ہے کہ ان میں ہر ایک نادر زمانہ ہے، کیا وجہ ہے جو محبت ورغبت وہ ایاز کے ساتھ رکھتا ہے۔ حالانکہ وہ زیادہ حسین نہیں ہے وہ محبت کسی اور کے ساتھ نہیں رکھتا۔ حسن نے جواب دیا کہ جو چیز دل میں گھر کر جاتی ہے یعنی دل میں جگہ بنا لیتی ہے وہی آنکھوں کو اچھی لگتی ہے۔''

باب ششم بڑھاپے کی کمزوری کے بارے میں ہے
اس میں شیخ نے مختلف حکایتوں کے ذریعے ضعف وپیری کے موضوع کو زیر بحث لا کر مثال کے ساتھ بڑے پرلطف پیرایے میں بیان کیا ہے، ایک حکایت اسی موضوع پر مندرجہ ذیل ہے:

''ایک بوڑھے کا قصہ بیان کرتے ہیں۔ کہ اس نے ایک نو جوان لڑکی سے شادی کی تھی اور کمرے کو پھولوں سے سجایا تھا۔ تنہائی میں اس کے ساتھ بیٹھا دل اور آنکھیں اس کی طرف لگائے ہوئے رات رات بھر جاگتا اور قصے اور لطیفے بیان کرتا۔ تاکہ اس کی گھبراہٹ اور نفرت دور ہو جائے اور وہ لڑکی مانوس ہو جائے۔ ایک رات وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ تیرا بلند نصیبہ مددگار تھا اور دولت کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی کہ ایک ایسے بوڑھے کی صحبت میں آئی جو عقلمند، تجربہ کار، زمانے کے سرد اور گرم کو آزمائے ہوئے ہے، صحبت کے حقوق جانتا ہے اور دوستی کی شرطیں بجا لاتا ہے، شفقت کرنے والا، مہربان، خوش طبع اور شیرین زبان ہے۔''

ساتواں باب پرورش کی تاثیر کے بیان پر مبنی ہے
اس میں شیخ سعدی نے پرورش اور اس کے طریقۂ کار پر سیر حاصل بحث کی ہے اور حکایتوں کے ذریعے پرلطف و پرمعنی انداز میں لفظوں کی آمیزش کی ہے اور انشاپردازی کی بہترین مثال پیش کی ہے اسی موضوع پر ان کی ایک حکایت مندرجہ ذیل ہے:

''ایک وزیر کا لڑکا نہایت کند ذہن اور احمق تھا اس کو ایک عالم کی خدمت میں بھیجا اور کہلایا کہ اس کی تعلیم و تربیت کیجیے شاید عقلمند ہو جائے۔ اس عالم نے بہت دنوں تعلیم دی یعنی بڑھاپے میں سر مارا۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ آخرکار اس کو اس کے باپ کے پاس بھیج دیا کہ عقلمند نہیں ہوتا ہے بلکہ مجھ کو پاگل بنا دیا۔''

گلستاں سعدی کا آٹھواں اور آخری باب صحبت کے آداب کے بیان میں ہے جس میں سعدی نے صحبت کے آداب کو بڑے آسان وسلیس انداز اور بڑے پرکیف پیکر میں سجا کر نثر نگاری کو اور نکھارا ہے اسی ضمن میں ان کی ایک حکایت نقل کرتا ہوں:

''مال زندگی کی راحت (آرام) کے لیے ہے۔ نہ کہ زندگی مال جمع کرنے کے لیے۔ لوگوں نے ایک عقلمند سے پوچھا خوش نصیب کون ہے؟ اس نے کہا نیک بخت وہ ہے جس نے کھایا اور (آخرت) بویا۔ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا۔ بدبخت وہ ہے جو مر گیا اور مال چھوڑ گیا۔''

سعدی کی ادبی خوبیاں

شیخ سعدی کی جادو بیانی اور فصاحت و بلاغت کا چرچا اس کی زندگی ہی میں تمام ایران، ترکستان، تاتار اور ہندوستان میں اس قدر پھیل گیا تھا کہ اس زمانے کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد اس پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ خود شیخ بھی دیباچے میں کہتے ہیں:

''ذکر جمیل سعدی کہ در افواہ عوام افتادہ، وصیت سخنش کہ در بسیط زمین رفتہ۔''

(حیات سعدی، مولانا الطاف حسین حالی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص 58)

''چمبرز انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ سعدی کے کلام کی لطافت اور بذلہ سنجی روما کے مشہور شاعر ہوریس کے کلام سے بہت ملتی ہے۔ چونکہ سعدی کو لاطینی زبان آتی تھی، اس لیے ظن غالب ہے کہ وہ ہوریس کے کلام سے مستفید ہوا ہوگا۔''

لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ دونوں کتابیں حسن قبول، فصاحت و بلاغت، تہذیب اخلاق، پند ونصیحت اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم دگر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے، بلکہ ان پر عربی مقولہ صادق آتا ہے کہ "احد هما افضل من الاخر"لیکن اگر بعض وجوہ سے گلستاں کو بوستاں پر ترجیح دی جائے تو کچھ بے جا نہیں ہے۔

(حیات سعدی، مولانا الطاف حسین حالی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص 73)

گلستاں اور بوستاں، شیخ سعدی شیرازی کے کلام کا خلاصہ اور لب ولباب ہے عموماً فارسی زبان میں دیگر اور کوئی کتاب اس پایے اور مقام کو نہیں پہنچ پائی جو ان دونوں کتابوں کو حاصل ہے۔

منابع وماخذ

1 گلستان سعدی، سعدی شیرازی، مترجم قاضی سجاد حسین، سب رنگ کتاب گھر، دہلی
1 گلستان، سعدی شیرازی، مترجم ومحشی، مولانا قاضی سجاد حسین، مکتبہ رحمانیہ، لاہور
3 بوستان، سعدی شیرازی، مترجم ومحشی، مولانا قاضی سجاد حسین، مکتبہ رحمانیہ، لاہور
4 بوستاں سعدی، سعدی شیرازی، مترجم قاضی سجاد حسین، سب رنگ کتاب گھر، دہلی
5 حیات سعدی، مولانا الطاف حسین حالی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1960
6 سرسید اور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، سید عبداللہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
7 حیات سعدی، الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی

Dr. Atiqur Rahman
Assistant Professor of Persian
Dept. of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies, Bhasha Bhavana
Visva-Bharati (A Central University),
Santiniketan, West Bengal
Mibile No: 9635193411
Email: atiqura044@gmail.com

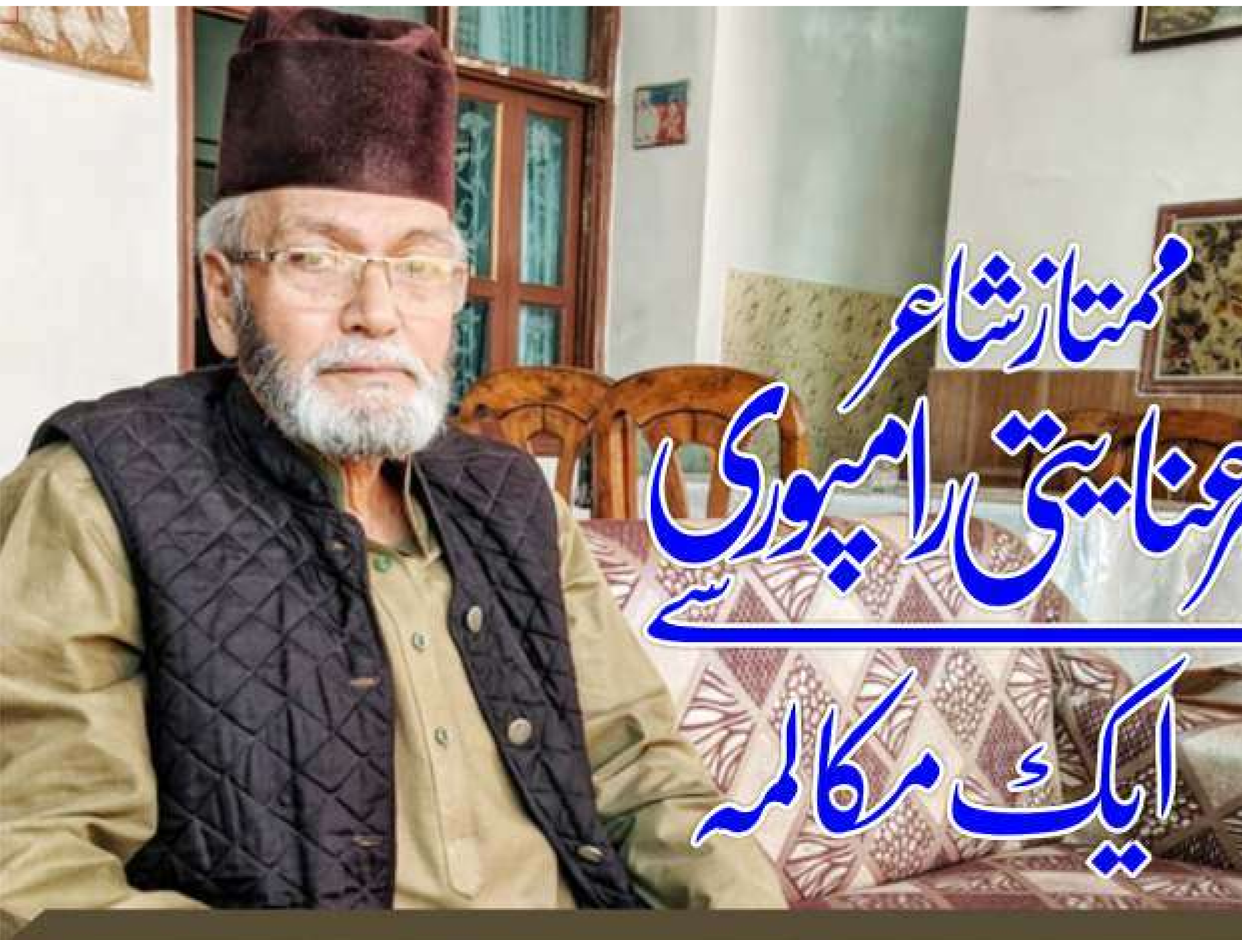

ساجد جلال پوری

ممتاز شاعر اظہر عنایتی رامپوری سے ایک مکالمہ

دبستان دہلی و لکھنؤ کے بعد رامپور اردو ادب کا اہم گہوارہ رہا ہے نوابین رامپور کی ادب نوازی اور اردو کی سرپرستی نے یہاں بڑے بڑے شعرا کو جنم دیا دلی کی تباہی کے بعد بیشتر شعرا نے یہاں پناہ لی دربار سے وابستگی اختیار کی وہاں کی رضا لائبریری قدیم و نادر کتابوں اور مخطوطات کے حوالے سے دنیا میں مشہور ہے- ماضی کا وہ زمانہ اور اردو کا وہ زریں عہد تو اب واپس نہیں آ سکتا لیکن ابھی بھی کچھ شخصیتیں ایسی موجود ہیں جن سے یہ دبستان منو رہے- جن میں مستند و بزرگ شاعر اظہر عنایتی صاحب جن کے بعض اشعار نہ صرف مقبول و مشہور ہیں بلکہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں- پیش خدمت ہے اُن سے عزادار حسین ساجد جلالپوری کی خصوصی گفتگو:

ساجد جلالپوری آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

اظہر عنایتی رامپوری: میں 15 اپریل 1946 کو رامپور کے ایک معزز پٹھان گھرانے گھیر ملکیان میں پیدا ہوا، یہ گھیر میرے اجداد کی یادگار ہے اور اس کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ جب شہزادہ مراد نے مرادآباد کو فتح کیا تو میرے جدِ امجد رستم خاں دکنی شہزادہ مراد کی فوج میں سپہ سالار تھے، انھوں نے ہی اس شہر کا نام شہزادہ مراد کے نام پر مرادآباد تجویز کیا، جس سے خوش ہو کر شہزادے نے ہمارے خاندان کو ملکیں عطا کیں۔ اسی سبب اس گھیر کا نام گھیر ملکیان پڑا۔ یہ رامپور کا سب سے پرانا گھیر ہے جس کے در و دیوار آج بھی اپنی عظمتِ رفتہ کی گواہی دے رہے ہیں۔ یہاں مجھے اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے کہ۔

ابھی ہیں کچھ پرانی یادگاریں تم آنا میرا شہر دیکھنے کو

س ج: اپنے خاندانی تعارف اور خاندانی پس منظر سے آگاہ کریں۔

ا ع د: میرے چچا کلب علی خاں فائق جو میرے والد کے ماموں زاد بھائی تھے، جن کا ہندو پاک کے اہم محققین میں شمار ہوتا ہے، تقسیم کے بعد ہجرت کر کے لاہور چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ رسالہ صحیفہ جو اپنے وقت کا بڑا موقر اور معتبر رسالہ تھا کلب علی خاں فائق اور احمد ندیم قاسمی صاحب کی زیرادارت ہی لاہور سے نکلتا تھا۔

کلب علی چچا اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان ہے 'خاندانِ ملکیان کا گوہر شب چراغ' جو میری کتاب 'اظہر عنایتی ایک سخنور' میں شامل ہے، میرے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں: ''اظہر علی خاں اظہر عنایتی ابنِ صفدر علی خاں ابنِ محمود علی خاں خلف مولوی نیاز علی خاں ضبط ابن کریم اللہ خاں، ابنِ مشرف خاں، ابنِ اسمٰعیل خاں ایسے خاندان کا فرد ہے جس کے اسلاف کے ہاتھوں میں کبھی تیغ آبدار تھی تو انھوں نے اس کے جوہر دکھا کر ملک بھر میں اپنی شان و سطوت کا نمونہ پیش کیا تھا اور جب تغیراتِ زمانہ کے باعث تلوار ہاتھ سے چھوٹی تو قلم اور زبان کے جوہر دکھائے۔ ان کی نظم و نثر کے نمونے آج بھی کتاب خانوں کی زینت ہیں۔

ملکیوں کا خاندان رامپور میں مہذب اور تعلیم یافتہ خاندان تھا، سلطان ابراہیم لودھی کی نسل سے ان افراد کا تعلق تھا اور اسی لیے نوابانِ رامپور اس خاندان کو احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

میرے والد کے چچازاد بھائی عزیز اللہ خاں عزیز اسی گھیر ملکیان سے مشہور زمانہ رسالہ 'نیرنگ' نکالا کرتے تھے، عزیز چچا کے انتقال کے بعد ان کے تربیت یافتہ عشرت رحمانی کی زیرِ صدارت یہ رسالہ 'نیرنگ' دہلی سے نکلنے لگا۔ ہمارے گھیر ملکیان کے پھاٹک کی چھت پر نیشنل کانگریس کا دفتر تھا اور یہیں سے نیشنل کانگریس کی ساری تحریکوں کا آغاز ہوتا تھا۔ میرے والد صفدر علی خاں اور دادا احمد علی خاں کا شہر کے معزز اور تعلیم یافتہ افراد میں شمار

ہوتا تھا۔ سماع کی محفلوں اور مشاعروں کا انعقاد میرے گھر میں اکثر ہوا کرتا تھا۔ شاد عارفی جو ہماری اردو شاعری کی دنیا کا ایک بہت اہم اور بڑا نام ہے، میرے والد کے خالہ زاد بھائی تھے، محشر عنایتی صاحب جو میرے استاد ہیں، میرے رشتے کے بہنوئی بھی ہوتے تھے، اور مولوی حکیم نجم الغنی خاں جیسے متبحر عالم جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے میرے حقیقی بڑے چچا واحد علی خاں کے خسر تھے۔ یہ وہ ماحول اور خاندانی پس منظر تھا جو مجھے شاعری کی طرف لے کر آیا۔

س ج: آپ کی تعلیم وتربیت کہاں اور کیسے ہوئی؟

ا ع د: میں نے 1964 میں گورنمنٹ ڈگری کالج رامپور سے گریجویشن کیا، 1965 میں، میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں .LL.B میں داخلہ لیا، لیکن اٹینڈینس فال ہونے کی وجہ سے امتحان میں شریک نہیں ہوسکا۔ 1966 میں، میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں Law کلاسیز جوائن کی اور وہاں سے 1967 میں .LL.B کی ڈگری حاصل کی اور یہاں رامپور آ کر مشہور وکیل اسلم خاں صاحب کے جونیئر وکیل کی حیثیت سے وکالت کا آغاز کیا لیکن وکالت کے خشک پیشے اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کا ماحول میری طبیعت کو چند سال سے زیادہ راس نہیں آ سکا اور وکالت کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر میں شاعری کا ہوگیا۔ اب سابقہ ایڈوکیٹ ہونے کا اعزاز ہے، شاعری ہے، ملک اور بیرونِ ملک کے مشاعرے ہیں اور میں ہوں۔

س ج: آپ کے ادبی سفر کی ابتدا کیسے ہوئی؟

ا ع د: مجھے شاعری اپنے والد اور دادا سے ورثے میں نہیں ملی۔ میرے پر دادا مولوی نیاز علی خاں ضبط ضرور شاعر تھے اور امیر مینائی کے شاگرد تھے، گھر میں جب مشاعرے اور شعری نشستیں ہوا کرتی تھیں اور ان میں شاعروں کو جب داد ملتی تھی تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا اور اندر سے شاعر بننے کی تمنا پیدا ہوتی تھی، اللہ نے آواز اچھی عطا کی تھی، کچھ اپنے پسندیدہ شاعروں کی غزلیں بڑی خوش الحانی سے پڑھتا تھا، والد کا انداز مجھ سے بہت دوستانہ تھا، ایک دن کہنے لگے 'تم خود شعر کہنے کی کوشش کرو، میں تمہیں محشر عنایتی کا شاگرد کروادوں گا۔'' یہ سہارا اور یہ اجازت پا کر میں نے شعر کہنے کی کوشش شروع کی اور رفتہ رفتہ میرے اندر کی وہ شاعرانہ صلاحیت بیدار ہونے لگی جو اللہ کی طرف سے مجھے ودیعت ہوئی تھی۔ 1958 میں 12 سال کی عمر میں، میں نے حضرتِ محشر کی باضابطہ شاگردی اختیار کی اور اس طرح میں اظہر علی خاں سے اظہر عنایتی بن گیا۔

س ج: آپ کی پہلی تخلیق کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟

ا ع د: میری پہلی غزل 1959 میں روزنامہ 'ناظم' رامپور میں شائع ہوئی جس کا مطلع یہ تھا۔

وقتِ سحر جو رخ پہ وہ گیسو بکھر گئے
کچھ راہ گیر شام سمجھ کر ٹھہر گئے

س ج: دبستانِ رامپور کے ماضی وماحول پر تھوڑی روشنی ڈالیں۔

ا ع د: میرا شہر 'رامپور' نوابوں اور پٹھانوں کا شہر ہے، 1974 میں نواب فیض اللہ خاں صاحب نے اس شہر کو آباد کیا اور دس نوابوں نے اس شہر پر حکمرانی کی اور اس کی شہرت، شوکت اور عظمت میں اضافے کیے، نواب فیض اللہ خاں کو تو جنگوں اور امورِ ریاست میں مصروفیت کے باعث شعر وادب کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا، لیکن ان کے چھوٹے بھائی محمد یار خاں 'امیر' جو فیض اللہ خاں کے کہنے پر آنولہ سے منتقل ہوکر رامپور آئے اور انھوں نے یہاں شعر وشاعری کی ایک مستقل محفل سجا دی جس کی رونق قائم چاند پوری، حکیم کبیر علی انصاری کبیر، پروانہ علی شاہ، قدرت اللہ شوق اور عنبر شاہ خاں آشفتہ جیسے باکمال شعرا بنے۔ نواب محمد یار خاں 'امیر' خود ایک باکمال شاعر تھے، جن کے کچھ اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں مثلاً۔

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا
گر وقتِ ذبح نالہ کیا میں تو کیا ہوا
پیارے کسی کا ہاتھ، کسی کی زباں چلے

اس طرح متذکرہ بالا شعرا کے جمع ہونے سے رامپور میں ایک دبستان کی بنیاد پڑ گئی۔ قائم چاند پوری جو اس دبستان کے بنیاد گزاروں میں ہیں، ان کا انتقال بھی رامپور ہی میں ہوا اور مدرسہ کہنہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ آج بھی ان کی قبر شائقینِ شعر وادب کی عقیدتوں اور دعاؤں کا مرکز ہے۔

محمد یار خاں امیر اور قائم چاند پوری کے قائم کردہ اس دبستان کا سلسلہ دربارِ نواب یوسف علی خاں تک پہنچا جہاں آپ کی ملاقات غالب، داغ، امیر مینائی اور نظام رامپوری جیسے عظیم المرتبت شعرا سے ہوتی ہے۔ دلّی اور لکھنؤ کے اجڑ جانے کے بعد ہر شعبۂ حیات کے مشاہیر نواب یوسف علی خاں کے سایۂ عاطفت میں آ گئے تھے۔ یوسف علی خاں خود ایک اچھے شاعر تھے اور مرزا غالب کے شاگرد تھے، ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ناظم ہمیں تتبع غالب پہ ناز ہے

نواب یوسف علی خاں مرحوم کی تاریخی ادب نوازی کی

میرا شہر 'رامپور' نوابوں اور پٹھانوں کا شہر ھے، 1974 میں نواب فیض اللہ خاں صاحب نے اس شہر کو آباد کیا اور دس نوابوں نے اس شہر پر حکمرانی کی اور اس کی شہرت، شوکت اور عظمت میں اضافے کیے، نواب فیض اللہ خاں کو تو جنگوں اور امورِ ریاست میں مصروفیت کے باعث شعر و ادب کی طرف توجہ کرنے کا موقع نھیں مل سکا، لیکن ان کے چھوٹے بھائی محمد یار خاں 'امیر' جو فیض اللہ خاں کے کھنے پر آنولہ سے منتقل ھوکر رامپور آئے اور انھوں نے یھاں شعر و شاعری کی ایک مستقل محفل سجا دی جس کی رونق قائم چاندپوری، حکیم کبیر علی انصاری کبیر، پروانہ علی شاہ، قدرت اللہ شوق اور عنبر شاہ خاں آشفتہ جیسے باکمال شعرا بنے۔

ہدایت کا یہ روشن سلسلہ رامپور کے آخری تاجدار نواب رضا علی خاں کے عہد تک آتا ہے جس میں شاد عارفی، محشر عنایتی، جلیل نعمانی، سحر رامپوری، خیال رامپوری جیسے شعرا، اس دبستانِ رامپور کی شعری عظمتِ رفتہ کو مزید عظمتوں اور شہرتوں سے ہمکنار کرتے نظر آتے ہیں۔ غزل کے لہجے کی جس انفرادیت اور جس بانکپن کی ابتدا 1974 میں محمد یار خاں امیر نے کی تھی، آج 2022 میں بھی رامپور کے شعرا نے اسے برقرار رکھا ہے، جبکہ دہلی اور لکھنؤ کے دونوں دبستان اپنے لہجے کی انفرادیت گنوا چکے ہیں۔ رامپور کے بانکپن کے لہجے کا میں ایک نمونہ اپنے ایک شعر کے حوالے سے آپ کے اور قارئین کے لیے پیش کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیں۔

تنگ ہوتا ہے تو ہو جائے مراسم کا حصار
شاخِ گل ہم بھی نہیں ہیں کہ لچکتے جائیں

س ج: آپ نے شاعری میں کس سے اصلاح لی اور کن شخصیات سے متاثر ہوئے؟

ا ع د: میں نے جیسا اوپر عرض کیا ہے کہ 1958 میں حضرتِ محشر عنایتی سے اپنی شعری اصلاح کے سلسلے کا آغاز کیا، محشر عنایتی صاحب رامپور کے مسلم الثبوت اور قادر الکلام اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، داغ دہلوی کے سلسلے کی ایک سنہری کڑی تھے۔

بڑے اور چھوٹے شعرا کی اس بھیڑ میں، میں نے اپنے لہجے کی انفرادیت کی طرف اپنی توجہ مرکوز کررکھی ہے اور کوشش کرتا ہوں کہ میں اپنی آواز کو اپنی پہچان بنا سکوں، اس حوالے سے کسی کا اثر قبول کرنے میں، میں یقین نہیں رکھتا۔ لہجے کے اعتبار سے میں میر کو بہت پسند کرتا ہوں، مشاہیر اساتذہ کی عظمتوں کا دل سے معترف ہوں اور اپنے دور کے جو اچھے شعر کہنے والے ہیں ان شاعروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

س ج: شاعری کی زبان اور آپ کے لب و لہجے میں جو انفرادیت ہے، اس کے حوالے سے کچھ ارشاد فرمائیں۔

ا ع د: اس سوال کا جواب دینا میں اپنے قلم سے مناسب نہیں سمجھتا کیوں کہ یہ تعلّی ہو جائے گی۔ یہ اہلِ ادب کے سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی بات ہے، میں تو عدالتِ ادب میں اپنا سرمایۂ سخن لیے حاضر ہوں، اب فیصلہ ادب کے منصفوں کو کرنا ہے۔

> **جب سے میں نے وکالت کو چھوڑا ہے، شاعری ہی میرا ذریعۂ معاش بنی ہوئی ہے، میں کتابوں کو اپنا دوست سمجھتا ہوں، میرے پاس عمدہ کتابوں کا خاصا بڑا کلیکشن ہے، میرے دوستوں کا حلقہ بھی ملک اور بیرون ملک بہت بڑا ہے جو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، میں جن کے دلوں اور ذہنوں میں رہتا ہوں. مقامی دوست آتے رہتے ہیں اور میری نشست گاہ آباد رہتی ہے. مجھے موبائل چلانا بہت کم آتا ہے، لیکن فیس بک پر کبھی کبھی اپنے شعر ڈالتا رہتا ہوں.میری بیوی صوفیہ بڑی پڑھی لکھی اور کوآپریٹیو خاتون ہیں، ان کی رفاقتیں میری عمر کو بڑھاتی رہتی ہیں، اس طرح اللہ کے کرم سے بڑی خوش گوار زندگی گزر رہی ہے.**

پروفیسر شہزاد انجم صاحب نے میرے شعری حوالے سے ایک کتاب 'اظہر عنایتی ایک سخنور' کے نام سے مرتب کی ہے، جس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، مالکِ رام، احسان دانش، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر نثار احمد فاروقی، کلبِ علی خاں فائق، ڈاکٹر ثنیٰ رضوی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر نجم الدین نقوی اور ڈاکٹر انور سدید کے علاوہ بھی کتنے ہی سربرآوردہ اور عظیم اہلِ قلم کی صرف آرا نہیں، مفصل مضامین شامل ہیں۔ اگر کہیں وہ کتاب مل جائے تو اسے دیکھنے کی زحمت ضرور کریں۔ وہ اظہر شناسی کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے۔

س ج: آپ مشاعروں میں بھی مقبول ہیں اور ملک و بیرونِ ملک کے مشاعروں میں آپ نے کب سے شرکت کرنا شروع کیا ہے؟

ا ع د: میں ملک اور بیرونِ ملک کے مشاعروں میں 1970 سے شرکت کر رہا ہوں اور تقریباً نصف صدی کے بعد بھی یہ سفر ہنوز جاری ہے۔

س ج: مشاعروں کے سلسلے میں بیرونی ممالک میں آپ نے کہاں کہاں کا سفر کیا ہے؟

ا ع د: امریکہ، لندن، کنیڈا، پاکستان، قطر، سعودی عرب، مسقط، بحرین، دبئی، شارجہ، العین اور ابوظہبی۔ ان میں سے بیشتر ممالک میں چار چار پانچ پانچ بار اپنے ملک ہندوستان کی نمائندگی کی ہے۔ 2021 میں قطر میں 'جشنِ اظہر عنایتی' بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔

س ج: آپ کا ذریعہ معاش اور مشغولیات کیا ہیں؟

ا ع د: جب سے میں نے وکالت کو چھوڑا ہے، شاعری ہی میرا ذریعۂ معاش بنی ہوئی ہے، میں کتابوں کو اپنا دوست سمجھتا ہوں، میرے پاس عمدہ کتابوں کا خاصا بڑا کلیکشن ہے، میرے دوستوں کا حلقہ بھی ملک اور بیرونِ ملک بہت بڑا ہے جو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، میں جن کے دلوں اور ذہنوں میں رہتا ہوں۔ مقامی دوست آتے رہتے ہیں اور میری نشست گاہ آباد رہتی ہے۔ مجھے موبائل چلانا بہت کم آتا ہے، لیکن فیس بک پر کبھی کبھی اپنے شعر ڈالتا رہتا ہوں۔ میری بیوی صوفیہ بڑی پڑھی لکھی اور کوآپریٹیو خاتون ہیں، ان کی رفاقتیں میری عمر کو بڑھاتی رہتی ہیں، اس طرح اللہ کے کرم سے بڑی خوش گوار زندگی گزر رہی ہے۔

س ج: اب تک نظم و نثر میں آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

ا ع د: میں نے نثر میں مضمون اور کچھ شعرا کی شاعری پر تبصرے تو ضرور لکھے ہیں لیکن نثر نگاری کے حوالے سے میری کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ 1980 میں میرا پہلا شعری مجموعہ 'خود کلامی' اور 1989 میں 'اپنی تصویر' اور 2004 میں تیسرا شعری مجموعہ 'جھونکا نئے موسم کا' شائع ہوا۔ 2004 میں میری شخصیت اور فن کے حوالے سے ایک مخصوص کتاب جو ہند و پاک کے مشہور اہلِ قلم کے مضامین پر مشتمل ہے، پروفیسر شہزاد انجم نے ترتیب دی اور نیشنل بک ہاؤس، دلی سے شائع ہوئی۔ 2006 میں گورنمنٹ رضا لائبریری رامپور نے ہندی رسم الخط میں ایک ضخیم کتاب 'اظہر عنایتی اور غزل' کے نام سے اس وقت کے ڈائریکٹر ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی مرحوم کی زیر نگرانی چھاپی۔ 1921 میں عینی پبلی کیشن جے پور نے 'دریچے میں چاند' کے عنوان سے ہندی میں میرا ایک مجموعہ شائع کیا، جو ایمازان پر اویلیبل ہے۔

س ج: کیا آپ کو سرکاری یا غیر سرکاری اعزازات سے نوازا گیا ہے؟

ا ع د: میرے ایوارڈس کی تفصیل اس طرح ہیں:

1 مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ 1990، غالب اکیڈمی دہلی (بدست صدرِ جمہوریہ ہند آنجہانی گیانی زیل سنگھ)
2 بنگال اُردو اکیڈمی ایوارڈ 1980
3 اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ 1981
4 اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ 1990
5 نشانِ بلدیہ ایوارڈ کراچی پاکستان، 1991
6 مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ 1997

اِن ایوارڈس کے علاوہ بھی کتنے ہی ایوارڈس سے مجھے سرفراز کیا گیا ہے۔

اعزازی ممبر شپ:

1 پریسیڈنٹ آف پیس کمیٹی 1994-95
2 ممبر آف اردو اکیڈمی، لکھنؤ 1994-95
3 ممبر آف ایڈوائزری کمیٹی آکاش وانی 1989
4 ممبر آف سنگم سنگیت کمیٹی آف آکاشوانی 2000
5 ممبر آف دی ریسرچ بورڈ آف ایڈوائزرس آف امریکن بایالوجیکل انسٹی ٹیوٹ آف واشنگٹن (امریکہ)

س ج: اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ یا قابلِ ذکر واقعہ بیان فرمائیں۔

ا ع د: میری سالگرہ کے موقع پر میرے ماموں سجاد علی خاں کی رہائش گاہ پر ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں شاد عارفی، محشر عنایتی، جمیل نعمانی، جلیل نعمانی، سحر رامپوری، خیال رامپوری، شوق اثری، واحد القادری، رئیس رامپوری، نازش نیازی اور صغیر رامپوری جیسے رامپور کے تمام اساتذہ اور مشاہیر شعرا شریک ہوئے۔ صدارت شاد عارفی صاحب نے فرمائی، نظامت کے فرائض محشر عنایتی صاحب نے انجام دیے۔ اس مشاعرے کے

مہمانِ خصوصی لاہور پاکستان سے آئے میرے رشتے کے بھائی محسن برلاس تھے، مشاعرے کی ابتدا کرنے کے لیے محشر عنایتی صاحب نے میرا نام پکارا، یہ ملحوظ رہے کہ یہ میرا کسی مشاعرے میں شرکت کا پہلا تجربہ تھا۔ سامعین میں میرے والد، چچا، ماموں، خالو وغیرہ سبھی موجود تھے۔ اس طرح سارے حمایتی میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، میں نے جب پرچہ جیب سے نکال کر غزل پڑھنا شروع کی تو دونوں ہاتھ بے اختیار کانپنے لگے، انھیں لرزتے ہوئے ہاتھوں اور لرزتی ہوئی آواز سے غزل مطلع سے مقطع تک پہنچی، یہ تھا مجمع کا رعب، جس کی یاد آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اب ہزاروں لوگوں کے مجمع میں غزل پڑھتے ہوئے نہ کوئی جھجک محسوس ہوتی ہے اور نہ ہاتھ کانپتے ہیں۔

س ج: دبستانِ رامپور ماضی میں ادب کا گہوارہ رہا ہے، آج کل وہاں ادبی سرگرمیوں کا کیا حال ہے؟

ا ع د: اس میں کوئی شک نہیں کہ دہلی اور لکھنؤ کے بعد رامپور کی تیسرے اسکول کی حیثیت رہی ہے اور شعر و ادب کی اہم خدمات کے حوالے سے اس شہر اور یہاں کے شعرا کی ایک روشن اور عظیم روایت رہی ہے، جس کے اعتراف کے بغیر ہماری اردو زبان اور شعر وادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی لیکن اس موجودہ دور میں ملک گیر سطح پر اردو زبان و ادب اپنے انحطاطی دور سے گزر رہے ہیں، دبستانِ رامپور بھی اس انحطاط کی حالت سے اچھوتا نہیں ہے۔ اب مولانا عرشی، مولانا عبدالسلام خاں، اکبر علی خاں عرشی زادہ، شبیر علی خاں شکیب، شاد عارفی، محشر عنایتی، جلیل نعمانی، سحر رامپوری، راز یزدانی، ہوش نعمانی، موج رامپوری خیال رامپوری، شوق اثری، رئیس رامپوری، نازش نیازی اور صغیر رامپوری جیسے تمام روشن چراغ رفتہ رفتہ خاموش ہو چکے ہیں۔ عابد رضا خاں بیدار جیسے چند لوگ ابھی باقی رہ گئے ہیں جن کا دم قیمتی بھی ہے اور غنیمت بھی۔ پہلے کوئی بڑی شخصیت اُٹھتی تھی تو اس کا کوئی نعم البدل (Substitute) مل جایا کرتا تھا، لیکن ہمارے اس دور کا المیہ یہ ہے کہ اب کوئی بڑی شخصیت جب ہم سے جدا ہوتی ہے تو اس کا Replacement نہیں ہوتا۔ بہرحال اس انحطاط اور مایوس کن صورت حال کے باوجود ابھی رامپور کا ادبی ماحول پوری طرح سرد نہیں ہوا ہے۔ مشاعرے، سمینار، ادبی ہنگامہ آرائیاں کمی سے سہی لیکن ہوتی رہتی ہیں۔

س ج: اردو زبان کی موجودہ صورت حال اور مستقبل پر آپ کی کیا رائے ہے؟

ا ع د: اردو زبان اس وقت بہت مشکل اور نازک دور سے گزر رہی ہے اور اس کا سبب ہم اردو والوں کی بے حسی بھی ہے۔ سرکار نے تو اس کو روزی روٹی سے دور کیا ہے لیکن ہم جو اپنی نئی نسلوں کو اپنی زبان اور اپنی اقدار منتقل کیا کرتے تھے اس روایت کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا ہے۔ افسوس ناک رخ یہ ہے کہ اس وقت اردو کے جو بڑے نام ہیں ان کے بچے اردو سے قطعی نابلد ہیں۔ یونیورسٹی اور کالج سے ہمارے جو بچے گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ ہوکر آتے ہیں انھیں اردو لکھنا نہیں آتا۔ اللہ ہمارے مدرسوں کو آباد رکھے کہ یہ اردو رسم الخط کو محفوظ کیے ہوئے ہیں نہیں تو یہ زبان ہندی رسم الخط میں تبدیل ہوجائے۔

اس طرح بظاہر تو بہت افسوسناک اور تشویش ناک حالات ہیں لیکن زبانیں کسی فیکٹری میں ڈھلتی نہیں ہیں جب تک کہ ان کے بولنے والے زندہ رہتے ہیں، زبانیں بھی زندہ رہتی ہیں۔ ہمارے اردو کے رسائل اور اخبارات بھی اردو کی بقا کے لیے آکسیجن کا کام کرتے ہیں۔ مشاعرے حالانکہ صبح کو اخبار کی ایک خبر بن جاتے ہیں لیکن ان کے ذریعے سے بھی زبان کی بڑی خدمت ہورہی ہے۔ یہ اردو والوں ہی نہیں اردو ناشناسوں تک بھی اس زبان کی ترسیل کا ایک بہترین ذریعہ ہیں۔

ہماری زندگی ہی نہیں زبانیں بھی عروج وزوال کی منزلوں سے گزرتی رہتی ہیں، اس لیے میں اپنی اس اردو زبان کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں ہوں۔ ان شاء اللہ یہ اس گہن سے ابھرے گی، پھر روشن ہوگی اور دنیا کی زندہ زبانوں کی طرح زندہ رہے گی۔

س ج: کیا آپ ادب کے حوالے سے اپنی شاعری کے سلسلے میں مطمئن ہیں یا اور ابھی کچھ خواہشات ہیں؟

ا ع د: میں نصف صدی سے زیادہ عرصے کے اپنے اس شعری سفر کے بعد بھی خود کو ایک طالبعلم تصور کرتا ہوں اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہوں۔

س ج: 'اردو دنیا' کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ا ع د: 'اردو دنیا' کا شمار ہمارے ہندو پاک کے معیاری جرائد میں ہوتا ہے، یہ گذشتہ کتنے ہی سالوں سے ہماری زبان اور ہمارے ادب کی خدمت کررہا ہے، اس میں شائع ہونے والی تحریریں بڑی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہوتی ہیں اور قارئین کے ذہنوں کو روشنی عطا کرتی ہیں۔ اردو دنیا کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ نئے قلم کاروں کی تحریروں کو بھی اپنے صفحات میں جگہ دیتا ہے، میں اس کی طویل عمر اور اس کی بقا کے لیے دعا کرتا ہوں، کاش اردو زبان و ادب سے محبت کرنے والے اس کو خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیں تاکہ یہ مرحوم رسالوں کی فہرست میں شامل ہونے سے محفوظ رہ سکے۔

س ج: کیا آپ کی نسل میں، گھر میں آپ کے ادبی وارثین میں اردو زبان منتقل ہوئی یا ہو رہی ہے؟

ا ع د: اگر مجھے اللہ اولاد کی نعمت سے سرفراز کرتا تو میں ضرور اپنی زبان وادب کا یہ ورثہ اس کو منتقل کرتا۔ افسوس کہ یہ میرا ارمان ہی رہ گیا۔ میرے پاس کتابوں کا ایک عمدہ کلیکشن ہے جو میری زندگی کا بڑا سرمایہ ہے جسے میں کسی لائبریری کو تحفۃً دینے کا مصمم ارادہ رکھتا ہوں۔

س ج: اپنے قارئین اور چاہنے والوں کو کیا پیغام دیں گے؟

ا ع د: میرا یہ مخلصانہ پیغام ہے کہ آپ اپنی زبان اُردو، اس کے ادب اور اپنی تہذیب کو اپنی زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں۔

س ج: اپنے کچھ پسندیدہ اشعار اگر کچھ ہوسکیں تو سنانے کی زحمت کریں، نوازش ہوگی۔

ا ع د: قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے اپنے چند اشعار پیشِ خدمت کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیں۔

راستو! کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

اس راستے میں جب کوئی سایہ نہ پائے گا
یہ آخری درخت بہت یاد آئے گا

اپنی تصویر بناؤ گے تو ہوگا احساس
کتنا دشوار ہے خود کو کوئی چہرہ دینا

تنگ ہوتا ہے تو ہو جائے مراسم کا حصار
شاخِ گل ہم بھی نہیں ہیں کہ لچکتے جائیں

سنبھل کے چلنے کا سارا غرور ٹوٹ گیا
اک ایسی بات کہی اس نے لڑکھڑاتے ہوئے

اے زمیں تجھ پہ اتر کر یہ مجھے ہو گیا کیا
آسمانوں پہ تو انسان بنایا گیا تھا

ذہانتوں کو کہاں وقت خوں بہانے کا
ہمارے دور میں کردار قتل ہوتے ہیں

شعر کہیے تو لفظ بھی اظہر
منتخب کیجیے دوستوں کی طرح

■

Azadar Husain Sajid Jalalpuri
Mohalla: Jafarabad, Post: Jalalpur
Distt.: Ambedkar Nagar - 224149 (UP)
Cell:7571867185
Emailazadarhusainsajid@gmail.com

Azhar Inayati
33, Madrasa Kohna, Mahal Shah Bibi
Rampur - 244901 (UP)
Email.: azharinayati@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

داراشکوہ آثاروافکار

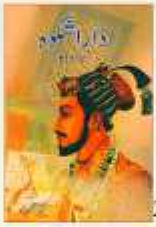

مرتب: شیخ عقیل احمد

صفحات: 234، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد شاداب شمیم، D-35 فورتھ فلور، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

داراشکوہ عالم، شاعر، ادیب اور صوفی منش انسان تھا، وہ اولیاء اللہ، صوفیائے کرام، شعرا اور مذہبی رہنماؤں کی عزت کرتا تھا، اس میں بہت حد تک اس کے دادا شہنشاہ اکبر کی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ شاہ جہاں کے چار بیٹے تھے۔ داراشکوہ علمی و ادبی امور میں سب پر فوقیت رکھتا تھا، اور بھائیوں میں اپنے والد کا چہیتا اور ولی عہد تھا، داراشکوہ سب سے بڑا بیٹا تھا، اور مختلف علوم وفنون کا ماہر بھی تھا، دارا کی قابلیت اور لوگوں کو جوڑے رکھنے کی صلاحیت کی وجہ سے شاہ جہاں نے اس کو ولی عہد بنایا تھا۔

زیر تبصرہ کتاب داراشکوہ آثاروافکار شیخ عقیل احمد کی مرتب کردہ ہے، اس میں مقدمہ، افتتاحی خطبہ اور کلیدی خطبے کے علاوہ ملک بھر کے اساتذۂ جامعات اور دانشوروں کے سترہ مضامین ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 2019 میں 'محمد داراشکوہ: حیات اور کارنامے' کے عنوان سے ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا تھا، اس میں پیش کیے گئے مقالات کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ان مقالات کو کتابی شکل میں جمع کیا گیا ہے۔ داراشکوہ بہت ہی ذہین تھا اور دوسرے شاہزادوں کے برعکس اس کی توجہ حصول علم کی طرف زیادہ تھی، بچپن سے ہی اسے لکھنے پڑھنے اور نئی نئی معلومات حاصل کرنے کا حد درجہ شوق تھا، داراشکوہ کو کتابوں سے بے انتہا محبت تھی، اس نے ایک بہت ہی عالیشان لائبریری تعمیر کروائی جس میں وہ رات رات بھر مطالعے میں غرق رہتا تھا، داراشکوہ لائبریری اسی کی یادگار ہے اور اس بات کی شاہد ہے کہ اسے کتابوں سے کس قدر عشق تھا۔ داراشکوہ نے مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی تھی اور اسلامی لٹریچر کے ساتھ ساتھ قدیم ہندوستانی لٹریچر بھی اس کے زیر مطالعہ تھا، اسے فکر و فلسفہ اور تصوف سے گہری دلچسپی تھی، مقدمہ میں مرتب نے دارا کے شوق مطالعہ اور اس کے علم کی گہرائی کو اس طرح بیان کیا ہے۔

''داراشکوہ نے نہ صرف قدیم ہندوستانی مذہبی لٹریچر جیسے وید اور اپنشد کا مطالعہ کیا تھا بلکہ اسے یہودی اور عیسائی مذہبی ادب جیسے توریت، عہد نامۂ جدید اور مسلم صوفیا کی تصانیف کا بھی گہرا علم تھا۔ وہ مسلم حکمراں طبقے میں پہلا شخص تھا جس نے ہندوؤں کے علمی اور مذہبی ادب میں اپنی دلچسپی ظاہر کی۔''

داراشکوہ نے باضابطہ سنسکرت کی تعلیم حاصل کی اور اس کے لیے سخت محنت کی، سنسکرت ایک مشکل زبان ہے اور اسے سیکھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ داراشکوہ چاہتا تھا کہ وہ خود سے دوسرے مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کرے اور ان میں بیان کی گئی باتوں پر غور و خوض کرے، اس نے بھگوت گیتا، اپنشد اور یوگ وسشٹھ پڑھی، وہ چاہتا تھا کہ دوسرے مسلمان بھی اس قابل بنیں کہ وہ دوسرے مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کر سکیں اور ہندوؤں کے مذہب، فلسفے، رسوم و رواج، افکار و عقائد اور تہذیب و ثقافت کو بخوبی سمجھ سکیں، یہی وجہ ہے کہ اس نے ان متون کی تشریح میں خاص دلچسپی لی، وہ پہلا شخص تھا جو مسلمان ہونے کے باوجود دوسرے مذہب کی کتابوں کو پڑھنے کی ترغیب دے رہا تھا، اس وقت جب کہ مذاہب کے تقابلی مطالعے کا لوگوں کے ذہن میں تصور بھی نہیں تھا دارا نے اس کا آغاز کیا اور اپنے مذہب کے ساتھ ہی دوسرے مذاہب کی مذہبی کتابوں کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان کا فارسی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ اس نے پچیس سال کی عمر میں اپنی پہلی تصنیف 'سفینۃ الاولیا' کے نام سے تحریر کی جس میں چار سو گیارہ مفکرین، اولیا اور درویشوں کا تذکرہ کیا۔ افتتاحی خطبے میں ڈاکٹر کرشن گوپال لکھتے ہیں:

''یہ سترہویں صدی تھی۔ جو ڈسکورس اس وقت دارا چلا رہا تھا اس وقت پوری دنیا میں اس کا وجود نہیں تھا، مذاہب کا تقابلی مطالعہ آکسفورڈ میں بھی سوڈیڑھ سو سال پہلے ہی شروع ہوا ہے، اس وقت مذاہب کا تقابلی مطالعہ دنیا کی یونیورسٹیوں کے تصور میں بھی نہیں تھا، جب داراشکوہ نے اس کا آغاز کیا تھا، دارا نے سنسکرت پڑھنے کی کوشش کی، اس وقت سنسکرت پڑھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔''

پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے 'داراشکوہ: شخصیت، آثار اور معنویت' کے عنوان سے کلیدی خطبے میں دارا کی زندگی، اس کی شخصیت اس کے افکار و خیالات اور اس کی تمام تصانیف کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے، داراشکوہ نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے پڑھنے لکھنے اور علمی بحث و مباحثے سے کتنی دلچسپی تھی، سفینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا، رسالہ حق نما، حسنات العارفین، مجمع البحرین، سر اکبر اور شعری مجموعہ اکسیر اعظم اس کی اہم تصانیف ہیں۔ مختلف موضوعات پر لکھی گئی ان کتابوں میں تصوف، صوفیا کے اقوال، فکر و فلسفہ اور اپنشد کا ترجمہ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں، اس کو تصوف اور فکر و فلسفے سے بہت دلچسپی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس نے اس میدان میں اہم تصانیف تحریر کی ہیں۔ یہ تصانیف اسے ہمیشہ زندہ و جاوید رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب عرفان و تصوف، دوسرا باب افکار و میلانات اور تیسرا باب میراث و باقیات کے عنوان سے ہے۔ پہلے باب کے تحت سات مضامین ہیں، پروفیسر طلحہ رضوی برق کا اسلامی تصوف اور داراشکوہ، پروفیسر عبدالقادر جعفری کا داراشکوہ اور مسئلہ وحدت الوجود، پروفیسر سید عزیز الدین حسین کا داراشکوہ کے افکار پر تصوف، فارسی شعرا اور نظریہ صلح کل کے اثرات، پروفیسر سید عین الحسن کا داراشکوہ

کا عرفانی سفر، پروفیسر سید علیم اشرف جائسی کا عہد داراشکوہ میں اسلام اور تصوف، ڈاکٹر محمد مشتاق تجاوری کا داراشکوہ اور حضرت میاں میر اور امر حسن کا ہند اسلامی مشترکہ دانش عرفانی کا امتزاج بہت اہم اور مختلف النوع مضامین ہیں، اس میں اسلامی تصوف اور داراشکوہ، وحدت الوجود، نظریۂ صلح کل، داراشکوہ اور حضرت میاں میر وغیرہ پر اہم مضامین ہیں۔

دوسرے باب میں بھی سات مضامین ہیں، ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا داراشکوہ کا امتزاجی تصور، پروفیسر عراق رضا زیدی کا رباعیات داراشکوہ میں رموز بحر وعشق، پروفیسر محمد حنیف خان شاستری کا داراشکوہ کی تحریروں میں ہندو فلسفہ کا عکس، پروفیسر سلمیٰ محفوظ کا اپنشد سے متعلق داراشکوہ کی رائے، ڈاکٹر ناہید عابدی کا سراکبر میں ایشاواسیہ اپنشد کا بنیادی عکس، پروفیسر اخلاق احمد آہن کا مشترکہ ہندوستانی ادبی روایات اور داراشکوہ اور ڈاکٹر محشر کمال کا مجمع البحرین اور ہندستانی ہم آہنگی کی روایت بہت ہی محنت اور تحقیق وجستجو سے لکھے گئے مضامین ہیں، اور ان مضامین کا مطالعہ یقیناً داراشکوہ کے افکار ومیلانات کے سمجھنے میں معاون ہوں گے۔ تیسرے باب میں صرف تین مضامین ہیں، پروفیسر شریف حسین قاسمی کا داراشکوہ کی کتابوں کے خطی، مطبوعہ نسخے اور تراجم، ڈاکٹر محمد حبیب داراشکوہ اور اس کی تصانیف اور پروفیسر سید حسن عباس کا داراشکوہ کی تصنیفات رضا لائبریری میں پر مغز مضامین ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مضامین کا مطالعہ یقیناً داراشکوہ کی زندگی، اس کے افکار و آثار، اس کی بالغ نظری، اس کی تعمق نگاہی، اس کی تصانیف وغیرہ کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

ہندوستان میں معذور بچوں کا نظام تعلیم

مصنف: محمد حفظ الرحمٰن، مترجم: فیض اللہ خان

صفحات: 148، قیمت: 90 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، ایس 3 / 5اے، تیسری منزل

فاطمہ اپارٹمنٹ، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی

ہمارا سماج عام طور پر ایسے افراد کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے، حالانکہ معذور افراد ہمارے اسی سماج اور معاشرے کا اٹوٹ اور قابل قدر حصہ ہیں، وہ بھی ان تمام مراعات اور مواقع کے ویسے ہی حقدار ہیں جیسے غیر معذور افراد۔ انھیں مین اسٹریم سے مربوط کرنے کے لیے ہمارے یہاں خصوصی تعلیم، تعلیمی نظام کا اہم حصہ ہے اور جدید قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں اس پر بہت زیادہ زور بھی دیا گیا ہے کیونکہ ہندوستان کی کل آبادی کا تقریباً دس فیصد حصہ معذور افراد پر مشتمل ہے۔ اس میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو یا تو ذہنی اعتبار سے معذور ہیں یا جسمانی اعتبار سے۔ ایسے معذور افراد کو بنیادی سطح سے اعلیٰ سطح تک تعلیم کی اشد ضرورت ہے کیونکہ تعلیم ہی ایک ایسا آلہ ہے جو ان کے مسائل اور مشکلات کو آسان بنانے اور انھیں زندہ رکھنے کا ہنر سکھا سکتی ہے اور چونکہ آئینی سطح پر بھی 6 سے 14 سال کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم کی وکالت کی گئی ہے اسی لیے آج ہم دیکھتے ہیں کہ خصوصی تعلیم کے اہل افراد کے لیے خصوصی تعلیم کا انتظام تقریباً ہر شعبے میں کیا جا رہا ہے۔ زیر نظر کتاب چونکہ ایک تحقیقی کتاب ہے اسی لیے اس میں معذور بچوں کے لیے خصوصی تعلیم کے تصور کو تاریخی تناظر میں دیکھتے ہوئے تدریس اور تکنیکی طریقۂ تدریس، برطانوی عہد میں خصوصی تعلیم کے تصور نیز عصری تناظر میں اس کی ضرورت، افادیت اور اہمیت کو مدلل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کو کل دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: پہلا باب 'معذور بچوں کے لیے خصوصی نظام تعلیم (اسپیشل ایجوکیشن) کا تصور' کے عنوان سے ہے۔ اس میں قوت سماعت سے محروم، بینائی سے محروم، ذہنی طور پر معذور، بولنے سے معذور، خداداد صلاحیت کے حامل بچے، سست رفتاری سے سیکھنے والے بچے، ان سب کی تعریف اور اقسام نیز ان کے مسائل وغیرہ کو بہت ہی منظم طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مخصوص نظام تعلیم کے تصور کو تاریخی تناظر میں دیکھتے ہوئے اس موضوع پر مغربی محققین، ناقدین اور سرکاری سطح پر حکومت نے جو کچھ کیا ہے اس کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ معذور افراد کی تعلیم و تربیت کے لیے کون کون سے اقدامات کیے گئے ہیں اور کیا نئے اقدامات کیے جا رہے ہیں تاکہ ان کے مستقبل کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکے۔ دوسرا باب 'مخصوص بچے اور تدریسی اور تکنیکی طریقہ' کے نام سے ہے۔ اس میں ان مخصوص اور معذور بچوں کو پڑھانے کی قدیم و جدید تکنیک اور اصول بتائے گئے ہیں جو 'سیکھنے' میں معذور ہوتے ہیں۔ ایک استاد کو ایسے بچوں کو پڑھاتے ہوئے جن اصولوں کو اپنانا چاہیے ان میں سے یہ ہے کہ ایسے بچوں سے سیکھنے کی توقع کریں، بچوں سے عطیے کے طور پر کچھ نہ لیں، دباؤ کو دور بھگائیں، اشاروں کا استعمال کریں، پرشوخ ماحول بنائیں، کسی چیز کو جتنی بار ضروری ہو دہرائیں، بچوں کو سرپرائز دیں، منفیات کو ترک کر کے مثبت کامیابی پر زور دیں، ضرورت کے مطابق ان کے ماں اور باپ کا کردار نبھائیں، اپنے آپ کو ہمیشہ اس طرح بنا کر رکھیں کہ ایک دوسرے سے سیکھتے رہیں۔ اس کے علاوہ تدریسی اور تکنیکی طریقہ کو بھی اجمالی طور پر پیش کیا گیا ہے اگر ان اصولوں کو اپنایا جائے تو بہت ممکن ہے کہ بچے اس سے استفادہ کریں۔ کتاب کا تیسرا باب 'متعلقہ مطالعہ کا جائزہ' کے عنوان سے ہے۔ اس میں پہلے دو ابواب میں جن اہم نکات کو مستند اور مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس میدان میں ہو چکے کام اور ان کی نوعیت، ان کے تحقیقی اور تدریسی طریقہ کار کے علاوہ مطالعہ کے بعد جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کا تفصیلی احاطہ کرنے کی کشش کی گئی ہے۔ چوتھا باب ''مخصوص بچوں کا تاریخی پس منظر اور ان کے تعلیمی حالات' (2500 قبل مسیح سے 1875 عیسوی کے دوران) کے عنوان سے ہے۔ اس میں مخصوص ضروریات کے حامل بچوں کی تعلیمی صورتحال کو تاریخی تناظر میں پیش کرتے ہوئے مختلف ذیلی عناوین مثلاً ابتدائی مرحلے میں، رامائن اور مہابھارت کے دور میں، بدھ مت اور جینزم کے دور میں، بادشاہ ہرشا کے دور میں، ہندوستان میں عہد وسطیٰ کے دوران کے تحت مجملاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ پانچواں باب 'ہندوستان میں برطانوی دور حکومت کے دوران اسپیشل ایجوکیشن کا ارتقا' کے نام سے ہے جب کہ چھٹا باب 'آزادی کے بعد معذور بچوں کی تعلیمی ترقی' ساتواں 'ہندوستان میں مربوط تعلیمی پروگرام کی فراہمی' آٹھواں باب 'قومی تعلیمی پالیسی اور پروگرام آف ایکشن اور تعلیم کا مربوط پروجیکٹ برائے معذورین' نواں 'ہندوستان میں اسپیشل ایجوکیشن کی موجودہ صورتحال' اور دسواں 'خلاصہ اور نتیجہ' کے عنوان سے ہے۔ مذکورہ عناوین کے تحت مصنف نے اجمالی جائزے کے بعد کچھ تجاویز بھی پیش کی ہیں جنھیں اگر عملی طور پر برتا جائے تو یقیناً معذور افراد اس لائق ہو جائیں گے کہ مرکزی دھارے سے خود کو جوڑ سکیں۔ فیض اللہ خان نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کر کے اردو معلمین و اسکالرز کے لیے آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس کی روشنی میں اردو زبان کی تدریس کے دوران خصوصی ضروریات کے حامل بچوں کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر تدریسی نمونے بھی تیار کر سکتے ہیں۔ میں کونسل، صاحب کتاب اور اس کے مترجم فیض اللہ خان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ایک اچھا اور بہتر ترجمہ کر کے ہم سب کے لیے آسانیاں پیدا کر دیں۔ امید ہے کہ اس طرح کے اہم کام سامنے آتے رہیں گے۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے البتہ پروف کی کچھ غلطیاں راہ پا گئی ہیں جن پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ امید قوی ہے کہ علمی حلقوں میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوگی۔

تحقیق و تنقید

علامہ شبلی کے فارسی خطوط: ایک مطالعہ

مصنف/مرتب: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

صفحات: 128، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: فروری 2022

ناشر: مکتبہ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ 276001

مبصر: ڈاکٹر سید اختیار جعفری، مرزا غالب ریسرچ اکیڈمی

خیرادی ٹولہ، تاج گنج، آگرہ۔ 282001 (یوپی)

ادبی تحقیق وتدوین کی روایت کے طور پر میریات، غالبیات اقبالیات اور آزادیات کے بعد اب 'شبلیات' کو بھی اعتبار حاصل ہونے لگا ہے۔ میر و غالب اور علامہ اقبال و مولانا آزاد سے متعلق علمی وادبی گفتگو کو باقاعدہ ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ تاخیر کے ساتھ ہی سہی، عصر حاضر کے بعض اہل علم وادب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ علامہ شبلی نعمانی (1914-1857) ایک ایسی مختلف الجہات علمی وادبی شخصیت ہیں کہ ان سے متعلق تحقیقات کو باقاعدہ ایک تحریک یا فن یا دائرۃ العلم قرار دیا جاسکتا ہے اور ان پر اختصاصی کام کیے جاسکتے ہیں۔ ہمارے ناقص علم کے مطابق عصر حاضر میں اس رجحان کے غیر اعلان شدہ علم بردار جناب ڈاکٹر فخرالاسلام الاعظمی، ان کے قابل فخر شاگرد ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اور مردم خیز خط بدایوں کے ڈاکٹر شمس بدایونی وغیرہ صاحبان ہیں۔ اس فہرست میں مزید نام جوڑے جانے کی پوری گنجائش بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (پ 1966) کی حال ہی میں منظر عام پر آنے والی کتاب 'علامہ شبلی کے فارسی خطوط، ایک مطالعہ' شبلی شناسی کی بعض نئی راہیں کھولتی ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی شبلی شناسی سلسلے کی 22 ویں کتاب ہے جب کہ ان کی کل 47 کتابیں اردو تنقید وتحقیق کے میدان میں ماہرین فن سے سند اعتبار حاصل کر چکی ہیں۔ علامہ شبلی کے فارسی خطوط کی تفصیلات اور ان کے متعلقات پر 128 صفحات کی یہ کتاب فروری 2022 میں منظر عام پر آئی ہے۔ کتاب کی اہمیت وضرورت بتاتے ہوئے مرتب کتاب نے لکھا ہے:

''ناچیز... کو بدرجۂ مجبوری یہ کام کرنا پڑا ہے۔ اس لیے کہ گذشتہ ایک صدی سے علامہ شبلی کے فارسی خطوط سے صرفِ نظر کیا جاتا رہا ہے۔ اور اب تک میری معلومات کے مطابق ان خطوط پر ایک بھی مقالہ نہیں لکھا گیا۔ اس کتاب میں علامہ شبلی کے فارسی خطوط جو مکاتیب شبلی حصہ دوم میں درج ہیں اور جن کی کل تعداد 33 ہے، انھیں نقل کر کے ان کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ ایک معتبر شبلی شناس ڈاکٹر خالد ندیم صاحب صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف سرگودھا کے قلم سے ہے۔ اسے میں نے شکریہ کے ساتھ ان کی کتاب 'اردو ترجمہ مکاتیب شبلی مطبوعہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی سے نقل کیا ہے۔ اس کتاب کا مقصد بس اس قدر ہے کہ اہل علم اور ارباب کمال کی توجہ علامہ شبلی کے فارسی مکتوبات کے مطالعہ وتجزیہ کی طرف مبذول کرائی جاسکے۔ ناچیز نے ان مکتوبات پر تعلیقات وحواشی لکھنے کا خصوصی اہتمام کیا ہے اور اس میں بڑی تگ ودو اور محنت کی ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ سوانح شبلی کے ابتدائی دور کا صحیح اور بنیادی ماخذ یہ فارسی خطوط ہیں۔ اس لیے ان کا تحقیقی جائزہ سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے۔'' (ص 8-7)

الیاس اعظمی صاحب کا شکوہ بجا ہے اور فارسی داں اہل علم کو واقعی اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ بقول اعظمی صاحب وسیع تر دائرے میں ان مکاتیب کے تحقیقی جائزے اور اسی کے ساتھ سنجیدگی کی شرط پر بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

اردو میں اس دور کے آخری مکتوب نگار علامہ شبلی ہیں۔ شبلی کے اردو خطوط کو بعض محققین 1881 سے 1914 تک کے 33 برسوں کا قومی روزنامچہ قرار دیتے ہیں، لیکن جن اردو خطوط کی اس قدر اہمیت ہے، شبلی نے کبھی انھیں درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ اپنے فارسی خطوط کی اہمیت، ادبیت اور علمیت کو ہی قابلِ اظہار سمجھتے ہیں، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے فارسی خطوط پچھلی ایک صدی سے علمی وتحقیقی تدوین کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ فن شبلیات میں ان کے فارسی مکاتیب سے یہ عدم توجہی حیرت کی بات ہے۔ ان کے اردو مکاتیب کے مجموعے دراز قد اہل علم نے مرتب کیے ہیں۔ ان نصف درجن سے زائد تصانیف میں علامہ شبلی کے کل 1222 خطوط شامل ہیں۔ ان میں علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے مجموعے مکاتیب شبلی کی دوسری جلد میں 10 مشاہیر کے نام علامہ کے 33 فارسی خطوط اور 5 مکتوب الیہم کے نام عربی کے 6 خطوط بھی شامل کیے ہیں۔

'علامہ شبلی کے فارسی خطوط' میں محمد الیاس الاعظمی نے انھیں 33 فارسی خطوط کو مدون کیا ہے۔ تدوین کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی کے یہ فارسی خطوط ان کی ابتدائی زندگی کے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے مکتوب الیہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ بعد ازاں ان کے نام فارسی خطوط نقل کیے گئے ہیں۔ ہر خط کا اردو ترجمہ متصلاً ہی لاحق کر دیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ بامحاورہ اور سلیس اردو میں ہے۔ اس سے شبلی کی منشا کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ عام ترجموں کی طرح لفظی وترکیبی تعقید سے یہ ترجمہ پاک ہے۔ اخیر میں تعلیقات وحواشی ہیں۔

افادیت کے پیش نظر اشاریہ اور کتابیات کا بھی اندراج کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی اصل اہمیت اس کی تعلیقات وحواشی ہیں جنھیں مرتب نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ بیشتر مقامات، اعلام، اشخاص، واقعات، کتابیات وغیرہ کی صراحت کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ مکتوب الیہم کے حالات کی تفتیش میں مرتب کتاب نے پوری جانفشانی سے کام لیا ہے۔ چونکہ بیشتر مکتوب الیہم کا تعلق ان کے بچپنے سے ہے او رپھر یہ کہ وہ زیادہ تر افراد ان کے خاندان سے بھی تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا سو سال کے بعد ان کے حالات کی چھان پھٹک آسان نہیں تھی۔ اس کے باوجود الیاس الاعظمی نے ہر ممکن طریقہ سے ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ ان کے خلوصِ فکر اور جذبۂ تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کو بنیادی طور پر 3 حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصے میں دیباچہ کے عنوان سے الیاس الاعظمی نے شبلی کے فارسی خطوط کی اہمیت اور کتاب کی ترتیب وتدوین پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد ص 11 سے 17 تک مقدمہ کے طور پر شبلی کی فارسی مکتوب نگاری کے مختلف پہلوؤں اور ان کی انفرادیت وافادیت پر مختصر کلام کیا ہے۔ ان کی یہ رائے بہت وقیع ہے کہ علامہ شبلی کے فارسی مکتوبات کو مولانا امتیاز علی عرشی کے اصول تنقید وترتیب کی روشنی میں مرتب کیے جانے کی ضرورت ہے۔ تبھی ان کے علمی، فنی، ادبی اور انشائی علوم کی وضاحت ہو سکے گی۔ اسی کے ساتھ شبلی کی زندگی کے ابتدائی گوشوں پر بھی خاطر خواہ روشنی پڑ سکے گی۔ ص 19 سے 110 تک فارسی خطوط اور ترجمے ہیں۔ تعلیقات وحواشی ہر مکتوب الیہ کے بعد درج کیے گئے ہیں۔ آخری اور تیسرے حصے میں کتابیات اور اشخاص، مقامات وکتابوں کا تفصیلی اشاریہ ہے، جو نہایت مفید ہے۔ ترجمہ رواں دواں اور علمی ہے۔

رشید حسن خان اور شمس بدایونی کا ادبی رشتہ

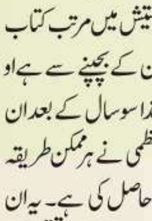

مرتب: ڈاکٹر ٹی، آر، رینا

صفحات: 196، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022

مطبع: اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، دریا گنج، نئی دہلی- 110002

مبصر: عبدالرحمٰن شافی، ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیرِ نظر کتاب میں مرتب نے رشید حسن خان اور شمس بدایونی کے تنقیدی اور تحقیقی اکتسابات کو نشان زد کیا ہے ان کے مابین مراسلت کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جن سے

دونوں کے تنقیدی امتیازات اور ترجیحات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔رشید حسن خان نے شمس بدایونی کی تصانیف پر اپنے بے لاگ تبصروں میں جن امور پر خصوصیت سے نکتہ آرائی کی وہ دراصل تنقید اور تحقیق کے رہنما اصول ہیں جن کا اردو تنقید میں پوری طرح مروج ہونا ہنوز ایک مطلوبہ امر ہے۔مثلاً شمس بدایونی کی کتاب 'نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات' (1995) کے حوالے سے شخصیت پرستی پر اصرار ناقدین کی عمومی کمزوری کو نشان زد کرتا ہے۔اس سے پہلو تہی تنقید کے بنیادی مطالبات کا حصہ ہے۔رشید حسن خان لکھتے ہیں:

البتہ ہیرو ورشپ کا انداز کئی جگہ ابھر آیا ہے اور اس نے توازن کو مجروح کیا ہے، مثلاً یہ کہنا کہ نظامی، شیرانی کے کے قبیل کے فرد تھے، مبالغہ ہی نہیں انتہا پسندی ہے۔ یہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آئندہ آپ جو کام کریں اس میں قلم کو بے قابو نہ ہونے دیں اور جذبات کو جذباتیت کا فرد نہ بننے دیں کہ اس سے کاموں پر برا اثر پڑتا ہے۔''

مرتب نے رشید حسن خان کی کتابوں پر شمس بدایونی کے تبصروں اور دوسری تحریروں کو بھی جمع کر دیا ہے جن سے مترشح ہوتا ہے کہ رشید حسن خان کی ترتیب متن کے سائنٹفک عمل پر ان کی گہری نظر ہے اور شمس بدایونی متن کو منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کے قائل ہیں۔

''ٹی، آر، رینا کی یہ کتاب اپنے ادبی سروکاروں، رشید حسن خان اور شمس بدایونی کے حوالے سے تنقیدی اور تحقیقی نکات کی نشاندہی اور تنقیدی اصول کے ذیل میں ایک اہم مطالعہ ہے اور ان کے تحقیقی وتنقیدی محاسن کو متعین حوالوں کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ کتاب میں رشید حسن خان اور شمس بدایونی کا حیات نامہ اور جملہ مطبوعہ علمی و ادبی کام کا اشاریہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ اشاریہ دونوں محققین کی علمی و ادبی میدان میں اختصاصی حیثیت کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

یہ رائے اس کتاب (رشید حسن خان اور شمس بدایونی کا ادبی رشتہ) پر شافع قدوائی صاحب نے دی ہے، جو اس کتاب کی جامعیت کو بڑھانے میں ایک کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔

شمس صاحب اور خان صاحب کے خطوط اور تبصرے دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ اپنے عہد اور حالات کی مکمل عکاسی کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ اپنی رائے کو انھوں نے کس بیباک طریقے سے لکھا ہے۔ادبی چشمک، اختلاف رائے اور اختلاف طبع، یہ سب ہونے کے باوجود وہ کیسے اپنے ہم عصر سے انسیت اور یگانگت رکھتے ہیں، ہمیں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

خطوط انسان کی ذاتی زندگی کا عکس ہوتے ہیں، جو باتیں ہم محفلوں میں نہیں کر سکتے وہ خطوط میں لکھ دیتے ہیں، بعض اوقات ان کا تعلق علم سے ہوتا ہے اور بعض مرتبہ خانگی امور سے، سیاست سے متعلق بھی اور مذہب سے بھی، اور بعض مرتبہ وہ اتنی نجی ہوتی ہیں کہ بیشتر کی سمجھ سے بھی پرے ہوتی ہیں اور ان کی وضاحت آپ کو اس کتاب میں دیکھنے کو ملے گی۔مثال کے طور پر اس کتاب سے چند اقتباسات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

''یونیورسٹی کی ملازمت ایک آفت ہے کہ رہن سہن بھی اسی معیار کا ہونا چاہیے، ورنہ اچھوت بن جانا پڑتا ہے۔ دہلی کی زمین کچہری کی زمین سے کم نہیں، بہر گام پیسہ۔ زندگی بالکل مصنوعی بلکہ بناسپتی، بس نمائش اور زیبائش۔'' (خط بنام اشفاق حسن، ص190)

''چوتھے بچے کی مبارک باد، خدا اسے اور اس کی (بے چاری) ماں کو تندرست و توانا رکھے اور آپ کی مزید دراز دستیوں کے برملا اظہار سے محفوظ رکھے۔ میری رائے یہ ہے کہ اب اولاد صلبی کے بہ جائے اس فرزند معنوی کی تخلیق پر توجہ صرف کیجیے، جس سے مستقبل میں آپ کو مدد مل سکتی ہے۔ آپ کی صلاحیتوں کا ثبوت اب ضرورت سے کچھ زیادہ ہی فراہم ہو گیا ہے، اس لیے اپنی بیوی کی صحت پر رحم کھا کر اور بچوں کے مستقبل پر ترس کھا کر، اس سلسلے کو بند کر دیجیے۔'' (خط بنام رئیس احمد نعمانی)

''خان صاحب نے زندگی بھر اپنے بارے میں نہ تو خود کچھ تفصیل سے لکھا نہ عام طور پر کسی کو خود پر لکھنے دیا۔ وہ زندہ لوگوں پر لکھنے لکھانے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کے کوائف کی تلاش اس طرح کی جا رہی ہے جیسے کسی سو سال پرانے ادیب کے بارے میں کی جاتی ہے۔'' (رشید حسن خان اور شمس بدایونی کا ادبی رشتہ، ص نمبر 184)

خطوط

مظفر کے نام (کچھ ادبی خطوط) جلد اوّل

مرتب: انجینئر فیروز مظفر

صفحات: 592، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2022 روپے

ناشر: مظفر حنفی میموریل سوسائٹی مظفر حنفی لین، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی 25

مبصرہ: ڈاکٹر رضیہ حامد، شبستان اپارٹمنٹ، سیکنڈ فلور

سید فتح علی اسٹریٹ، عیدگاہ ہلز، بھوپال 462001 (مدھیہ پردیش)

انجینئر فیروز مظفر کو اردو شعر و ادب سے بڑا لگاؤ اور شغف ہے۔ انھوں نے بچپن سے ہی اپنے والد مظفر حنفی صاحب کو کتابوں، رسالوں اور اخبار کے اوراق میں گھرا ان کے مطالعہ میں غرق ہوتے دیکھا ہے۔ بچپن کی باتیں، ماحول، اس وقت کی شعوری و غیر شعوری تربیت بچے کے نشو و نما میں گہرے اثرات کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ سائنس کا طالب علم ہونے کے باوجود ان کی دوستی نثر و نظم کے ساتھ برابر قائم رہی۔ یہ ایک بڑا مثبت انداز ہے۔ فیروز مظفر نے کئی کتابوں کی ترتیب و تدوین کی ہے۔ ان کی سب سے پہلی کاوش 'مکتوبات ساغر نظامی' ہے۔ اس کے بعد وہ رُکے نہیں، برابر اردو زبان و ادب کے شعبے میں اپنے آپ کو مصروف کار رکھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کتاب مظفر حنفی کے نام (خطوط) ان کی پندرہویں کتاب ہے۔ فیروز مظفر لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے 1970 میں نسیم بکڈپو نے شائع کرنے کے لیے خطوط کا مسودہ منگوایا تھا جو وہاں لگی آگ کی نذر ہو گیا۔ اس میں یقیناً بہت اہم لوگوں کے خطوط ہوں گے۔ کتاب 'مظفر کے نام' (خطوط) دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ پہلی جلد میں حروف تہجی کے حساب سے 'الف' سے لے کر 'ع' تک تقریباً 380 دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کے ادبی خطوط شامل ہیں۔ فیروز مظفر نے بڑی لگن اور محنت سے خطوط کے انبار میں سے ادبی خطوط کو الگ کیا، یہ پتہ مار کام ہے جس میں وہ سرخرو ٹھہرے۔

ان خطوط میں آل احمد سرور، احمد ندیم قاسمی، اسلوب احمد انصاری، اقبال مرزا، اسلم آزاد، افتخار امام صدیقی، بلراج کومل، پروین کمار اشک، خلیق انجم، بشیر بدر، حامد انصاری، حکیم عبدالحمید، دلیپ سنگھ، ڈاکٹر علی احمد جلیلی، سید ظہور قاسم، خالد عابدی، رفیع الدین ہاشمی، ساحر شیوی، شمس الرحمٰن فاروقی، شاہین، مولانا عقیل الغروی، رہبر جونپوری اور عشرت قادری وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان خطوط سے جہاں مظفر حنفی کی ادبی سرگرمیوں، ان کے ذہن و فکر کی بلندی اور صائب الرائے ہونے کا علم ہوتا ہے وہیں مکتوب نگار کی ذہنی اُپج، ان کی ادبی فکر و اسلوب نگارش بھی سامنے آتی ہے۔

غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا تھا، مظفر صاحب کے بقول ''غالب کے مکاتیب کے بعد مختلف افراد کے نام اتنی بڑی تعداد میں ایسے ادبی و معیاری خطوط شاد عارفی کے علاوہ کسی اور کے یہاں نظر نہیں آئیں گے''۔ (ص10)

کتاب میں موجود خطوط کو پڑھ کر قاری کو اس وقت کے کسی قدر حالات کا بھی علم ہوتا ہے۔ مظفر صاحب بلا کے زود گو شاعر تھے، اس کے باوجود ان کے کلام میں ابتذال

نظر نہیں آتا۔ ان کا کلام ہندوپاک کے تقریباً ہر ادبی رسالے میں شائع ہوتا تھا۔ اور ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اکثر رسالوں نے ان کی زندگی میں ان کے متعلق گوشے نکالے، جس کے لیے کسی نے اجازت چاہی تو کسی نے ان سے تعاون کی درخواست کی۔

اکثر دانشوروں وادیبوں نے آپ کے کام کو سراہا ہے، اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ کئی اشخاص نے باقاعدہ اس کے حوالے سے تفصیل سے گفتگو کی ہے اور بہ نظر احسن ان کی تحریر کی خوبیوں کو دیکھا سمجھا اور بیان کیا ہے۔ پروفیسر حنیف نقوی نے مظفر صاحب کی کتاب 'لاگ لپیٹ کے بغیر' کے مطالعہ کے بعد اپنے ستمبر 2002 کے خط میں لکھا:

''ان مضامین کی ایک مشترکہ صفت یہ ہے کہ یہ سب کے سب بے حد دلچسپ ہیں۔ بعض مضامین پیش کردہ معلومات کے اعتبار سے بھی اہم ہیں۔ آپ نے اپنے اندازِ بیان کی سادگی اور بے تکلفی سے ان میں حسن پیدا کر دیا ہے۔ جو قاری کو مصنف کے احترام پر مجبور کردیتا ہے۔ 'یادِ ایام بنام تاجدار احتشام' اس مجموعے کا سب سے اچھا مضمون ہے۔ جسے پڑھتے ہوئے میں کئی بار اس کیفیت سے دوچار ہوا، جو اسے لکھتے وقت آپ پر طاری ہوئی ہوگی۔ مرحوم کی جواں مرگی کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے، آپ نے اپنی یادوں کے چراغ جلا کر جس طرح مرحوم کی یاد تازہ کی ہے میرے خیال میں خراجِ تحسین کی اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں ہوسکتی۔ اس زندہ وتابندہ تحریر کے لیے ایک بار پھر مبارک باد قبول فرمائیے۔'' (ص 160)

مظفر صاحب کے نام کئی خطوط کے مطالعے سے اس کا بھی علم ہوا کہ وہ اپنے جاننے والوں کے کلام کی اصلاح بھی فرمایا کرتے تھے۔ اپنی اتنی زیادہ ادبی اور تدریسی مصروفیات میں ان کو اس کارِخیر کے لیے بھی وقت مل جاتا تھا باعث حیرت ہے۔ مقالوں کی جانچ تو ان کے منصبی کاموں سے متعلق ہے اس لیے وہ تو کوئی تعجب خیز نہیں کہ وہ پی ایچ ڈی کے مقالوں کو پڑھتے اور جانچتے تھے۔ وہ کھرے انسان تھے، سچی بات کہنے میں ان کو کبھی عار نہیں ہوئی۔ مقالوں کی رپورٹ لکھتے وقت لوگوں کی عرضداشت بھی ان کے پاس پہنچتی تھیں، جن کی روشنی میں ان کو اپنی رپورٹ کو نرم اور مثبت انداز کی لکھنے کی گزارش کی جاتی تھی۔ مظفر صاحب کا وہ امتحان ہوتا تھا جس کے لیے وہ اپنے قلم کو بچا کر طالب علم کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تو اس کے حوصلوں کو توڑتے بھی نہیں تھے۔ انھیں اندازہ تھا کہ آج کا طالب علم کن دشواریوں سے نبرد آزما ہے۔

اکثر دانشوروں نے اپنی تحقیق کے سلسلہ میں ان سے تعاون کی درخواست کی ہے۔ رشید حسن خاں جب مثنوی گلزارِ نسیم مرتب کر رہے تھے، ان دنوں کے ایک خط میں لکھا ہے:

''پاکستان سے یہ اطلاع ایک صاحب کے واسطے سے ملی ہے کہ سترہویں صدی عیسوی میں کس وقت ایک شاعر نوازش خاں نوازش نے قصہ گل بکاؤلی کو بنگلہ زبان میں نظم کیا تھا۔ نوازش گانو سکھ چاری، تھا نا سات کنیا، علاقہ چاٹگام کا تھا اور یہ کام اس نے ودیاناتھ رائے کی فرمائش پر کیا تھا۔ اگر یہ درست ہے تو یہ منظوم داستان اس قصے کی قدیم ترین مکتوب صورت ہوگی۔ صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا بنگلہ ادب کی تاریخ میں کہیں اس منظوم قصہ گل بکاؤلی کا ذکر ملتا ہے۔ ......یہی معلوم ہو جائے کہ بنگلہ ادب کی کسی معتبر تاریخ میں اس کا اندراج ہے۔ اگر ہے تو یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ اس کا سن تصنیف کیا تھا اور یہ کبھی چھپا تھا یا نہیں۔'' (ص 281)

فیروز مظفر کی اس کاوش سے جہاں مظفر حنفی صاحب کے ادبی قد وقامت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں مکتوب نگار کی ادبی کاوشیں بھی منظرِ عام پر آتی ہیں۔ قاری ان سے کماحقہٗ آگاہ ہوتا ہے۔ اردو زبان وادب میں کیسے کیسے ادیب ومحقق موجود تھے، جن کی کاوشوں سے اردو زبان وادب کے خزانہ میں بیش بہا اضافہ ہوا اور آج کا طالب علم ان سے استفادہ کر کے اپنے ماضی کے سرمایہ سے، اس کے مصنّفین اور مرتبین سے مستفید ہوسکتا ہے۔ اس کو علم ہوگا کہ کام کیسے کیا جاتا ہے، لوگوں کی مدد ہر حال میں کرنا کس طرح ممکن ہوتا ہے۔

فیروز مظفر بلاشبہ بڑی محنت اور دلجمعی سے اپنے والد کے کاموں کو سمیٹ کر اردو کی سچی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ ان کی لیاقت ہے۔ وہ اہل اردو کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ یقیناً ان کی مساعی لائق تحسین تو ہیں ہی، مظفر حنفی کے ذکر کے ساتھ ہی ان کا نام بھی اردو ادب میں زندہ رہے گا۔

کتاب بہت اچھی چھپی ہے۔ دلچسپ اور معلوماتی ہے، اس کو ہر صاحب ذوق کے پاس اور لائبریری میں ہونا چاہیے۔

فکشن

آبیاژہ

مرتب: رینا قمر

صفحات: 904، قیمت: 1200، سنہ اشاعت: 2022

مبصر: علی احمد فاطمی

سابق صدر شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

غضنفر میرے دوست ہیں۔ ہم عمر اور ہم سفر۔ ایسی دوستی کہ ان کی تخلیق پر تنقید کرنا جوکھم کا کام ہے لیکن میں نے ان کے کئی ناولوں اور خودنوشت پر طویل مضامین لکھے۔ میرے جو بھی خیالات رہے غضنفر نے ہمیشہ اس کا استقبال کیا۔ اس لیے کہ وہ ایک وضعدار اور بردبار مزاج کے انسان ہیں۔ انھوں نے تخلیقی اور راقم نے تحقیقی وتنقیدی سفر تقریباً ساتھ ساتھ طے کیا ہے۔ غضنفر نے شاعری سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا ہے اس لیے بھی کہ وہ شہریار کے چہیتے شاگرد تھے۔ وہ قاضی عبدالستار کے بھی شاگرد رہے ہیں۔ اس لیے ان کو فکشن کی طرف آنا ہی تھا۔ چنانچہ آئے اور دھوم دھڑاکے سے آئے۔ سورج کی طرح چمکے۔ نرمی اور گرمی دونوں کو بکھیرا لیکن شاعری کا روگ ایک بار لگ جائے تو کب چھوٹتا ہے۔ مثنوی کرب جاں اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ میں نے تحقیق سے ادبی سفر طے کیا تھا، تنقید پر آکر رُک گیا۔ میرے اس سفر کی مضبوطی میں احباب کے فکشن کا بڑا دخل ہے، بالخصوص عبدالصمد، حسین الحق، پیغام آفاقی، سید محمد اشرف اور غضنفر— میں نے ان سب کے ناول جی لگا کر پڑھے، ان پر مضامین بھی لکھے لیکن جو تخلیقی ہنر کاری، استعارہ سازی غضنفر کے یہاں پائی جاتی ہے وہ دوسروں کے یہاں کمیاب ہے۔ غضنفر کے ناول 'پانی' نے جو شہرت پائی وہ دوسرے ناولوں کو کم ملی۔ لفظ 'آبیاژہ' اسی ناول کی دین ہے اور اب اس عنوان سے ان کے تمام ناولوں کا کلیات منظرِ عام پر آیا ہے، جس میں ان کے سارے ناول جن کی تعداد نو ہے، شامل اشاعت ہیں۔ یقیناً یہ ایک اچھا کام ہوا ہے جس کے لیے مرتبہ ڈاکٹر رینا قمر مبارک باد کی مستحق ہیں۔ رینا قمر نے صرف ترتیب ہی نہیں دیا بلکہ غضنفر کی ناول نگاری پر ایک عمدہ لائق مطالعہ مقدمہ بھی لکھا ہے:

''مجھے غضنفر کے ناولوں کو یکجا کرنے کا خیال آیا تو ایک عنوان کی بھی تلاش شروع ہوئی۔ کئی نام ذہن میں آئے مگر کسی نہ کسی وجہ سے رد ہوتے چلے گئے کہ اچانک آبیاژہ چمک گیا اور ایسا چمکا کہ اس کتاب یعنی غضنفر کے ناولوں کے کلیات کا سرنامہ بن گیا۔''

اس کے آگے وہ یہ بھی کہتی ہیں: ''غضنفر ایک ہمہ جہت فنکار ہیں۔ وہ تقریباً ادب کی تمام اصناف پر قادر ہیں اور انھیں اس حد تک قدرت حاصل ہے کہ جب وہ افسانہ لکھتے ہیں تو صرف افسانہ نگار لگتے ہیں ناول تحریر کرتے ہیں تو ناول نویس بن جاتے ہیں شاعری کرتے ہیں تو بس شاعر محسوس ہوتے ہیں۔''

ہوسکتا ہے یہ بات سچ ہو لیکن ناول کے باطن میں جھانکیے تو بہر حال غضنفر کے اندر کا شاعر کہیں نہ کہیں ان کی معاونت کرتا ہے۔ جہاں تک سرنامہ کا تعلق ہے یقیناً یہ اچھا سرنامہ ہے۔ اس لیے کہ غضنفر اسلوب جو چاہیں اختیار کریں۔ ان کے ناولوں میں خواہ کوئی بھی موضوع ہو وہ ہر اعتبار سے زندگی اور زمین سے الگ نہیں ہوتے۔ زندگی کی اہمیت، انسان کی قدر و قیمت، اس دور میں اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس کی روح کیوں پیاسی ہے، اسے آبیاژے کی تلاش کیوں ہے، یہ سارے سوالات اور تلاشِ جواب سب کے سب 'آبیاژہ' میں سمٹ آتے ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے یہ صرف ایک لفظ نہیں بلکہ غضنفر کی پیاس، احساس و اضطراب ہے جو جا بجا ان کے ناولوں میں بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔

غضنفر کا اسلوب جو بھی ہو لیکن ان کی غیر معمولی فنکاری و تخلیق کاری کے تحت مختلف جہتوں میں پھیل جاتا ہے جس میں رومانیت سے لے کر زندگی کی حقیقت، انسان کی قدر و قیمت، اس کی ضرورت اس کی بھوک پیاس غرضیکہ کثیر معنوی جہات اختیار کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے غضنفر کا شاعر ہونا کام کرتا نظر آتا ہے۔ آسان نہیں ہے کہ ایک شاعر کا شاعرانہ اسلوب فکشن میں نہ صرف ڈھل جائے بلکہ اسلوب سے معنی کے رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر کر جائے۔ طرۂ امتیاز یہ ہے کہ غضنفر اسلوب کوئی بھی اختیار کریں لیکن وہ انسانی نفسیات اور سماجی حقیقت سے کہیں الگ نہیں ہوتے۔ پانی کو استعاراتی ناول کہا گیا۔ آبیاژہ کو علامت — لیکن ان سب کے پیچھے احتجاج کی جو روش اور خلش جھلکتی ہے وہی ناول کی شناخت بنتی ہے۔ ریشا نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ:

''وہ بنے بنائے راستوں پر نہیں چلتا، اپنی راہ خود بناتا ہے۔''

یہ جملہ غضنفر پر صد فی صد صادق آتا ہے۔ اپنی ایک الگ راہ بنانے میں جوکھم بہت ہوتے ہیں۔ غضنفر نے یہ جوکھم اٹھائے ہیں، طرح طرح کے اعتراضات بھی ہوئے ہیں جس کا جواب یہ ہے کہ آج کے ناول بقول وارث علوی زیادہ تر صحافیانہ بن گئے ہیں۔ جب جب زمینی مسائل بڑھیں گے یہ عیب یا کمزوری ادب میں آئے گی اسی لیے ہر طرح کا ادب لمحۂ موجود کا ہی ہوتا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ غضنفر نے اپنے آپ کو ان عناصر سے محفوظ رکھا ہے۔ بڑا ناول نگار زندگی کو کلیت میں دیکھتا ہے۔ پوری زندگی، پورے انسان کو دیکھتا ہے اور ناول نگار اپنے سماج اور اپنی تاریخ کے اندر ہی جنم لیتا ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ناول میں نفسیاتی دروں بینی ہی ناول کو فلسفیانہ بصیرت عطا کرتی ہے۔ ادب میں تجربہ کرنا یا کرتے رہنا اچھی بات تو ہے لیکن یہ بھی سمجھتے چلنا چاہیے کہ بڑے ادب اور تجرباتی ادب میں فرق ہے کہ بڑا ادب وقت کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے اور تجرباتی ادب کو کبھی کبھی انتظار کرنا پڑتا ہے۔ غضنفر اپنے ناولوں میں زبان و بیان کو بیحد اہمیت دیتے ہیں۔ یہ اچھی بات تو ہے لیکن اس میں خطرے بھی ہیں۔ بقول وارث علوی ''محض زبان و بیان کی خاطر کوئی ناول نہیں پڑھتا۔ قاری ناول میں صرف چہرہ نہیں دیکھتا بلکہ پورا سراپا دیکھتا ہے۔'' یہ سراپا اردو شاعری والا نہیں ہے بلکہ اس سے مختلف زندگی اور زمین کی وہ حقیقت ہے جس کی تلخی اور گرمی میں انسان سو بار مرتا اور جیتا ہے۔ کچھ لوگ غضنفر کی زبان کو رومان پرور کہتے ہیں، ضرور کہیں ان کا حق ہے، لیکن یہ رومان یلدرم اور نیاز والا نہیں اس لیے کہ معاشرہ جس قدر حقیقت پسند ہوتا جاتا ہے ناول کے ہیرو ہیروئن وغیرہ از خود رومانی ہوتے ہوئے بھی حقیقی بنتے چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ریشا قمر نے صرف ناولوں کی ترتیب نہیں کی بلکہ ایک عمدہ مقدمہ بھی لکھا ہے جس سے کسی قاری کو اختلاف مشکل سے ہی ہوگا اور اگر ہو تو اچھی بات ہوگی۔ اس لیے ترتیب یا تنقید صرف تحسین نہیں ہوتی بلکہ تجربہ کا عمدہ منطقی اظہار ہوا کرتی ہے۔

مدت سے غضنفر کا کوئی نیا ناول نہیں آیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا قلم خشک ہو گیا ہے۔ وہ آج بھی ہمہ وقت و ہمہ تن تخلیق کاری میں مصروف ہیں۔ ان کی مثنوی اور خودنوشت اس کے ثبوت ہیں لیکن ناول عمر کا نہیں زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور ایک اچھا ناول زندگی کا فلسفہ پیش کرتا ہے فکشن کے انداز میں۔ 'بڑا ناول' ناول کا کم ناول نگار کا زیادہ تعارف کراتا ہے۔ ادب اور زندگی کا یہ آبیاژہ کبھی خشک نہ ہو اس کی ذمہ داری صرف ناول نگار کی نہیں قارئین و ناقدین کی بھی ہے۔

میں غضنفر اور ریشا قمر دونوں کی خدمت میں مبارک باد کا نذرانہ پیش کرتا ہوں۔

کھانی ختم ھوئی

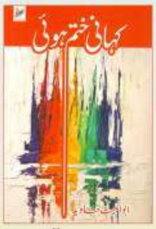

مصنف: ابواللیث جاوید
صفحات: 144، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ڈاکٹر شبانہ آفریں جاوید
لکچرار شعبۂ اردو، سریندر ناتھ ایوننگ کالج، کولکاتا

'کہانی ختم ہوئی' ابواللیث جاوید کا پانچواں افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے چار افسانوی مجموعے شائع ہو کر مقبول عام و خاص ہو چکے ہیں۔ ابواللیث جاوید نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب اردو ادب میں ترقی پسند تحریک اختتام پذیر ہو رہی تھی۔ ان کا پہلا افسانہ 'بے گناہ' دھنباد سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'جام نو' کے پہلے شمارہ میں دسمبر 1959 میں شائع ہوا تھا گو کہ ان کے متعدد افسانے اس سے پہلے بھی ادبی و نیم ادبی رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ اس وقت کے معروف ماہنامہ 'بیسویں صدی' دہلی میں ان کا ایک افسانہ 'نیا موڑ' رسالہ کے سالنامہ (جنوری 1970) میں شائع ہوا۔ یہیں سے ان کے ادبی سفر کا صحیح معنوں میں آغاز ہوا اور پھر ملکی اور غیر ملکی رسائل میں ان کی تخلیقات جگہ پانے لگیں۔ اس دور کے مطالبے کے پیش نظر ان کے بے شمار رومانی افسانے شائع ہوئے جو مواد اور زبان کے اعتبار سے بالکل منفرد تھے۔

جدیدیت نے ادب میں قدم جمائے اور 'تحریک' دہلی اور 'شب خون' الہ آباد جیسے رسائل اس کے ترجمان رسائل تھے۔ اس تحریک کے تحت علامتی اور تجریدی افسانے لکھے جا رہے تھے۔ ابواللیث جاوید نے بھی تواتر سے علامتی افسانے لکھے اور اس طرح علامتی افسانوں کا ایک مجموعہ 'کانچ کا درخت' 1980 میں منظر عام پر آیا۔ اس دور کے ختم ہو جانے کے نتیجے میں مابعد جدیدیت کی لہر دوڑی جس کے تحت کہانی کی مراجعت ہوئی باماجرہ کہانیاں (بیانیہ کہانیاں) لکھی جانے لگیں۔ ابواللیث جاوید کے دو افسانوی مجموعے 'اب صبح نہیں ہوگی' اور پیش نظر مجموعہ 'کہانی ختم ہوئی' انھیں بیانیہ کہانیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو ابواللیث جاوید گذشتہ چار/ پانچ دہائیوں سے مسلسل ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ پیش نظر مجموعہ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ابواللیث جاوید کے بیشتر افسانے موجودہ سماج کے کسی نہ کسی اہم مسئلہ کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شاعر/ ادیب سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کرتا ہے۔ تو یہ بات ابواللیث جاوید کے افسانوں پر صادق آتی ہے اور ان کے قارئین ان کی تحریروں سے ان مسائل کے تدارک کے لیے کوشاں بھی نظر آتے ہیں۔ زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ کا 'پیش لفظ' 38 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس پیش لفظ میں ایک جامع، مبسوط اور عالمانہ طرز بیان کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افکار علم کے موضوع پر وسیع المطالعہ ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے معروف محقق کی تحقیق

کے بہت قریب ہے۔ نظام تعلیم اور اس میں پیش آنے والے مسائل کے تعلق سے ابواللیث جاوید جوکا موقف ہے اس کی تائید ہر ذی ہوش کو کرنی چاہیے کیونکہ

صدائے نغمہ سرایانِ باغ سن سن کر فلک سے اتری ہے زہرہ بھی لینے کو تعلیم

'مختلف ادوار میں ہندوستانی سماج تعلیم کے حوالے سے' کے عنوان سے انصاف کیا گیا ہے جس میں تقریباً 9000 برس قبل مسیح کا ذکر کیا گیا ہے اور اس وقت کے سماجی حالات کی بازیافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سمراٹ اشوک (263-232 ق م) کے دور میں ہونے والی اصلاحی وفلاحی شخصیتوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ان کے کارناموں سے سماج کیسے متاثر ہوا ہے۔ اس بات کا انکشاف ہوتا ہے۔ اتنی لمبی مدت کے حالات کا تجزیہ کرنا اپنے آپ میں معتبر اور حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ابواللیث جاوید علم کے حقیقی طالب ہیں۔ ان کے اشتیاق اور تجسس میں علم کے تمام دھارے ملتے ہوئے نظر آرہے ہیں جو علم کے فکری رخ کو منظم کرتے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کی روشنی کے حوالے سے ابواللیث جاوید مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس مجموعہ میں شامل سبھی دس افسانے سماج کے کسی نہ کسی مسئلے کا اشاریہ ہیں۔ افسانہ 'شاخ زیتون' دنیا میں دہشت گردی کی بنا کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کی تاریخ حقیقت کا نہایت خوبصورت بیانیہ ہے۔ افسانہ 'میں خیریت سے ہوں' کورونا جیسی وبا کے شکار ایک فرد کا المیہ پیش کرتا ہے۔ افسانہ 'رونا نہیں ہے' کشمیر کے حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانہ 'مجھے ہے حکم اذاں' ایک خاص طبقہ کے نوجوانوں کی ذہنی کشمکش کا خوبصورت بیانیہ ہے جس کے ساتھ سماج کے نہایت بے جا رویوں اور اس نوجوان کے صبر کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ 'کتبہ' کے ذریعہ اردو زبان کے ساتھ ہو رہے سلوک اور ایک خاص طبقہ کو ہونے والے اخلاقی، تہذیبی وثقافتی نقصانات کا ایک نہایت خوبصورت نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ یقیناً اردو سے محبت کرنے والوں کو مایوس کرے گا اور پیاری زبان کے تحفظ پر غور کرنے والوں کو سوچنے پر بھی مجبور کرے گا۔ ان افسانوں کے علاوہ جو دوسرے افسانے ہیں بلاشبہ وہ بھی سماج کے کسی نہ کسی المیہ کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ اس افسانوی مجموعہ کے مطالعہ سے ایک ذہنی سکون تو ضرور حاصل ہوتا ہے۔ مگر سماج کے ان افراد کو بے چین ضرور کردے گا، جنھیں معاشرے کی ذرہ برابر بھی فکر ہے۔ عمومی طور پر ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے علمی شعور اور صلاحیت کو زندہ رکھیں۔ یہ مجموعہ ہر سنجیدہ فرد کے لیے تسکین اور معاشرے کی اصلاح کے خواہاں کے لیے بے چینی کا سبب ہوگا۔ اس کا مطالعہ ہر باشعور فرد کو کرنا چاہیے۔ اس مجموعہ کی پذیرائی ادبی حلقوں میں ضرور ہونی چاہیے۔

نصیب سے (ناولٹ)

مصنفہ/ ناشرہ: ڈاکٹر یاسمین اختر

صفحات 116، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2021

مبصر: شاہ عمران حسن: ، اے 22، شاہ ہاوس، خسرا نمبر 824 مکی مسجد کالونی، مدن پور کھادر ایکسٹینشن، پارٹ، نالہ روڈ، سریتا وہار۔ 110076 نئی دہلی

ریاست بہار کے ضلع بھاگلپور کی افسانہ نگار ڈاکٹر یاسمین اختر نے بہت جلد ادبی دنیا میں اپنی پہچان بنالی ہے۔ اب تک ان کی دس سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بہت کم وقت میں ڈاکٹر یاسمین اختر نے تحریری دنیا میں یہ عروج حاصل کیا ہے۔ ان کی پہلی کتاب سنہ 2014 میں شائع ہوئی اور گیارہویں کتاب 'نصیب سے' سنہ 2021 میں شائع ہوئی۔ محض 7 برسوں کے مختصر سے عرصہ میں 10 کتابوں کی اشاعت یقیناً بہت بڑی بات ہے۔

بھاگلپور یوں تو علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ آج بھی یہاں علم وادب کا چراغ روشن ہے۔ 350 کتابوں کے مصنف ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو کون نہیں جانتا جن کا تعلق بھاگلپور سے تھا اور جنھوں نے تقریباً تمام اصناف پر کامیابی کے ساتھ خامہ فرسائی کی۔

ڈاکٹر یاسمین اختر کا زیرِ نظر ناولٹ 'نصیب سے' ایک سماجی ناولٹ ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد صرف یہی بات کہی جاسکتی ہے کہ انسان کو جو بھی ملتا ہے نصیب سے ملتا ہے۔ نصیب بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود اگر آپ کوئی چیز حاصل نہ کرسکیں تب یہ بات کہی جائے گی کہ وہ چیز آپ کے نصیب میں نہیں تھی۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جانے کا نام نصیب نہیں ہے۔

ناول نگار ڈاکٹر یاسمین اختر کی ایک خاص اور اہم بات یہ ہے وہ اپنی تحریروں میں عام فہم زبان کا استعمال کرتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کو وہ ایک دوسرے سے پرونے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔ وہ مشکل وثقیل الفاظ سے گریز کرتی ہیں۔

'نصیب سے' کی کہانی جاویدہ نامی ایک ایسی خاتون کے ارد گرد گھومتی ہے، جسے دنیا میں کبھی خوشیاں نصیب نہیں ہوئیں۔ زندگی کی 35 بہاریں گزارنے والی جاویدہ کا ایک بوڑھی ماں کے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے۔ گھر باہر سب اس کے لیے تنگ ہے، اوپر سے غریبی کی مار نے اسے بے بس بنا دیا ہے۔ غربت کی وجہ سے اس کی شادی ابھی تک نہیں ہو پائی اور شادی کے ارمان بھی اس کے مٹتے جا رہے ہیں۔

جاویدہ کی زندگی میں اس وقت تھوڑی سی رونق ضرور لوٹ آتی ہے، جب اس کی زندگی میں وقارالدین آتا ہے۔ جو اس کا دور کا رشتہ دار ہے۔ وقارالدین دو معصوم بچوں کا باپ ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ اس کی بیوی کسی حادثے میں فوت ہوگئی ہے۔ وہ ایک بینک میں ملازم ہے، اسی شہر میں اس کا تبادلہ ہوا ہے۔ وقارالدین اپنے بچوں کے ساتھ جاویدہ کے گھر کے اوپری حصے میں رہنے لگتا ہے۔ اس کے دفتر جانے کے بعد جاویدہ ان کے بچوں کی دیکھ بھال کرنے لگتی ہے، دھیرے دھیرے بچے اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ حتی کہ جاویدہ کے بغیر بچوں کا ایک پل بھی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وقارالدین کا تبادلہ پھر کسی اور شہر میں ہو جاتا ہے، وہ اپنے بچوں کے ساتھ اس شہر میں جانے کا منصوبہ بناتا ہے۔ جب وہ یہ سب باتیں اپنے بچوں کو بتاتا ہے تو بچے بضد ہوتے ہیں کہ جاویدہ کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں جو کہ ممکن ہے۔ بچوں کی ضد کے آگے وقارالدین مجبور ہو جاتا ہے۔ اور پھر وقارالدین جاویدہ سے شادی کرکے اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اپنی شادی کا سن کر جاویدہ خوش ہو جاتی ہے اگرچہ اسے ایک ادھیڑ عمر کا شخص شوہر کے روپ میں مل رہا تھا۔

تاہم پڑوسیوں سے جاویدہ اور اس کی ماں کی خوشیاں دیکھی نہیں جاتیں وہ لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگتے ہیں۔ جاویدہ کی کردار کشی کرنے لگتے ہیں۔

جس شام جاویدہ اور وقارالدین کے نکاح کی تقریب تھی، اسی شام وقارالدین کی پہلی بیوی نادرہ نمودار ہو جاتی ہے جس کے بارے میں گمان تھا کہ وہ فوت ہوچکی ہے۔ جاویدہ کی خوشیاں پھر غم میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ وہ افسردہ ہو جاتی ہے اس کی ماں بولنا چاہتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ نہیں اماں! کچھ مت کہئے، یہ سب نصیب کا کھیل ہے۔ (نصیب سے، 93)

نادرہ کس طرح سے زندہ بچی لوگوں کو اس کی روداد سناتی ہے۔ اسے بھی جاویدہ کے حالات معلوم ہوتے ہیں اس کے دل میں بھی اس کے تئیں ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

نادرہ جاویدہ کے ساتھ نہ صرف ہمدردی جتاتی ہے بلکہ وہ جاویدہ کی زندگی میں پھر سے خوشی لانے کے لیے اسے اپنی بھائی نثار انصاری کی بیوی یعنی بھاوج بنانے کا فیصلہ کر

لیتی ہے۔اس طرح دوبارہ جاویدہ کا نصیب جاگ جاتا ہے اور جاویدہ کی زندگی میں رونق لوٹ آتی ہے۔

یہ ایک معاشرتی کہانی ہے، جس سے عام انسان کو آئے دن سابقہ پیش آتا رہتا ہے، جہاں غریب اور جوان لڑکیوں کا زندگی گزارنا کتنا مشکل ہے، تاہم اس ناولٹ میں یہ پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ آدمی کو ہر ممکن طور پر دوسروں کی مدد کرنی چاہیے اور دوسرے کی زندگی میں بھی خوشیاں لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میں اس معاشرتی ناولٹ کی تحریر پر ڈاکٹر یاسمین اختر کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کے لیے دعا گو ہوں!

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

پناہ گاہ

مصنف/ ناشر: نصرت شمسی

صفحات: 220، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021

مبصر: فیضان الہٰی، 97 فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 5، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

زیرِ تبصرہ کتاب 'پناہ گاہ' نصرت شمسی کے افسانوں اور ناولٹ کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خان نے تحریر کیا ہے۔ اس مجموعے میں کل اٹھارہ افسانے اور تین ناولٹ شامل ہیں۔ نصرت شمسی صاحبہ کا شمار دبستان رام پور کے جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ان کی تین تخلیق 'تاج محل'، 'اوڑھنی' اور 'ماہ تمام' شائع ہو چکی ہیں۔

سماجی برائی، ناانصافی اور معاشرے کے غریب طبقے پر ہونے والے ظلم وستم اور استحصال وغیرہ ان کے افسانوں کا خاص موضوع رہا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے نئے گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے افسانوں میں چند ایسے مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے جو اردو ادب کے لیے بالکل نئے ہیں۔ جیسے ان کا افسانہ 'میرا قصور کیا تھا' میرے خیال میں پہلا ایسا افسانہ ہے جس میں جنسی اضطراب اور جنسی ہیجان جیسے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس مسئلہ کے متعلق عوام کو سوچنے پر مجبور کیا گیا ہے کہ تھرڈ جینڈر بھی معاشرے کا ایک فرد ہے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک ہونا چاہیے جیسا معاشرے کے دوسرے افراد کے ساتھ ہوتا ہے۔

ان کا اسلوب سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے ان کو لفظوں پر خاص گرفت عطا کی ہے۔ نصرت صاحبہ کا یہ خاص اسلوب سطر اول سے ہی قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے۔ ان کے اسلوب کی یہی خاصیت ہے کہ ان افسانوں کو بار بار پڑھنے سے بھی قاری کو اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ سادہ اور آسان اسلوب کی ہی بنا پر وہ قاری کے ذہن کو بیدار کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

عشقیہ افسانوں میں ان کی انفرادیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان افسانوں میں عشق حقیقی و عشق مجازی کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ افسانہ 'یہاں ہجر میں بھی وصال ہے' کا پورا پلاٹ ہی عشق حقیقی اور مجازی پر مبنی ہے۔ جس میں انھوں نے عشق حقیقی اور عشق مجازی کا نہایت موثر اور واضح موازنہ پیش کیا ہے۔

موجودہ دور میں نوعمر لڑکے اور لڑکیوں کا بھاگ کر شادی کرنا معاشرے کے لیے ایک المیہ بنا ہوا ہے بچوں کا یہ عمل والدین کے لیے رسوائی کا سب بنتا ہے، اور نتیجتاً غیرت و ناموس کے نام پر ان کا قتل (Honour kiling) معمول بنتا جا رہا ہے۔ افسانہ 'تدارک' میں اسی مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں انھوں نے اسے واقعات کی تہہ تک جا کر ان کے جملہ عوامل و اثرات کو نمایاں کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

وجودیت دورِ حاضر کا ایک بڑا مسئلہ ہے، ہر شخص اپنے وجود اور تشخص کے تئیں تحفظات کا شکار ہے۔ موجودہ معاشرے میں طبقہ نسواں کے لیے اپنے وجود اور تشخص کو برقرار رکھنا ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ عورتوں کی حق تلفی اور استحصال تقریباً دنیا کے ہر معاشرے کی ناقابل انکار حقیقت ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا وجود اور تشخص ہمیشہ سے خطروں کا شکار رہا ہے۔ 'فریب خیال' اور 'تصور کائنات' جیسے افسانوں میں انھوں نے اس نازک مسئلہ کے حساس گوشوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور نہایت ہی دلنشیں انداز میں عورتوں کے وجود کو دنیا کی خوبصورتی قرار دینے کی کوشش کی ہے۔

مختلف ادیبوں نے مختلف دور میں طوائفوں کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ مرزا ہادی رسوا، عصمت چغتائی، منٹو، سرفراز حسین عزمی اور واجدہ تبسم وغیرہ جیسے تخلیق کاروں نے ان کے مسائل پر اپنے افسانوں اور ناولوں میں خاص توجہ دیا ہے۔ ان میں منٹو اپنے بے باک اسلوب اور حساس نظر کے باعث ممتاز ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مسائل بھی بدلتے رہتے ہیں چنانچہ ہر دور کے مسائل مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا نئے مسائل کو نئے انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمیں یہ خصوصیت بخوبی نظر آتی ہے۔ چنانچہ کتاب میں شامل افسانہ 'آدھے ادھورے' اور ناولٹ 'عشق کی صلیب' میں ہمیں ان کا یہی انوکھا اسلوب نمایاں انداز میں نظر آتا ہے۔ ان تخلیقات میں انھوں نے طوائفوں کی نجی زندگی اور معاشرتی زندگی کو اپنے قاری کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس کی وجوہات اور ان کا حل بھی دریافت کرنے کی کاوش کی ہے۔

ان کے افسانوں میں ایک خاص قسم کی مقصدیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے کسی افسانے میں موجودہ عہد کے مسائل کو اجاگر کرتی ہیں تو دوسرے افسانے میں خود ہی ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب، سوال یا پھر افسانہ فریب خیال، تصور کائنات اسی طرح 'آدھے ادھورے' ناولٹ 'عشق کی صلیب' جیسے افسانے ان کے اسی خاص طرز تحریر کا نمائندہ ہے۔

کہانی میں تجسّس پیدا کرنا اور اس کو برقرار رکھنا نیز کہانی کو ایک خاص طریقے سے نقطہ عروج تک پہنچانا جس سے کہ قاری کا تجسس اور تھرل (Thrill) برقرار رہے افسانہ نگار کے فن کا کمال ہے۔ نصرت صاحبہ کو اس فن پر خصوصی دسترس حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں ان کی یہ فنکاری بخوبی نظر آتی ہے۔ افسانہ 'وہ ایک رات' گرچہ ایک تخیلاتی کہانی ہے مگر اس میں تجسس کو بہت ہی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے قاری خود کو افسانے کے اثر سے آزاد نہیں کر پاتا ہے۔

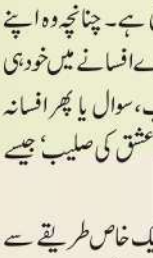

مڈل کلاس

مصنف: محمد ذاکر

صفحات: 95، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: عبارت پبلی کیشن، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کالی باغ، بتیا، مغربی چمپارن، بہار

محمد ذاکر اردو کے سینئر فکشن نگار ہیں۔ آپ پیشے سے ایڈوکیٹ ہیں لیکن اوائل عمری سے ہی اردو فکشن کی تخلیق سے گہرا شغف رکھتے ہیں نیز وہ گزشتہ چار دہائیوں سے ملک و بیرون ملک کے موقر رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ ان کی اب تک چار کتابیں 'بوڑھی گنڈک تٹ کا بنجارہ (افسانے)'، 'جگنوؤں کی بارات (افسانے)'، 'ماں کی بستی (ناول)' اور 'مڈل کلاس (ناول)' منظر عام پر آ چکی ہیں۔

محمد ذاکر نے اپنی کہانیوں میں اپنی ذات کو اولیت دی ہے، ساتھ ہی بدلتے ہوئے

معاشرے کے ہر منفی اور مثبت پہلو پر بھی گہری نظر رکھی ہے۔ ان کے یہاں ناولوں اور کہانیوں میں تصنع، ملمع اور تکلف کی جگہ بیبا کی، صاف گوئی اور جرأتِ اظہار کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ محمد ذاکر نے زندگی کے ٹوٹتے، بکھرتے لمحوں کی کہانی بھی لکھی ہے اور بنتے، سنورتے، وقتوں کی داستان بھی۔ لیکن انھوں نے ہر جگہ خالص اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنا راہنما بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش میں جو کچھ دیکھا، محسوس کیا یا بھوگا، اسے ہو بہو کہانی کا روپ دے دیا۔

محمد ذاکر نے اپنی تخلیقات میں ایسے نجی اور خانگی معاملات بھی کھل کر بیان کر دیئے ہیں جنھیں چھپانے کے لیے دوسرے لوگ سو سو جتن کرتے ہیں۔ میری دانست میں محمد ذاکر کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اردو فکشن کو آج جس بصیرت اور آگہی کی ضرورت ہے، وہ ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کا وژن عام اردو والوں سے الگ ہے اور وہ کہانی بنتے وقت اپنی فکر اور اپنے تجربے کو اولیت دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں فطری پن کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اس کی بہترین مثال ان کا تازہ ناول 'مڈل کلاس' ہے۔ جو حال ہی میں چھپ کر منظر عام پر آیا ہے۔

ناول 'مڈل کلاس' ہمارے معاشرے کے ان چند نوجوانوں کی کہانی ہے جو اپنی تعلیم نامکمل چھوڑ کر صرف اس لیے سیاست میں آجاتے ہیں کہ سسٹم بدلے اور گڈ گورنینس قائم ہو تاکہ سماج کے ہر طبقے کے باصلاحیت نوجوانوں کو ملازمت ملے اور ذات برادری کے نام پر کسی کے ساتھ عصبیت نہ برتی جائے۔

اس ناول میں ظفر، رام نگینہ، جونسو اس ناول کے محض کردار ہی نہیں بلکہ احتجاج اور انقلاب کی آواز بھی ہیں۔ جیسا کہ ناول کے مطالعے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کی حکومت بھی بنتی ہے مگر ذات پات کے ٹھیکدار اسے چلنے نہیں دیتے اور نتیجتاً وہ پھر سے اپنی پرانی حالت میں واپس آجاتے ہیں۔ یہ ناول گرچہ چمپارن کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن اس کا موضوع پورا ملک ہے۔ یہ ناول ہندوستان میں کاسٹ سسٹم اور حکومتی نظام کو سمجھنے اور اسے بدلنے کی ایک مستحسن کوشش ہے۔ لیکن فی الوقت اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ کیوں کر کاسٹ سسٹم ہر سسٹم پر بھاری ہے اور سماج کے پسماندہ طبقے کے ہر فرد کو انصاف دلانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے ناول کے کردار ایسی انقلابی باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

کتاب کی طباعت عمدہ اور قیمت بہت مناسب ہے۔ امید ہے اسے ادب کے خالص حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوگی۔

تراجم

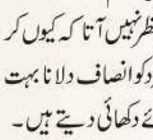

بن پھول

مترجم: احمد کمال حشمی

صفحات: 336، قیمت: 203 روپے، سنہ اشاعت: 2022

مبصر: فرزانہ پروین

اسسٹنٹ ٹیچر، دی قریش انسٹی ٹیوٹ، کولکاتہ، مغربی بنگال

ترجمہ نگاری کسی کتاب کی تخلیق سے زیادہ کٹھن عمل ہے کیونکہ کسی ادب پارے کی تخلیق میں مضمون نگار پوری طرح آزاد ہوتا ہے کہ وہ جاہے جس طرح بھی اپنے خیالات کی ترسیل کرے لیکن ترجمہ نگاری میں وہ ایک دائرے میں قید ہو جاتا ہے اور اسے اصل مصنف کے انداز، سوچ، زبان، مقصد، جذبات بلکہ ہر چھوٹی بڑی بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ لفظوں کے انتخاب میں کہیں کوئی چوک نہ ہو جائے اور اصل متن کی ترسیل نہ ہو پائے لہٰذا مترجم کو بہت سنبھل کر قدم بڑھانا ہوتا ہے، ان تمام باتوں کی روشنی میں جب ہم بن پھول کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ احمد کمال حشمی نے ایک کامیاب مترجم کا حق ادا کر دیا ہے۔

'بن پھول' بولائی چند مکھو پادھیائے عرف بن پھول کی ایک سو دو منتخب کہانیوں کے تراجم کا مجموعہ ہے۔ کتاب کتنی شاندار اور کہانیاں کتنی پر کشش، پر لطف اور دلکش ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مترجم نے 500 کہانیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد فقط 102 کہانیوں کا انتخاب کیا، یہ سخت انتخاب اس بات کا ضامن ہے کہ ہر کہانی میں کوئی خاص بات تو ضرور ہے۔

بن پھول مختلف رنگوں کے گل بوٹوں کا مجموعہ ہے اس میں مزاحیہ کہانیاں بھی شامل ہیں تو اساطیری کہانیاں بھی، کچھ کہانیاں ایسی ہیں جو بے چشم نم پڑھی نہیں جا سکتیں اور کچھ تو حیرت انگیز ہیں۔ اساطیری کہانیوں میں کراماتی دیوتا، نئی پرانی، بینوتا دستیدار اور وہ لڑکی بہت ہی عمدہ کہانیاں ہیں۔

'کراماتی دیوتا' میں شیو جی کی کرامت ہر سال ایک شخص کے پاگل ہونے کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی لیکن اس سال کسی کے پاگل نہ ہونے کی چنتا نیل منی کو اس طرح ستا رہی تھی کہ وہ گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں پورے گاؤں میں پھولتی سانسوں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ ہر گھر میں کسی پاگل کو ڈھونڈ رہے تھے کہانی کی یہ آخری لائن دیکھیں:

"سناتن پور کے باشندوں نے راحت کی سانس لی۔ کراماتی دیوتا کی کرامت رونما ہو چکی تھی"

'وہ لڑکی' بن پھول کی بہترین کہانیوں میں سے ایک ہے اس کہانی کو پڑھنے کے بعد کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میں پھر کچھ پڑھ ہی نہیں پائی اور گھنٹوں میں اس کے سحر میں کھوئی رہی۔

یہ تمام کہانیاں بے شک بن پھول کی ہیں لیکن یہ مترجم کا کمال ہوتا ہے کہ اس نے اسے کس طرح پیش کیا ہے۔ بعض ترجمہ شدہ کہانیاں فقط لفظوں کا ترجمہ ہوتی ہیں۔ ایسے ترجمے مفہوم سے عاری ہوتے ہیں۔ مصنف کا مقصد واضح ہی نہیں ہو پاتا ہے لیکن یہ احمد کمال حشمی کے قلم کا جادو ہے کہ انھوں نے ترجمے میں بھی تخلیق کی صفت پیدا کر دی ہے۔

بن پھول میں چند مزاحیہ کہانیاں بھی ہیں جن میں بیچو لال، جان بل، چتوری لال، حس مزاح، وغیرہ شامل ہیں۔

'بیچو لال' پیٹ کا مریض تھا آخر میں اس کے مر جانے کا دکھ تو ہوتا ہے لیکن اس نے اپنے پیٹ کے لیے جتنے جتن کیے اس سے مسکرائے بغیر پڑھنا مشکل ہے۔

'جان بل' جو انگلینڈ کا باشندہ ہے اس کے ہندوستان (کولکاتا) آنے اور یہاں کے پان کھانے اور پھر اس کے اثرات کو دلچسپ اور پر لطف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آنکھیں، درندہ تو نہیں، حل، ایک صدی کا فرق، کالی لڑکی ایسی کہانیاں ہیں جنھیں پڑھ کر سینے میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں۔ 'کالی لڑکی' منفرد قسم کی کہانی ہے مصنف کی سوچ اس کی فکر کی اڑان پر دل سے واہ نکلتی ہے۔ علاوہ ازیں بھکاری، قاری کی موت، وہ، پوسٹ کارڈ، فاضل کرایہ وغیرہ بھی اچھی کہانیاں ہیں۔

نادر کتابوں کا عمدہ ترجمہ ہو جائے تو ہر دور کے لوگ اس سے فیض یاب ہوتے ہیں اس سے کتابوں کے ذخیرے میں نہ صرف گرانقدر اضافہ ہوتا ہے بلکہ زبان و ادب کا بھی فروغ ہوتا ہے اس کی بہترین مثال باغ و بہار ہے۔ دو سو بیس سال گزرنے کے باوجود آج بھی اس کی شادابی اور تازگی برقرار ہے اور آج بھی لوگ اصل متن 'قصہ چہار درویش' کے بجائے ترجمہ باغ و بہار کا ذوق و شوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ احمد کمال حشمی میں ایک اچھے مترجم کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ زبان و بیان کی سادگی، لطافت، انداز و بیان، لفظوں کے انتخاب پر انھیں دسترس حاصل ہے مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اہل علم کے حلقے میں خوب سراہی جائے گی۔

خاکہ

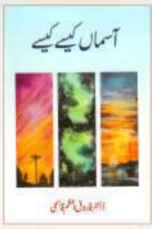

آسماں کیسے کیسے

مصنف: ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی
صفحات: 200، قیمت: 200، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: حذیفہ شکیل، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، پاٹلی پترا یونیورسٹی، پٹنہ

'آسماں کیسے کیسے' ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی کی چھٹی اور تازہ تصنیف ہے، جس کا سال اشاعت 2022 ہے، اس میں وہ خاکے یا خاکہ نما مضامین شامل ہیں جو 2008 سے لے کر اب تک مختلف موقعوں پر مصنف کے زیر قلم آئے ہیں۔

ادبی اصطلاح میں خاکہ ایک ایسی صنف نثر ہے جو مختصر ہونے کے باوجود شخصیت کا بھر پور تاثر پیش کرے اور لغت میں اس کے معنی ابتدائی نقشہ یا ڈھانچہ کے ہیں۔ خاکہ کو لفظی تصویر سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک عمدہ اور بہترین خاکہ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے شخصیت کی تراش خراش، چال ڈھال، وضع قطع، نشست و برخاست، لباس و پوشاک، عادات و اطوار اور کارہائے نمایاں غرضیکہ تمام اوصاف و خصائل اور حال و احوال کی پورے طور پر وضاحت ہو جائے۔ خاکہ بنیادی طور پر ایک داخلی صنف ہے اور خاکہ کا موضوع شخص کے بجائے شخصیت ہوا کرتا ہے، یعنی خاکہ نگار متعلقہ شخص کے تئیں اس کی زندگی کے صرف ان کوائف کو بیان کرتا ہے جن سے اس کی شخصیت کے اہم خد و خال نمایاں ہو جائیں۔ یہ ایک نازک اور مشکل فن ہے۔ اردو کے پہلے باقاعدہ خاکہ نگار مرزا فرحت اللہ بیگ تسلیم کیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے استاذ محترم ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ بہ عنوان 'نذیر احمد کی کہانی: کچھ ان کی، کچھ میری زبانی' قلم بند کیا تھا۔ ان کے بعد خاکہ نگاری کی اس روایت کو مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، ممتاز مفتی، سعادت حسن منٹو، رئیس احمد جعفری، شاہد احمد دہلوی، وغیرہم نے آگے بڑھایا۔ فاروق اعظم بھی اپنے خاکوں کے مجموعے 'آسماں کیسے کیسے' کے ذریعے مرزا فرحت اللہ بیگ سے شروع ہوئے اس فن کی کڑی کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔

کتاب کی شروعات مصنف کی معروضات سے ہوئی ہے۔ پھر اس کے بعد معروف ناقد و ادیب پروفیسر علیم اللہ حالی کی کتاب کے تئیں ایک تعارفی تحریر 'تقدیم' کے عنوان کے تحت درج ہے۔ کتاب بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ اکیس خاکوں یا خاکہ نما مضامین پر مشتمل ہے جسے تین مرکزی عنوانات کے ذریعے پیش کیا ہے۔ پہلا عنوان ہے 'میرے اساتذہ'، اس کے تحت آٹھ خاکے پیش کیے گئے ہیں، جن شخصیات کے خاکے ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق معروف دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند سے رہا ہے۔ ان خاکوں میں جن نابغۂ روزگار ہستیوں کا تذکرہ ہے، ان کے اسمائے گرامی ہیں، شیخ نصیر احمد خاں، انظر شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد، مولانا نعمت اللہ اعظمی، مولانا ریاست علی بجنوری، مفتی سعید احمد پالنپوری، مولانا عبدالخالق سنبھلی اور مولانا نور عالم خلیل امینی۔ دوسرا مرکزی عنوان 'شعراء، ادباء اور صحافی' ہے، جس میں مشہور شاعر و ادیب کلیم عاجز، صحافی و تجزیہ نگار عادل صدیقی اور ناقد و محقق حقانی القاسمی کے خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ حصۂ اول کا تیسرا اور آخری مرکزی عنوان 'علماء، مجاہدین آزادی، سیاست داں اور سماجی کارکنان' ہے۔ اس میں کل دس خاکے ہیں جن میں سے مولانا اسرار الحق قاسمی، ندیم الواجدی، مفتی ظفیر الدین مفتاحی، مولانا اسمعیل کٹکی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے برادر زادہ جمال احسن گیلانی، وغیرہ کے خاکے قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ اکیس خاکوں کے علاوہ کتاب کے دوسرے حصے میں 'چند خاکچے' کے تحت دو ذیلی گوشوں کے ذریعے تیرہ خاکچے موجود ہیں۔ گوشۂ اول 'چند احباب اور مشاہیر ادب' ہے۔ احباب کے علاوہ جن مشہور و معروف مشاہیر ادب کا اس میں تذکرہ آیا ہے، ان میں مشرف عالم ذوقی، مناظر عاشق ہرگانوی، انجم عثمانی، ترنم ریاض اور رتن سنگھ کے نام اہم ہیں۔ دوسرا گوشہ 'کچھ زندہ اور زندہ دل دوست' ہے۔ اس عنوان سے ہی اس کے ذیل میں کیا کچھ پیش کیا گیا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اخیر کے دو صفحوں میں 'تعارف' کے عنوان سے صاحب کتاب کا مختصر سا بایوڈاٹا بھی منسلک ہے جو علم و ادب اور تصنیف و تالیف کی راہ میں ان کی فعالیت سے ہمیں واقف کراتا ہے۔

فاروق اعظم کا قلم چونکہ پچھلی ڈیڑھ دہائیوں سے مختلف موضوعات پر مسلسل چلتا رہا ہے اس لیے اس کتاب کو پڑھ کر صاحب کتاب کے قلم کی روانی، زبان و بیان کی برجستگی، تراکیب کی عمدگی، اور اسلوب کی شگفتگی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ عبارتیں ادب کی چاشنی سے مملو اور حقیقت کے دامن سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر تفہیم کی تسہیل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وہ علاقائی اور عام فہم زبان کا استعمال بھی کرتے ہیں جس سے بجائے خود ایک قسم کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ شخصیات کی خاکہ نویسی کے دوران جب وہ کسی کی خامیوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں تو اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ وہ دیگر محاسن میں دب کر رہ جاتی ہیں اور میں اسے مصنف کا کمال فن تصور کرتا ہوں۔ ایک خاص بات جو انھیں ممتاز کرتی ہے، وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب عنوانات اور سرخیاں قائم کرنے کا خوبصورت ملکہ بھی رکھتے ہیں، جس کے ذریعے قاری کی توجہ عنوان پڑھ کر ہی اس کے ذیل میں لکھی گئی تحریر کو پڑھنے کی طرف بہ آسانی مبذول ہو جاتی ہے۔ بطور نمونہ چند خاکوں کے عنوان دیکھیے۔ خورشید ادب کا دو جہتی نور: نور عالم خلیل امینی، شاہ زباں شاہ قلم، تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم، سیف و قلم کے مجاہد، دل اجلا صورت نورانی: سید جمال احسن گیلانی، وغیرہ۔

کتاب ظاہری اور باطنی حسن کا سنگم ہے، سرورق دیدہ زیب، طباعت معیاری اور کمپوزنگ بھی عمدہ ہے۔ مصنف نے اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیتے ہوئے عنوان کی مناسبت سے سرورق پر رنگ برنگے آسمان کی تصویریں بھی لگائی ہیں جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ کتاب کا نام امیر مینائی کے مشہور زمانہ شعر:

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

سے ماخوذ ہے۔ کتاب کے عقبی حصے پر دارالعلوم دیوبند کے مؤقر استاذ و مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد سلمان بجنوری اور فلیپ پر معروف ناقد حقانی القاسمی، دارالعلوم وقف دیوبند کے مہتمم مولانا سفیان قاسمی اور ڈاکٹر غضنفر اقبال جیسی مقتدر اور علمی شخصیات کی کتاب اور صاحب کتاب کے تئیں تاثراتی تحریریں درج ہیں جو بہت حد تک کتاب کی اہمیت و افادیت کو سمجھنے میں معاون و ممد ہیں۔

یہ کتاب اپنے اندر ایک جہان سمیٹے ہوئی ہے۔ مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی نابغۂ روزگار شخصیات کے خاکے یکجا ہونے کی وجہ سے اس کی حیثیت خاکوں کے اس گلدستے کی سی ہو گئی ہے جس میں مصنف نے ان قیمتی گلوں کو ایک ساتھ سجا دیا ہے جن کی خوشبوؤں سے ایک عالم عرصۂ دراز تک مستفید ہوتا رہا ہے اور بعضوں سے آج بھی ہو رہا ہے۔ مجموعی طور پر کتاب اردو کے ادبی سرمایے میں خوبصورت اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

شاعری

اشارت

شاعر: شاہد انور
صفحات: 144، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: ترسیل پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر عفت زریں، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ماتا سندری کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

کسی کے فن پر لکھنا، کسی مجموعے پر اپنے تاثرات قلمبند کرنا ایک رسمی اور روایتی بات ہے۔ مگر اس شخصیت کو قریب سے دیکھنا، اس کی ذات کو، اس کے فن کو محسوس کرنا دوسری بات۔ 'اشارت' شاہد انور کا پہلا مجموعہ ہے جو مشاہیرِ ادب کے اظہارِ خیال کے علاوہ تین نقوش پر مشتمل ہے۔ نقشِ اوّل۔ حمد، نعت، سلام۔ نقشِ دوم۔ غزلیات اور نقشِ سوم۔ نظمیں ونغمہ۔ شاہد انور میرے والدِ محترم حضرت مشیر جھنجھانوی کی ذات سے اس وقت سے منسلک ہیں جب وہ غالباً ہائی اسکول میں تھے۔ یہ ادبی سفر تبھی سے جاری و ساری ہے۔ انکا بہت سا کلام ملک گیر مشاعروں کے علاوہ ملکی وغیر ملکی رسائل وجرائد کے حوالے سے قارئین تک پہنچا۔ ذاکر حسین کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد شاہد انور ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب چلے گئے تھے مگر وہاں بھی انھوں نے اپنے فن کے چراغ کی روشنی مدھم نہ ہونے دی۔ اکثر و بیشتر وہاں کے اخبارات کی رپورٹوں سے انکی ادبی سرگرمیاں ہم تک پہنچتی رہتی تھیں۔

شاہد انور کے فن پر اگر نظر ڈالوں تو ایک جہدِ مسلسل، لگن، مطالعہ ان کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ مثلاً

ہمارے شہر کی خاموشیاں نرالی ہیں — سکون بخش ہیں چہرے مگر سوالی ہیں
ہم اپنے ذہن پر وہ زخم سہہ چکے شاہد — دوائیں جنگی زمانے نے اب نکالی ہیں

اگر میں یہاں یہ کہوں کہ والد صاحب کا فنی ورثہ کچھ میرے اندر منتقل ہوا اور بہت کچھ شاہد انور کے اندر تشکیل پاتا رہا تو غلط نہ ہوگا۔ جس کا نتیجہ 'اشارت' کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ 'اشارت' اپنی طباعت کے اعتبار سے دیدہ زیب اور حیثیت کے اعتبار سے معیاری ہے۔ مجموعے کا نام پرکشش ومنفرد ہے۔ اس پر شاہد کا شعر اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

بصیرت ہے، بلاغت ہے، سلاست ہے، مہارت ہے۔
غزل سے بات کرنے میں، محبت کی اشارت ہے۔

اس مجموعے میں جو انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ ان میں اکثر بہت عمدہ ہیں۔ میں نے اس میں مشاہیرِ ادب کے اظہارِ خیال پڑھے جو یہاں میری بات کی تائید میں دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب فاروق ارگلی (معروف صحافی وشاعر) فرماتے ہیں :

''راقم کو شاہد کے کلام کی جو خوبی سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے برجستگی اور سادگی کے ساتھ حسنِ بیان جس میں نو کلاسیکی غزل کی جھنکار بھی ہے اور نئے لب و لہجے کی مہکار بھی۔ غزل کی ملاحت اور سلاست سے آراستہ آمد کے سانچے میں ڈھلے اشعار میں شدتِ جذبات، کربِ احساس اور زندگی کی تلخ وشیریں حقیقتوں کا برملا اظہار شاہد کے کلام کی وہ خوبی ہے جو انھیں دہلی اسکول کا نمائندہ شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔''

جناب ارشد غازی (علی گڑھ کے قادر الکلام شاعر و ماہرِ تعلیم) فرماتے ہیں:

''شاہد انور نے اصنافِ سخن میں کچھ تجربات بھی کیے ہیں، لیکن سونا کسی بھی بھٹی میں پگھلے وہ سونا ہی رہتا ہے۔ ان کی شاعری روایت اور درایت کا حسین امتزاج ہے۔ یہ طے ہے کہ اس شعری مجموعے سے سرسری طور پر نہیں گزرا جا سکتا کہ چمن میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے صحت بخش ہوا کرتے ہیں۔''

آخر میں میری ایک ہی تمنا ہے کہ شاہد انور کی یہ شاعرانہ اِشارت اردو ادب میں بصیرت کی بارش بن کر برسے اور جتنی خلوص ومحبت اور سچائی شاہد کی شخصیت میں ہے اتنی ہی سچی داد شاہد کے اِس پہلے کارنامے کو نصیب ہو اور میری دلی آرزو ہے کہ یہ سب میں اپنی زندگی میں ہوتے ہوئے دیکھوں، آمین۔

رسائل و جرائد

سہ ماہی جدید فکر و فن

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر پنکج للت
مہمان مدیر: زاہد ابرول، معاون مدیر: ڈاکٹر عبدالکریم آزاد
صفحات: 126، قیمت: 15 روپے، سنہ اشاعت: جولائی تا ستمبر 2022
رابطہ: ڈائریکٹر، بھاشا وسنسکرتی وبھاگ، بلاک 39
ایس ڈی اے کمپلیکس، شملہ۔ 171009 (ہماچل پردیش)، فون: 0177-2626614
مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، نئی دہلی۔ 110025

اردو ایک ایسی زبان ہے جو نامانوس اور اجنبی علاقوں میں بھی محبت کی شمع روشن کر دیتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''تنگ وتاریک کمرے میں بھی اس کے دو لفظ اگر گونجتے ہیں تو ہر طرف روشنی سی ہونے لگتی ہے۔'' اس ہند آریائی زبان کا تعلق اذان سے بھی ہے، ناقوس سے بھی۔ شہر طرب سے بھی ہے، شام کرب سے بھی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو زبان کا رشتہ ہندوستان کے بہت سے اساطیری شہروں کے ساتھ ساتھ دیو بھومی اور ویر بھومی ہماچل پردیش سے بھی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ برف کی آغوش میں بھی اردو کی حدت وحرارت برقرار ہے۔ برفیلے پہاڑوں کے صوبہ ہماچل پردیش کے فطری حسن میں اس زبان کا جمال بھی اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ یہیں کے بھاشا وسنسکرتی وبھاگ سے 'جدید فکر وفن' کے نام سے ایک علمی وثقافتی مجلّہ برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ اس مجلّے نے اپنی ایک الگ ثقافتی اور ادبی پہچان بھی بنائی ہے۔ اس کی ادارت سے اردو کے کچھ مشاہیر وابستہ رہے ہیں۔ ایک زمانے میں شباب للت جیسے معروف ادیب وشاعر اس کے حلقۂ ادارت میں شامل تھے۔ بھاشا وسنسکرتی وبھاگ ہماچل پردیش کے ڈائرکٹر ڈاکٹر پنکج للت اس کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ زاہد ابرول مہمان مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں اور ڈاکٹر عبدالکریم آزاد مہمان معاون مدیر ہیں۔ یہ سہ ماہی رسالہ ذو لسانی ہے۔ اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا تازہ (جولائی تا ستمبر 2022) شمارہ اپنے مندرجات اور مشمولات کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔ اس میں حسب روایت مضامین بھی ہیں، افسانے بھی، غزلیں، نظمیں اور انشائیے بھی۔ مجلّے کا اداریہ نہایت اہم موضوع پر ہے۔ اس میں زاہد ابرول نے ادب کی دو اہم اصناف شاعری اور نثر کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور نثری نظم پر اپنا ردِعمل ظاہر کیا ہے۔ ان کے اس ردِعمل سے اختلاف کی گنجائش ہے پھر بھی اس بابت اربابِ نقد کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ شاعری اور نثر کے درمیان جو دیوار ہے اسے پختہ رہنے دیا جائے یا منہدم کر دیا جائے۔ مضامین کے ذیل میں خواجہ کوثر حیات اورنگ آباد (مہاراشٹر) کا مضمون 'غالب اپنے خطوط کے آئینے میں' شامل ہے جس میں انھوں نے محاسن خطوطِ غالب پر عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ ان کی یہ رائے بڑی قیمتی ہے

کہ ”غالب کی طبیعت کی شگفتگی وشوخی ان کا جمالیاتی احساس، فکروفن کی باریکیوں سے ان کی آگہی، عمیق مشاہدہ، لسان پر مہارت، معاشرے اور سماج کے تئیں ان کی فکرانگیزی اور سب سے بڑھ کر منفرد انداز بیان، ان کے کلام، نثر پاروں اور مکتوب میں جھلکتی ہے۔ ’اردو شاعری کی تخلیقی ضیا‘ میں آمنہ فاروقی محمد امام الدین نے اردو کے نقاد اور محقق پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی شاعری پر بھرپور مضمون لکھا ہے۔ ان کے شعری محاسن اور انداز بیان پر گفتگو کرتے ہوئے ضیا کی شعری کائنات کی عمدہ سیاحت کرائی ہے۔ کورونا دور میں لکھے گئے ضیا صدیقی کے یہ شعر واقعی دل کو چھو لینے والے ہیں:

کسی سے کوئی تعلق نہ واسطہ ہے اب　　خود اپنی ذات میں گم ہیں نہ رابطہ ہے اب
خدا سبھی کو بس امن و امان میں رکھے　　ہر ایک لمحہ دعاؤں کا سلسلہ ہے اب

محمد آصف حسین نے ’ساحر کی شاعری کے تشکیلی عناصر‘ کے عنوان سے عمدہ مضمون لکھا ہے اور ان کی شاعری کے تین تشکیلی عناصر (1) ماں کی محبت (2) والد کی زیادتی (3) جاگیردارانہ نظام سے نفرت، کے حوالے سے ساحر کی حقیقت پسندانہ شاعری کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ ’شرر سے شعلوں تک‘ نوجوان نقاد غلام نبی کمار کی تحریر ہے۔ جس میں انھوں نے جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والی فریدہ کول کی شاعری کے مجموعے ’شرر سے شعلوں تک‘ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ فریدہ کا یہ شعر عمدہ ہے۔

ہم نوا کوئی نہیں ہم زباں کوئی نہیں　　اس بھری دنیا میں اپنا مہرباں کوئی نہیں

اسی شمارے میں مہمان مدیر زاہد ابرول کی ایک سلسلے وار تحریر کی دوسری قسط بہ عنوان ’ہم غالب و نظیر نہیں بن سکے تو کیا‘ شامل ہے۔ پہلی قسط میں انھوں نے آنجہانی جناب لال چند پرارتھی کا ذکر کیا تھا۔ دوسری قسط میں دھرم شالہ ہماچل پردیش کے رہنے والے بھگوان داس شعلہ (پ: 23 ستمبر 1911، و: 26 اکتوبر 1968) کے حوالے سے معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بھگوان داس شعلہ کے سوانحی کوائف کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا تعلق مالیر کوٹلہ پنجاب سے تھا اور انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انگریزی میں ایم اے اور ایل ایل بھی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ لدھیانہ، حصار اور دھرم شالہ میں وکالت کی اور پٹیالہ، نابھا، ترن تارن میں بطور ایگزیکیوٹو آفیسر کام کرتے رہے۔ وہ مشاعروں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ ان کا کلام محفوظ نہیں ہے لیکن ان کی کچھ بیاضیں زاہد ابرول نے تلاش کی ہیں جن میں مہا کاویہ ’شاہنامہ راجستان‘ قابل ذکر ہے۔ اس میں شعلہ نے پرتھوی راج چوہان اور سنجوگتا کی داستانِ عشق بیان کی ہے۔ انھوں نے کرشن، گیتا، کالی داس، شکنتلا، چانکیہ، سمراٹ، اشوک، رشی بالمکھی، گرونانک، گروگووند سنگھ، بندہ بہادر بیراگی، رشی دیانند، مہاتما گاندھی وغیرہ پر نظمیں بھی لکھی ہیں۔ زاہد ابرول نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ بھگوان داس شعلہ کو اردو زبان سے بے انتہا محبت تھی۔ چونکہ شعلہ کا کلام دستیاب نہیں ہے اس لیے انھوں نے ان کا نمونۂ کلام بھی پیش کیا ہے۔ ’اردو کی ہچکیاں‘ کے عنوان سے ان کی ایک طویل نظم ہے جس میں انھوں نے اردو کا استغاثہ عوام کی عدالت میں پیش کیا ہے۔ اس کا آغاز دیکھیے کتنا خوبصورت ہے۔

مجھے اے ہندیو تم سے مگر اتنی شکایت ہے　　قصور اردو کا آخر کیا ہے جس سے اتنی نفرت ہے
تمارے دیس میں پیدا ہوئی، پھولی پھلی اردو　　تمھارے زیر سایہ آج تک پلتی رہی اردو
اسے ترکِ وطن پر کس لیے مجبور کرتے ہو　　اسی کی ماتری بھومی سے اسے کیوں دور کرتے ہو
بری تقدیر ہے مانا کہ یہ قسمت کی ہیٹی ہے
مگر اس دیس کی اولاد ہے، ہندی کی بیٹی ہے

اس نظم کا ہر بند ایسا ہے جو اردو سے ان کے بے پناہ عشق اور محبت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اسی شمارے میں ڈاکٹر نریش، فیاض احمد فیضی اور اسد رضا کی تحریریں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ رینو بہل، انیس امروہوی، پرویز شہریار، کے کے نندہ اشک کے افسانے ہیں۔ غزلیں اور نظمیں بھی ہیں جن میں چندر بھان خیال، اعجاز پاپولر میرٹھی، ضمیر درویش، عزیز پریہار، راشد جمال فاروقی جیسے اہم نام بھی ہیں تو کئی ایسے نام بھی جو بہت سے اردو قارئین کے لیے نئے ہیں۔ اس رسالے کے توسط سے اگر ایسے ناموں سے آشنائی کی صورت نکلتی ہے تو یہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہے۔

دوسرا حصہ دیوناگری میں ہے جس میں زاہد ابرول کی تحریر ’ہم غالب نظیر نہیں بن سکے تو کیا‘ کے علاوہ غزلیں اور نظمیں بھی ہیں۔ ’جدید فکروفن‘ اردو اور ہندی کے بہناپے کا عکس جمیل ہے۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی قربت کا خوبصورت ثبوت ہے۔ آج لسانی تنازعے کے اس عہد میں اس طرح کے تجربوں سے دونوں زبانوں کے فاصلوں کو قربتوں میں بدلا جاسکتا ہے۔ بھگوان داس شعلہ کا ایک شعر ہے۔

اسے ہندی کے صدقے ہی سہی زندہ تو رہنے دو
یہ سائل ہے، اسے احساں کا شرمندہ تو رہنے دو

بھاشا و سنسکرتی وبھاگ حکومت ہماچل پردیش مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے ہندی، کانگڑی، پہاڑی، منڈیالی، پنجابی جیسی زبانوں کے علاقے میں اردو کو بھی زندہ رکھا ہوا ہے ع

کہ اردو ہند کی تخلیق ہے، ہندوستانی ہے

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے ’اردو دنیا‘ میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہوپاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم ’زبان اور زمینی صورتِ حال‘ کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

بزم اردو قطر کے زیر اہتمام محفل شعر وسخن

دوحہ قطر: بزم اردو قطر کے ذریعے 2 ستمبر، بروز جمعہ 2022 اسکل ڈیولپمنٹ سنٹر، سلطہ جدید، دوحہ، قطر کے خوبصورت ہال میں امجد علی سرور کی غزلوں کے مجموعہ کی تقریب رونمائی اور محفل شعر وسخن کا انعقاد کیا گیا، جس میں قطر کے مقامی شعرا نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت معروف سینئر شاعر جناب عتیق انظر نے کی جبکہ مہمان خصوصی

ادب نواز شخصیت جناب خالد داد خان صاحب اور مہمانان اعزازی کی حیثیت سے معروف شاعر ڈاکٹر ندیم جیلانی نے اسٹیج کو منور کیا۔ مشاعرے کی ابتدائی نظامت کی ذمے داری بزم کے جنرل سکریٹری مقبول شاعر جناب احمد اشفاق نے نبھائی۔ پروگرام کو شروع کرنے سے پہلے امجد علی سرور کے شعری مجموعہ 'یادوں کی روشنی' کا اجرا صدر مشاعرہ ومہمانوں کے ہاتھوں ہوا جس میں بزم کے ذمہ داروں نے اور شعرا نے بھی اسٹیج کو رونق بخشی۔ پروگرام دو حصوں پر مشتمل تھا پہلا حصہ دو مضامین پر جبکہ دوسرا حصہ شعری نشست پر مشتمل تھا۔ پہلے حصے کی نظامت کی ذمہ داری نبھا رہے جناب احمد اشفاق نے پہلا مضمون پیش کیا، جس کا عنوان تھا 'نئے شعری روایات کا شاعر امجد علی سرور'۔ جس میں انھوں نے امجد علی سرور کی شاعری پر جامع مضمون پیش کیا جو شعری مجموعہ 'یادوں کی روشنی' میں بھی شامل ہے اور دوسرا مضمون جناب اشفاق دیشمکھ نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ امجد علی سرور کو کسی طرح بھلایا نہیں جا سکتا۔ وہ قطر کے بہت سے ایسے لوگوں کو شاعر بنا گئے ہیں جو آج کی محفلوں کے لیے بہت انمول مانے جاتے ہیں۔ مزید انھوں نے یہ بھی کہا کہ امجد صاحب سب کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، اصلاح کا بڑا ہی انوکھا انداز تھا کبھی کسی کے خیال کو تبدیل نہیں کرتے، ہاں ایک الگ انداز سے مشورے ضرور دیتے تھے۔ دیشمکھ نے ممبئ ان کی رہائش گاہ پر ان سے ملاقات کا ذکر کیا جس میں امجد علی سرور نے دوحہ کے تمام ساتھیوں کے احوال پوچھے اور انھیں قطر کے شعرا کے لیے اپنی کتابیں بطور ہدیہ پیش کیں۔ اپنے خیالات کے بعد ان کی ویڈیو نشر کی گئی جس میں صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انھیں اب بولنے، لکھنے میں بہت مشکل پیش آ رہی ہے مگر دوحہ کے ساتھیوں کی محبت میں کچھ باتیں اپنے بارے میں شیئر کیں اور دوحہ والوں کی یادوں کو اپنے دل میں بسا کر رکھنے کا بھی ذکر کیا۔

دوسری نشست محفل شعر وسخن پر مشتمل تھی جس کی نظامت جناب اطہر اعظمی (بزم کے نائب صدر) نے فرمائی۔ نشست میں شامل شعرا میں اظہر، مراد ساحل، اجمل بسمی، اتفاق انمول، راقم اعظمی، اشفاق دیشمکھ، راشد عالم راشد، اطہر اعظمی، ڈاکٹر وصی بستوی، زوار حسین زائر، ڈاکٹر ندیم جیلانی، مقصود انور مقصود، اعجاز حیدر، احمد اشفاق، عزیز نبیل، عتیق انظر وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

شعری نشست کے بعد پہلے مہمان اعزازی اور پھر مہمان خصوصی جناب خالد داد خان صاحب نے اظہار خیال پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے بزم اور اس کے اراکین کو امجد علی سرور کے شعری مجموعے کی رونمائی پر مبارکباد دی۔ انہوں نے کہا کہ بزم کے شرکا کی امجد علی سرور سے محبت کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی غیر موجودگی پر بھی ان کی کتاب کا اجرا اور تقریب کا انعقاد کرنا ہے۔ یہ بھی کہا کہ امجد علی سرور شاعری کے فن اور اس کے رموز واوقاف پر گہری نظر رکھتے تھے۔ محفل کی صدارت فرما رہے عتیق انظر صاحب نے بہترین نظامت پر مبارکباد دی۔ اس کے بعد امجد علی سرور کو ان کے تیسرے مجموعے کی اشاعت پر بھی مبارکباد پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ایک شاعر ہونے کے ساتھ بہت اچھے مربی بھی تھے۔ لوگوں سے تعلقات بہت اچھا رکھتے، تنظیمی سطح پر بہت فعال تھے۔ ان کی کوششوں سے بہت سے شعرا فیض یاب ہوئے۔ مشاعرے میں بزم کے دیگر ذمہ داران کے علاوہ جن قابل ذکر شخصیات نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں: عبید طاہر، احتشام اقبال، واصف گیلانی، ممنون بنگش، فراز احمد، عرفان اللہ، سیف الرحمٰن، اریب اشفاق، عدیل احمد، شمس الدین رحیمی، آخر میں صدر بزم اعجاز حیدر صاحب نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: ابوحمزہ اعظمی، دوحہ قطر 8 ستمبر 2022

پروفیسر چندر شیکھر

تاشقند: تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی فار اورینٹل اسٹڈیز، تاشقند کی نئی عمارت میں یونیورسٹی کی وائس چانسلر گلچہر رکھی سوا کی صدارت میں ایک خصوصی پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد پروفیسر چندر شیکھر کو استاد افتخاری کی سند سے سرفراز کیا گیا۔ پروفیسر چندر شیکھر 2018 سے لال بہادر شاستری ہندوستانی ثقافتی مرکز تاشقند کے ڈائرکٹر ہیں۔ اس موقعے پر ہندوستانی سفیر منیش پربھات اور یونیورسٹی کے اساتذہ و ذمے داران موجود تھے۔ یاد رہے کہ پروفیسر چندر شیکھر نے گزشتہ چار سال میں ہندوستان اور ازبکستان کے ثقافتی رشتوں کو مضبوط کرنے کی سمت میں نمایاں کام کیا ہے۔ انھوں نے ازبکستان کی 13 یونیورسٹیوں میں انڈیا اسٹڈی روم قائم کیے۔ کئی درسی و تحقیقی کتابوں کو شائع کیا جن میں ازبکی زبان غالب کی غزلوں کا انتخاب (پروفیسر محیا عبدالرحمانوا)، ہندوستانی زبانوں کی تاریخ اور ادب، لال بہادر شاستری اسکول کی درجہ پنجم سے گیارہویں کلاس کی ہندی کتابوں کی اشاعت شامل ہے۔ تاشقند اورینٹل یونیورسٹی میں انھوں نے اردو اور فارسی زبان پر کئی لکچر دیے۔ خوشنویسی ومخطوطات کی نمائش کا اہتمام کیا۔ بابر نامہ کے نیشنل میوزیم اور خدا بخش لائبریری کے نسخوں کی تصاویر اور متن کی علیحدہ نمائش لگائی۔ ان کی کوششوں سے کئی ازبک اسکالر، اساتذہ اور طلبہ نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور تاشقند مشرق شناسی یونیورسٹی کے درمیان مفاہمت (MOU) بھی انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جس کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اسلم پرویز تاشقند تشریف لائے تھے۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے پروفیر قمر رئیس 1998 سے 2002 تک اسی عہدے پر تاشقند میں رہ چکے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 اگست 2022

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

صحت مند و خوشگوار زندگی کے لیے صفائی کا اہتمام ضروری: پروفیسر شیخ عقیل احمد

قومی اردو کونسل کی جانب سے یکم تا 15 ستمبر 'سوچھتا پکھواڑہ' کا اہتمام

نئی دھلی: صفائی نہ صرف ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہے بلکہ اس کا اثر ملک کی تعمیر و ترقی پر بھی پڑتا ہے، لہٰذا ہمیں اس کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل نے کونسل کی جانب سے یکم تا 15 ستمبر 'سوچھتا پکھواڑا' کی مناسبت سے کیا۔ انھوں نے کہا کہ دنیا کے تمام مذاہب میں صفائی ستھرائی پر زور دیا گیا ہے، خصوصاً اسلام میں اسے نصف ایمان قرار دیا گیا ہے اس لیے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی صفائی ستھرائی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ انھوں

نے کہا کہ ہمارے لیڈروں اور معمارانِ قوم میں گاندھی جی صفائی پر بہت زیادہ زور دیا کرتے تھے اور ان کا ماننا تھا کہ ہمیں نہ صرف برطانوی حکومت سے آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی گندگی، آلائش اور ایسی ہر چیز سے آزادی حاصل کرنی چاہیے جو ہماری شخصیت کو مجروح کرنے والی ہے اور جس سے ہماری زندگی پر منفی اثر پڑتا ہے۔ آج ہمارے ملک کے اسپتالوں میں مریض بھرے پڑے ہیں اور کسی بھی اسپتال میں بغیر نمبر لگائے علاج کروانا ممکن نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں مریضوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اگر ہم تحقیق کریں تو پتا چلے گا کہ زیادہ تر بیماریوں کا سبب کھانے پینے سے لے کر رہن سہن تک میں صفائی ستھرائی پر توجہ نہ دینا ہے، لہٰذا اگر ہم صرف اپنا طرز زندگی بہتر کرلیں تو درجنوں بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ملک کے وزیر اعظم عزت مآب نریندر مودی نے گاندھی جی کے صفائی کے پیغام کو ملک کے ہر شہری کے ذہن میں اتارنے اور اسے ہماری عملی زندگی کا لازمی حصہ بنانے کے لیے 'سوچھتا ابھیان' کی شروعات کی ہے۔ ہمیں اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے اور اپنے آپ کی صفائی کے ساتھ ماحول کی صفائی ستھرائی پر بھی بھرپور توجہ دینی چاہیے، کیونکہ صفائی نہ صرف ہمیں بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ اس کا اثر ملنے جلنے والوں پر بھی پڑتا ہے۔ صاف ستھرے انسان سے مل کر ذہن پر خوشگوار اثر مرتب ہوتا ہے، جبکہ بے ہنگم رہنے والے انسان سے کوئی ملنا نہیں چاہتا اور اس سے مل کر طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہ صرف اپنے گھر دروازے کی صفائی کا اہتمام کرنا چاہیے بلکہ دفتر میں اپنے کام کرنے کی جگہ اور استعمال کی چیزوں کو بھی خود صاف رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر کونسل کے تمام اسٹاف نے اس بات کا عہد لیا کہ خود بھی صفائی کا اہتمام کریں گے اور آس پاس کے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دیں گے، خود بھی گندگی نہیں پھیلائیں گے اور دوسروں کو بھی اس حرکت سے روکیں گے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 ستمبر 2022

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

غالب کا سفر کلکتہ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیراہتمام 'غالب کا سفر کلکتہ' پر دو روزہ قومی سمینار کا افتتاحی اجلاس 31 اگست کی شام منعقد ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر قاضی جمال حسین نے کلیدی مقرر کے طور پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سفر کلکتہ غالب کی زندگی کا اہم ترین واقعہ

ہے۔ غالب کے مزاج اور ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو سفر کی روداد میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ غالب کو پنشن کی بحالی میں تو کامیابی نہیں ملی، لیکن بنارس میں لکھی جانے والی مثنوی 'چراغ دیر' اس سفر کا حاصل ہے۔ سمینار کی صدارت اردو، انگریزی کی معروف ادیبہ ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ سفر نامہ ادب کی ایسی صنف ہے جس سے ادب کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ اور تہذیب کا بھی علم ہوتا ہے۔ غالب نے سفر نامہ تو نہیں لکھا لیکن اپنے خطوط میں اس سفر کی جو روداد لکھی ہے اس سے سفر کی خاصی تفصیلات سامنے آجاتی ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ غالبیات کے موضوع پر سمینار کراتا ہی رہتا ہے لیکن اس مرتبہ ایسے موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے جو بظاہر پرانا معلوم ہوتا ہے لیکن جنھوں نے اس موضوع کو مستقل مزاجی سے پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس موضوع میں ابھی بہت سارے امکانات ہیں جن پر گفتگو ضروری ہے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ سفر کلکتہ کے سلسلے میں یوں تو تحقیقی نوعیت کے بہت سے معیاری کام ہوئے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سفر کے بعد غالب کی غزلوں اور دیگر تخلیقات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ اس کی نشاندہی بھی کی جانی چاہیے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ 'غالب کا سفر کلکتہ' موضوع پر تقریباً ہر غالب شناس نے قلم اٹھایا ہے اور اپنے انداز میں نئے موتی تلاش کیے ہیں، لہٰذا نیا ذہن اس موضوع کو کس انداز سے دیکھتا ہے اور اس میں کیا اضافہ ممکن ہے یہ جاننا بہت ضروری ہے۔

سمینار کے دوسرے روز ملک کے مختلف گوشوں سے آئے اہل قلم نے 'غالب کے سفر کلکتہ' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ غالب کا سفر کلکتہ بظاہر بہت سادہ موضوع ہے، لیکن اس کے ضمن میں بہت سارے علمی اور ادبی مسائل زیر بحث آجاتے ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر ابن کنول نے 'انشائیہ، سفر کلکتہ سے متعلق غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط'، شمیم طارق نے 'عہد غالب کے کلکتے کی اہم ادبی اور سیاسی شخصیات'، ابوذر ہاشمی نے 'غالب کی تخلیقی حسیت پر قیام کلکتہ کے اثرات'، ڈاکٹر ارشاد نیازی نے 'فاروقی کے فکشن میں غالب کی قلمی تصویر' پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد مستمر نے انجام دیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر آصف نعیم نے کہا کہ غالب کا سفر کلکتہ اسی لیے اہم ہے کہ اس ضمن میں اہم علمی شخصیات اور ان کے علمی مرتبے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے 'قتیل کی دو تصانیف کا تحقیقی جائزہ' پروفیسر احسن الظفر نے غالب اور سفر کلکتہ کے تعلق سے، ڈاکٹر علی عباس نے 'غالب کے سفر کلکتہ کی تفصیلات خطوط غالب کے حوالے سے'، فیضان الحق نے 'غالب سے متعلق ڈراموں میں سفر کلکتہ' پیش کیا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمد اجمل نے کی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے ایک ایسے موضوع کو پھر سے مرکزیت دے دی جس پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، لیکن اسی عہد کے لوگ اس مسئلے اور اس کی جزئیات پر کسی طرح سوچتے ہیں، یہ اس سمینار کا حاصل ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر آصف نعیم نے 'غالب کا سفر کلکتہ اور گل رعنا مطبوعہ نول کشور'، ڈاکٹر شمس بدایونی نے 'غالب کا سفر کلکتہ' پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سفینہ نے کی۔ چوتھے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر نجمہ رحمانی نے کہا کہ غالب کے سفر کلکتہ نے غالب کی تخلیقی حسیت پر کوئی اثر ڈالا یا نہیں ڈالا لیکن یہ کیا کم ہے کہ اس سفر کا اردو تحقیق پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ اس اجلاس میں جکیلاش چندر واششٹھ نے 'عہد غالب کا کلکتہ' ڈاکٹر تاریکا پربھاکر نے 'دیوانِ غالب کی اشاعت پر سفر کلکتہ کے اثرات'، ڈاکٹر عبدالسمیع نے 'غالب کا قیام بنارس' اور تفسیر حسین نے 'پنشن کے مسئلے میں غالب کی ناکامی کے اسباب' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر نورین علی حق نے انجام دی۔ اس سمینار کے پانچویں اور آخری اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ غالب کے سفر کلکتہ کے تعلق سے پہلے بھی لٹریچر شائع کر چکا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ نئے لکھنے والوں نے موجودہ تصانیف کا مطالعہ بھی کیا اور اپنی کوششوں سے نئے گوشے پیدا کرنے کی کوشش کی بھی ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر ابوبکر عباد نے 'غالب کی تحریر و تخلیق میں فکشن کے نقوش'، سبط حسین نے 'غالب کی شخصیت، پنشن کا قضیہ اور سفر کلکتہ' اور تجمل حسین نے 'غالب کا سفر کلکتہ تندی باد مخالف کی زد پر'

کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ متین امروہوی نے شاندار منظوم کلام پیش کیا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سلمان فیصل نے کی۔ اس سمینار میں علم و ادب کی مقتدر شخصیات کے علاوہ طلبہ اور ریسرچ اسکالر نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27,28 اگست 2022

دھلی

جنگ آزادی میں اردو صحافت کا کردار

نئی دھلی: ''تحریک آزادی میں اردو صحافت نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ 'دہلی اردو اخبار' اور 'پیامِ آزادی' کے مدیروں، مولوی محمد باقر اور مرزا بیدار بخت کو دی گئی سزائے موت اس کا ثبوت ہے۔ مولانا آزاد کے اخبار 'الہلال' اور 'البلاغ' نے انگریزی استعمار کے خلاف ملکی عوام کو بیدار کرنے میں بے پایاں خدمات انجام دی ہیں۔ 'الہلال' کی انقلابی صحافت سے انگریز اتنے خائف تھے کہ انھوں نے سترہ بار اس اخبار کی ضمانتیں ضبط کیں۔'' ان خیالات کا اظہار ممتاز صحافی، محقق اور ادیب معصوم مراد آبادی نے آج یہاں جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول میں 'ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو صحافت کا کردار' کے عنوان پر ایک مذاکرہ میں مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کے دوران کیا۔ یہ مذاکرہ آزادی کی 75 ویں سالگرہ کے موقعے پر اردو صحافیوں کی ولولہ انگیز قربانیوں کو یاد کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ یہ طلبا کا ایک تقریری مسابقہ تھا جس میں جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول کے علاوہ جامعہ کے دیگر اسکولو ں کے طلبا نے شرکت کی۔ بزم کے معزز مہمانان سابق نائب شیخ الجامعہ پروفیسر الیاس حسین، پروفیسر اقتدار محمد خان اور پروفیسر شہپر رسول کا خیر مقدم کرتے ہوئے جامعہ اسکول کے پرنسپل پروفیسر عتیق الرحمٰن نے اردو صحافت کی غیر معمولی خدمات کے حوالے سے منعقدہ اس پروگرام کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیا۔ پروگرام کی غرض و غایت پیش کرتے ہوئے پروفیسر شہپر رسول نے تحریک آزادی میں اردو صحافت کے عظیم کردار سے نسل نو کو متعارف کرانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقعے پر اردو زبان کے تلفظ کے حوالے سے پیش آنے والی عمومی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے پروفیسر اقتدار محمد خان نے اردو کے اساتذہ سے اپیل کی کہ وہ بچوں کے تلفظ کی اصلاح کے لیے خصوصی اقدامات کریں۔ اس تقریری مقابلہ میں بالترتیب جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول کو پہلا، دوسرا اور جامعہ گرلس سینئر سیکنڈری اسکول کو تیسرا انعام حاصل ہوا۔ حوصلہ افزائی انعامات جامعہ مڈل اسکول اور سید عابد حسین سینئر سیکنڈری اسکول کے حصے میں آئے۔ اس موقعے پر اسکول کے وائس پرنسپل ڈاکٹر قطب الدین، محمد مصطفیٰ، ڈاکٹر عارف علی، ڈاکٹر روبینہ اور ڈاکٹر آفتاب احمد منیری وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 اگست 2022

اترپردیش

تحقیق کیسے کریں

رامپور: گورنمنٹ رضا لائبریری رامپور میں آزادی کا امرت مہوتسو کے تحت مشہور محقق و ادیب مولانا امتیاز علی عرشی میموریل لیکچر بعنوان 'تحقیق کیسے کریں' کا اہتمام رضا لائبریری کے کانفرنس ہال خیابان رضا (رنگ محل) میں کیا گیا۔ کمشنر مرادآباد ڈویژن آنجنے کمار سنگھ کی زیر صدارت منعقدہ تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر اوشا موجونشی، ممبر رضا لائبریری بورڈ نے شرکت کی جبکہ مہمان اعزازی کے طور پر مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے صاحبزادے اور سابق ریجنل ڈائرکٹر اعلیٰ تعلیمات ڈاکٹر ممتاز عرشی جلوہ افروز رہے۔ اس موقعے پر کلیدی خطاب کرتے ہوئے مشہور و معروف فکشن نگار، شاعر، خاکہ نگار، نقاد، ماہر درسیاست پروفیسر غضنفر علی سابق ڈائرکٹر، اکادمی برائے فروغِ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے لیکچر میں تحقیق کے تمام تر مبادیات اور بنیادی نکات کا احاطہ کیا اور ایک ایک نکتے پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ تحقیق کرتے وقت تین بنیادی سوال ذہن میں ضرور ہونا چاہیے۔ تحقیق کیا، کیوں اور کیسے؟ کیونکہ ان تینوں سوالات کے جوابات خود لفظ تحقیق میں موجود ہیں۔ تلاش، حقائق، حواشی، فوائد، یقین دہانی اور قدر و قیمت تحقیق کے ہر حرف میں چھپا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 اگست 2022

اردو صحافت میں سیتاپور کی خدمات

سھارنپور: صحافت کا انسانی زندگی سے چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ ہماری زندگی میں ایک ضرورت کی شکل میں داخل ہوچکی ہے۔ اس لیے کامیاب صحافی وہی مانا جاتا ہے جو عوامی مسائل کو احسن انداز میں بیان کرے اور اس میں کمزور رویہ اختیار نہ کرے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار بطور مہمان خصوصی سراج اجملی شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بزم اردو سیتاپور کے زیر اہتمام اپیل ہوٹل میں بیادگار مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی صحافت کے 200 سال مکمل ہونے پر بعنوان 'ہندوستان کی اردو صحافت میں سیتاپور کی خدمات کا اعتراف' سمینار میں کیا۔ جیلانی خان علیگ ریزیڈنٹ اڈیٹر انقلاب لکھنؤ نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو صحافت ہی تھی جس نے انگریزوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور ملک کو آزادی دلانے میں اہم کردار ادا کیا جس کی تاریخ جلی حروف میں درج ہے۔ اردو صحافت نے قوم کے جیالوں کو یہ ہمت اور حوصلہ دیا کہ آپ ہی فرنگیوں کو سرزمین ہند سے اکھاڑ پھینکیں گے اور انھوں نے یہ کر دکھایا۔ سابق ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ پرتل جوشی نے کہا کہ جنگ آزادی میں اردو صحافت کی قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔ اس زبان نے نہ صرف صحافت کی بلکہ صحافتی انداز میں آزادی کی تحریک کو فروغ دیا بلکہ بہت سے اردو صحافیوں کو اس کی قیمت جان دے کر ادا کرنی پڑی۔ پروفیسر علی خان محمودآبادی نے کہا کہ اردو میں ادبی تہذیب جھلکتی ہے اسی لیے اس زبان کو عوام الناس میں مقبولیت حاصل ہے۔ اردو کو اسی وقت فروغ مل سکتا ہے جب ہم اس کو اپنی زندگی میں داخل کریں۔ بزم اردو کے صدر مست حفیظ رحمانی نے سیتاپور کی صحافت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کا سب سے پہلا اردو اخبار سیتاپور سے ہی شائع ہوا تھا، البتہ اس کی سند ریکارڈ میں نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے قیام میں سیتاپور کا رول رہا ہے جس میں مولوی شیخ اکرام علی، علامہ تراب علی خیرآبادی اور خلیل الدین اشک خیرآبادی کے نام نمایاں ہیں۔ پروگرام کی صدارت سینئر صحافی کے.جی ترویدی نے کی اور نظامت کے فرائض خوشتر رحمان خان نے انجام دیے۔ پروگرام میں اردو، ہندی صحافت اور معاشرے میں سماجی، تعلیمی اور ادبی میدان میں نمایاں کام کرنے والے صحافیوں کو شال اوڑھا کر اعزاز سے نوازا گیا جن میں مفتی محمد خبیر ندوی علیگ، شارق لہرپوری، پروفیسر علی خان شکاگو یونیورسٹی کے اسمائے گرامی خصوصی طور سے قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 اگست 2022

آزادی اور ادب

میرٹھ: اردو، ہندی، انگریزی کا وہ ادب جو ہندوستان میں لکھا گیا اس میں جذبۂ آزادی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ پریم چند، کملیشور، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے ناولوں اور افسانوں میں جذبۂ آزادی کو بہت ہی دلکش اور خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح نظیر، ساحر، کیفی اعظمی، فیض، چکبست، اقبال اور حفیظ میرٹھی وغیرہ

جیسے بے شمار شعرا نے اپنے کلام میں جذبۂ حب الوطنی کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ الفاظ تھے صدر شعبۂ اردو، پروفیسر اسلم جمشید پوری کے جو آزادی کے امرت مہوتسو کے موقعے پر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سمینار ہال میں منعقد 'آزادی اور ادب' کے موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ مہمانِ خصوصی کے بطور ڈین فیکلٹی آف آرٹس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ پروفیسر نوین چند لوہنی اور مہمان ذی وقار کے بطور پروفیسر وکاس شرما، صدر شعبۂ انگریزی، معروف سماجی کارکن آفاق خان، معروف ہدایت کار و ڈراما نگار بھرت بھوشن شرما نے شرکت کی اور مقالہ نگار کے بطور ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم '1857 اور شہر آشوب: ڈاکٹر ارشاد سیانوی' 'جنگ آزادی اور مسلمان ادب کے آئینے میں' اور ڈاکٹر الکا وششٹھ 'جنگ آزادی میں شعرا کا کردار' عنوانات سے اپنے پرمغز مقالات پیش کیے۔ استقبالیہ کلمات سیدہ مریم الٰہی اور نظامت کے فرائض روضا خان نے انجام دیے۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اور اراکین شعبہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے پروفیسر نوین چند لوہنی نے کہا کہ آج کے سمینار اور شعری نشست کا موضوع 'آزادی اور ادب' انتہائی اہم موضوع ہے۔ کیونکہ تحریک آزادی میں ادب نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ اگر ادیب اس تحریک میں شامل نہ ہوتے تو یقیناً ملک کو آزاد ہونے میں مزید وقت لگتا۔ دراصل غلامی کے جوئے کو اتار پھینکنے کے لیے غلامی کے جس احساس اور اتحاد کی ضرورت تھی وہ عوام میں ادیبوں نے ہی پیدا کیا تھا۔ شعبۂ انگریزی کے صدر پروفیسر وکاس شرما نے کہا کہ ادب اور زبانیں کسی فرقے، جماعت، گروہ، مذہب یا علاقے کی جاگیر نہیں ہوتی ہیں بلکہ ان پر سب کا یکساں حق ہوتا ہے۔ اس لیے ادیبوں کو تمام طبقاتی، نظریاتی اور جذباتی جذبوں سے بے نیاز ہوکر حق کا پیغام دینا چاہیے۔ اس موقعے پر اسرار الحق اسرار، کرشن کمار بے دل، وارث وارثی، سواتی شرما، فرح ناز، وسیم احمد، سعید احمد سہارنپوری، فیضان خضر، عمائدین شہر اور طلبہ و طالبات موجود رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 اگست 2022

بہار

اردو زبان کے فروغ میں غیر مسلم ادبا کی خدمات

پٹنہ: ادب کا کام محض محفلیں منعقد کرنا یا تفریح مہیا کرنا نہیں ہے۔ ادب کا اصل کام سماج کو جوڑنا اور معاشرتی و خاندانی رشتوں کو مضبوط کرنا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم سیاسی چالوں کا جواب دے سکتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ترون کمار سنگھ صدر شعبہ ہندی اور ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز پٹنہ یونیورسٹی نے ایک سمینار کے صدارتی خطبے میں کیا جو شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں منعقد کیا گیا تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندی اردو کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ہمیں ان دونوں کی تاریخ پر نظر رکھنی ہوگی۔ اگر ان دونوں کی تاریخ اور بنیاد ایک ہے تو دونوں میں زیادہ تفریق ممکن ہی نہیں ہے۔ ہمارے ادیب معاشرے کے لیے روشنی کا ذخیرہ ہیں وہ دونوں زبانوں سے سماج کو روشن کرتے ہیں۔ آج کا موضوع اس لیے بھی اہم ہے کہ اس سے ہندو مسلم اتحاد کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ شعبہ اردو کی جانب سے اس سمینار کا انعقاد دوسروں کے لیے مشعل راہ ہے جس کے لیے میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں۔ اس سے قبل صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے موضوع کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ آزادی کا امرت مہوتسو مناتے ہوئے ہمیں یہ کوشش کرنی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے ان کارناموں کو یاد کریں جنھوں نے اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیا اور بغیر کسی مذہبی تفریق کے ساجھا وراثت کے تحفظ و فروغ کے لیے اپنے قلم کا استعمال کیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر شہزاد انجم نے فرمایا کہ ہم لوگ طلبہ کو نصاب میں ادب بلاتفریق مسلک و مذہب پڑھاتے ہیں، کبھی یہ ذہن میں آتا ہی نہیں کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔ یہی جذبہ تعلیم کے بعد بھی ہمیشہ قائم رہنا چاہیے۔ انھوں نے اردو زبان کے ارتقا میں غیر مسلم شعرا کی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے متعدد شعرا کے منتخب اشعار سنائے اور ان کی ادبی و تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مہمان اعزازی پروفیسر صفدر امام قادری نے کہا کہ اردو کی تاریخ ہندو مسلم ثقافت کی امین رہی ہے۔ کولونیل بھارت میں اردو فارسی ہندوستان کی لنگوا فرینکا تھی۔ مہمان ذی وقار پروفیسر سید شاہ حسین احمد نے فرمایا کہ مذہب کی بنیاد پر تفریق کر کے ادبی و لسانی گفتگو کا سلسلہ بند ہونا چاہیے۔ جیسے اردو ادب سب کا ہے ویسے ہی اردو زبان سب کی زبان ہے۔ سب مل کر ہی اس زبان اور اس سے وابستہ تہذیب کی بقا و تحفظ کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر اقبال حسن آزاد مدیر 'ثالث مونگیر' نے کہا کہ اردو اور ہندی میں جو دوری پیدا ہوئی ہے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ وہ مزید نہ بڑھے بلکہ بتدریج ختم ہو جائے۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کے شکریے کے بعد پروگرام کا اختتام ہوا جس میں پروفیسر اسرائیل رضا، پروفیسر جاوید حیات، ڈاکٹر نوشاد عاطر، ڈاکٹر سرور عالم ندوی، ڈاکٹر مسعود احمد کاظمی، ڈاکٹر صادق حسین، ڈاکٹر سہیل انور، ڈاکٹر جلال الدین، ڈاکٹر خورشید احمد، ڈاکٹر مسرت جہاں، شاہد اختر، ڈاکٹر افشاں بانو، ڈاکٹر نزہت پروین، ڈاکٹر منہاج الدین، نعمت شمع، محمد اسلم اور شعبے کے تمام ریسرچ اسکالرز، طلبہ و طالبات کے علاوہ عظیم آباد کی متعدد علمی و ادبی شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 22 اگست 2022

احمد یوسف کے افسانے پر مذاکرہ

پٹنہ: اردو کونسل ہند کے زیر اہتمام مشتاق احمد نوری کی رہائش گاہ پر ادبی گفتگو سلسلہ 7 کا انعقاد ہوا جس کے تحت ڈاکٹر آصف سلیم کی نئی تصنیف 'احمد یوسف افسانے: فکر سے فن تک' پر ایک ادبی مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس مذاکرے میں اردو زبان و ادب کی سرکردہ شخصیتوں نے شرکت کی اور اتفاق رائے سے آصف سلیم کی اس تصنیف کو بڑی عالی قدر اور مثالی بتایا اور کہا کہ احمد یوسف پر ان کی یہ کتاب بہترین حوالے کی حیثیت کی حامل ہے۔ احمد یوسف پر جسے مطالعہ کرنا ہوگا اس کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔ پروگرام کے سرپرست اور نامور افسانہ نگار مشتاق احمد نوری نے کہا کہ آصف سلیم کی یہ تصنیف احمد یوسف کے حوالے سے بہت ہی کامیاب اور معیاری ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ احمد یوسف شخصی اور ادبی اعتبار سے بہت بلند مرتبہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ ادبی گفتگو کا یہ سلسلہ مفید اور خوبصورت ہے اسے جاری رہنا چاہیے۔ اس کے لیے میرے گھر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ صاحب کتاب ڈاکٹر آصف سلیم نے کہا کہ اتنی مقتدر اور اعلیٰ محفل میں میری کتاب پر گفتگو ہو رہی ہے کہ میں اپنی اور اس کتاب دونوں کی تقدیر پر رشک کرتا ہوں اور اردو کونسل کے ناظم اعلیٰ اسلم جاوداں اور آپ تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پروفیسر عبدالصمد نے کہا کہ احمد یوسف پر جب گفتگو ہوگی تو اس کتاب کے بغیر ممکن نہیں۔ پروفیسر منظر اعجاز نے کہا کہ آصف سلیم کا تجزیہ بہت اچھا ہے۔ ان کی یہ کتاب بے حد اہم ہے جسے ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ احمد یوسف میں ایک بڑے انسان اور ایک بڑے فنکار کی خوبیاں موجود تھیں۔ سرکردہ افسانہ نگار ڈاکٹر علی نے کہا کہ آصف سلیم نے احمد یوسف کے 67 افسانوں کا بہترین تجزیہ کیا ہے اور احمد یوسف کی شخصیت کو خوبی

کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مونگیر کے رسالہ 'ثالث' کے مدیر اقبال حسن آزاد نے کہا کہ احمد یوسف ایک بڑے مقالہ نگار تھے۔ آصف سلیم نے اس کتاب میں تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ مستند ادیب اظہار خضر نے کہا کہ آصف سلیم اچھا لکھنے والوں میں سے ہیں۔ احمد یوسف پر ان کی باتیں تحقیقی و تجزیاتی ہیں۔ معتبر ناقد ڈاکٹر سرور حسین نے تفصیل سے اس کتاب پر عالمانہ گفتگو کی اور کہا کہ بڑی عرق ریزی سے لکھی گئی یہ کتاب احمد یوسف پر ایک حوالہ جاتی کتاب ہے۔ اس سے خود آصف سلیم کی ایک شناخت بنی ہے۔ ڈاکٹر فرد الحسن فرد نے اس کتاب کو احمد یوسف کی زندگی اور ان کے افسانوں کی شرح سے متعلق ایک نہایت کامیاب کتاب سے تعبیر کیا۔ نئی نسل کی نمائندگی کر رہے ڈاکٹر سراج اللہ تیمی نے کہا کہ یہ ایک ایسی بیش قیمت کتاب ہے جس کے مطالعے سے احمد یوسف کی افسانہ نگاری اور افسانہ نگاری کے فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ 'ادبی گفتگو' کا آغاز کونسل کے ناظم اعلیٰ اسلم جاوداں کے ابتدائی کلمات سے ہوا جس میں انھوں نے ادبی گفتگو کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کا مقصد ادبی محفل آرائی، کتابوں کے مطالعے کی ترویج اور کتابوں و مصنفوں کی قدردانی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج اسی مقصد کے تحت ڈاکٹر آصف سلیم کی عالی قدر کتاب پر گفتگو ہو رہی ہے۔ اس محفل میں پروفیسر شائستہ انجم نوری، نشاط پروین اور ڈاکٹر عشرت صبوحی بھی شامل تھیں۔ کونسل کے ناظم ڈاکٹر انوار الہدیٰ کے شکریے کے ساتھ یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 30 اگست 2022

اردو ڈائریکٹوریٹ کے زیر اہتمام اردو آموزی تقسیم اسناد تقریب

پٹنہ: اردو بڑی میٹھی، پیاری اور دل میں جگہ بنانے والی زبان ہے۔ یہ محبت، بھائی چارے کی زبان ہے، گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار ہے۔ یہ باتیں اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے زیر انتظام چل رہے 'اردو لرننگ سینٹر' کے ذریعے اردو سیکھ چکے 80 غیر اردو داں افراد کو سرٹیفکیٹ دینے کے لیے بیلی روڈ واقع بہار آرکائیو کے احاطہ میں قائم کانفرنس ہال میں منعقد تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سبکدوش اسپیشل سکریٹری محکمہ کابینہ سکریٹریٹ ڈاکٹر اوپیندر ناتھ پانڈے نے کہیں۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو زبان کی مختصر مگر جامع تاریخ بیان کی اور کہا کہ اردو اسی ملک ہندوستان کی زبان ہے، یہیں پلی بڑھی اور پروان چڑھی۔ انھوں نے کہا کہ ہندی اور اردو زبان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہندی زبان میں اردو کے الفاظ اور اردو زبان میں ہندی کے الفاظ بڑی خوبصورتی سے استعمال کیے جاتے ہیں، جس کے سبب یہ دونوں زبانیں اور بھی خوبصورت ہو جاتی ہیں۔ پروگرام کے آغاز میں ڈائرکٹر اردو احمد محمود نے اردو لرننگ پروگرام کی غرض و غایت اور فوائد بیان کیے۔ انھوں نے آف لائن لرننگ پروگرام سے آن لائن لرننگ پروگرام کے سفر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ پہلے یہ بیس پچیس افراد پر مشتمل اردو ڈائرکٹوریٹ کے ایک کمرے میں ہوتا تھا اور یہ پروگرام بخوبی 2008 سے جاری تھا، لیکن اس میں سیکھنے والوں کی تعداد محدود ہوتی تھی۔ جب کووڈ 19 کے حالات پیدا ہوئے اور ملک کو لاک ڈاؤن دور سے گزرنا پڑا، اس بیچ ہم لوگوں نے پرنسپل سکریٹری کے مشورے سے آن لائن لرننگ پروگرام کا آغاز کیا۔ حالانکہ یہ خوف ستا رہا تھا کہ اردو لرننگ پروگرام کا یہ سسٹم کارگر ہوگا یا نہیں؟ لیکن بعد میں یہ احساس ہونے لگا کہ آف لائن پروگرام سے کہیں زیادہ بہتر آن لائن اردو لرننگ پروگرام ثابت ہو رہا ہے۔ اب صرف پٹنہ کے افسران و ملازمین ہی نہیں بلکہ بہار اور ہندوستان کے مختلف گوشے سے اردو لرننگ کورس میں لوگ داخلہ لے کر استفادہ کر رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2022

ادب جینے کا سلیقہ

پٹنہ: خدابخش لائبریری میں 24 اگست 'ادب جینے کا سلیقہ' کے موضوع پر لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شائستہ بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے کہا کہ روزمرہ کی زندگی میں ادب ایک ضروری حصہ ہے کیونکہ یہ افراد کو معاشرے میں بڑی سچائیوں اور نظریات سے جوڑتا ہے۔ اس میں خوشی فراہم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ تجربہ کی تعمیر میں مدد کرتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ ہمدردی کی تعلیم دیتا ہے اور غور و فکر کے نئے راستوں سے روشناس کراتا ہے۔ تنقیدی سوچ کو فروغ دیتا ہے۔ شاعری ہو، فکشن ہو یا نثر پارے ہمیں زندگی جینے کا سلیقہ بتاتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی زبان کا ادب ہو، اس سے آگاہی اور اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، تاکہ زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر یہ ہمارا ساتھ دے سکے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنے خطاب میں کہا کہ جب مجھے اس موضوع پر خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تو میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ ادب میں وہ کون سی بات ہے جو جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ سنتے اور پڑھتے آئے تھے کہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی۔ یہاں تو ادب کو ایک نئے زاویے سے پرکھنے کی بات ہے۔ یاد رکھیں ادب چاہے جس زبان کا ہو، آدمی کو انسان بنانے کے لیے ہے۔ یہ زندگی میں بہتری پیدا کرنے کی چیز ہے۔ یہ مسائل حل کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اخلاقیات کا درس دیتا ہے، غلط فہمیوں کو دور کرتا ہے۔ ادب فرد اور جماعت دونوں کے لیے مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ ادب کے تمام اصناف ہماری زندگی پر کسی نہ کسی طور پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ شعر و نثر زندگی پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ فکشن تو عصر حاضر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوا معاشرہ کو شفا دے سکتی ہے، تو وہ ادب ہے۔ اچھا ادبی نمونہ ہمارے اندر مفید تبدیلی لاتا ہے۔ ادب جینے کا سلیقہ بن جائے تو معاشرہ اچھا بن جائے۔ شعر و ادب معاشرے کی بگڑی صورت کو بدلنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ادب شعور زندگی کے اظہار کی ایک صورت ہے۔ زندگی کے انفرادی شعور سے تو کوئی ادب بھی خالی نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ زندگی کی تنقید ادب کا اہم اور مقدس فریضہ ہے۔ زندگی کے خیر و برکت کے عناصر کو چمکانے کی ذمہ داری ادب پر ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالباسط، ڈاکٹر آصف سلیم اور جناب فرد الحسن فرد اور دیگر حضرات نے سوالات کیے جن کے تشفی بخش جواب دیے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2022

تلنگانہ

اردو ادب میں تقسیم ہند کی عکاسی

حیدرآباد: بات ملک کی تقسیم کی نہیں تھی بلکہ ایک خاندان کی تقسیم کی تھی جو کہ ایک ناقابل تصور المیہ ہے۔ ایک ہی خاندان میں آدھے کہہ رہے تھے ملک چھوڑ کر جانا چاہیے تو آدھے لوگوں کا ماننا تھا کہ آبا و اجداد کی زمین چھوڑ کر کیسے جائیں، بڑی کشمکش کا دور تھا اور جب اکثر لوگ گئے تو اچھی خبریں نہیں آئیں۔ ملک کی تقسیم یقینی طور پر ہولناک تھی۔ اس کے بیان کرنے والے یا تو گزر گئے جو ہیں اب وہ بہتر طور پر نہیں بتا سکتے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ایک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو ادب میں تقسیم کی عکاسی' کے افتتاحی اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ شعبہ سماجیات، مانو اور اندرا گاندھی نیشنل سنٹر فار آرٹس (جنپد ڈویژن– وزارت ثقافت، حکومت ہند) کے اشتراک سے 'تقسیم کی ہولناکیوں کا یادگار دن' اور ہندوستان

کی آزادی کے 75 سال کی تکمیل پر جاری آزادی کا امرت مہوتسو کے تحت اس سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر عین الحسن نے کہا کہ اردو ادب میں تقسیم ہند کی بیشتر عکاسی مختصر کہانیوں اور ناولوں میں کی گئی ہے۔ ملک کی تقسیم کے حالات شعر و نظم میں بھی بیان کیے گئے۔ تقسیم کا درد، اردو ادب کا اٹوٹ حصہ بن گیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ الگ الگ علاقوں میں الگ الگ طرح کی ثقافت وتہذیب ہے۔ قبل ازیں پروفیسر پی ایچ محمد، صدر شعبہ وکنوینر نے سمینار کا مختصر تعارف پیش کیا اور ڈاکٹر محمد احتشام اختر، شریک کنوینر سمینار نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ پروفیسر محمد نسیم الدین فریس، سابق ڈین، اسکول آف السنہ، لسانیات و ہندوستانیات نے کرشن چندر کے حوالے سے تقسیم ہند پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر شگفتہ شاہین، صدر، شعبۂ انگریزی نے 'قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں تقسیم کی عکاسی' پر مقالہ پیش کیا۔ سمینار کے دوسرے سیشن میں ڈاکٹر محمد احتشام اختر نے 'تقسیم پر مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے: اردو تحریروں کے حوالے سے' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر کے ایم ضیاء الدین، اسسٹنٹ پروفیسر سماجیات نے 'سماجی اور ثقافتی علیحدگی کے طور پر تقسیم کے تجربات' کے موضوع پر گفتگو کی۔ پروفیسر صدیقی محمد محمود، ڈین اسکول برائے تعلیم وتربیت اور ڈاکٹر دانش معین، صدر شعبۂ تاریخ نے سیشن کی صدارت کی۔ اسسٹنٹ پروفیسرز ڈاکٹر سعید میو نے سمینار کی رپورٹ پیش کی اور ڈاکٹر کے ایم ضیاء الدین نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 اگست 2022

کرناٹک

مخدوم محی الدین کی شخصیت اورفن

گلبرگہ: 28 اگست 2022 شہر کی فعال ادبی تنظیم مجلس شعور ادب گلبرگہ کا ایک خصوصی ادبی اجلاس بیاد مخدوم محی الدین حسینی ہوم زم زم کالونی گلبرگہ میں منعقد ہوا، اجلاس کی صدارت سینئر شاعر سید امجد عمر برق حیدرآبادی نے کی۔ مہمانان خصوصی کے طور پر معروف سیاسی و ملی قائد ایڈوکیٹ عبدالجبار گولہ اور پروفیسر عبدالباری (صدر شعبہ اُردو یونا ڈگری کالج) نے شرکت کی۔ ممتاز طنز و مزاح نگار و ادیب منظور وقار اور سینئر ادبی شخصیت قائم رضا (روشن زیدی) نے مخدوم محی الدین کی شخصیت اورفن پر مقالے سنائے۔ صدر اجلاس، مہمانان خصوصی اور مقالہ نگاروں نے مخدوم محی الدین کی سماجی، ادبی اور شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ مخدوم محی الدین انسانیت نواز انقلابی شاعر تھے، بہ حیثیت ٹریڈ یونین لیڈر اور شاعر ان کی شہرت اور مقبولیت قابل رشک تھی، مخدوم محی الدین کی شاعری میں جہاں جوش وولولہ تھا وہیں عشق و رومان کی کسک بھی تھی۔ مخدوم محی الدین غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کا ساتھ دیتے رہے، انسانی ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ اس لیے انھیں غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کا مسیحا کہا جاتا ہے۔ دوران اجلاس سینئر شاعر سید سجاد علی شاد نے مخدوم محی الدین کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا، بعد ازاں سید امجد برق حیدرآبادی، سید سجاد علی شاد، ڈاکٹر چندا حسینی اکبر، سخی سرمست اور یوسف شیخ نے تازہ کلام سنایا۔ ڈاکٹر چندا حسینی اکبر (معتمد مجلس شعور ادب) نے اجلاس کی کارروائی چلائی، اجلاس میں علیم احمد، محمد صادق علی، چاندا کبر، نذیر احمد تماپوری، مظہر احمد گرمنکال، راشید ریاض، میر آصف علی انجینئر، مبارک تماپوری، وسیم عارف، عبدالغفار (محکمہ صحت)، نظام الدین (کے سی ٹی کالج) اور دیگر سامعین موجود تھے۔

رپورٹ: ڈاکٹر چنداحسینی اکبر، معتمد مجلس شعور ادب گلبرگہ، 29 اگست 2022

اردو ادب میں حب الوطنی کے جذبات

بیدر: شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج میں 'اردو ادب میں حب الوطنی کے جذبات' کے موضوع پر سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس سمینار کے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید ماجد میاں

لیکچرر شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین بیدر نے طلبہ کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ کسی بھی شخص کو اس کے ملک کا بہترین شہری بننے کے لیے اس کے اندر حب الوطنی کا جذبہ ہونا بہت ضروری ہے۔ جلسے کے دوسرے مہمان ڈاکٹر اسمٰعیل خان لیکچرر شعبۂ اردو ویمنس یونیورسٹی بیجاپور نے اپنے خطاب میں کہا کہ جذبہ حب الوطنی اردو زبان وادب کے خمیر کا حصہ ہے اور ہمارے شعرا وادبا نے حب الوطنی کے جذبے کو اپنی تخلیقات کے ذریعے سے ابھارنے کی بہترین کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ہم آزادی کی سانس لے رہے ہیں۔ اعزازی مہمان ڈاکٹر تم کنٹے پرنسپل گورنمنٹ ریسیڈنٹ ڈگری کالج بیدر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب ہندوستان کی تاریخ، تہذیب وتمدن کا مرقع ہے جب کہ سمینار کنوینر شعبۂ اردو کی لیکچرر ڈاکٹر تحسین النسا نے مقالہ نگاروں کو مبارکباد دی۔ اس جلسے کے صدر ڈاکٹر دھن راج برادر پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج نوباد بیدر نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اس سمینار کے انعقاد پر شعبۂ اردو کو مبارکباد دی اور کہا کہ اردو زبان کے شعرا وادبا جذبہ حب الوطنی کو ابھارنے میں کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں ہیں۔ انھوں نے جذبہ حب الوطنی کو موضوع بنا کر بے شمار ادبی تخلیقات یادگار چھوڑی ہیں۔ شعبۂ اردو کے طلبہ نے مختلف موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ سیما بیگم، بی اے سال اول نے اردو ادب میں حب الوطنی کے جذبات' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ مسکان بیگم بی ایس سی سال دوم نے 'اقبال کی شاعری میں حب الوطنی کے جذبات' پر مقالہ پڑھا جب کہ افرا بیگم بی اے سال اول نے 'پریم چند کے افسانوں میں حب الوطنی کے جذبات' پر اپنا مقالہ پیش کیا اور بشریٰ بیگم نے 'چکبست کی شاعری میں حب الوطنی کے جذبات' پر مقالہ پیش کیا۔

پریس ریلیز: اسماعیل خان، کرناٹک، 1 ستمبر 2022

مغربی بنگال

میڈیا اور ادب

کولکاتا: شہر کولکاتا کے معروف علمی، ادبی، سماجی اور ادبی ادارہ مسلم انسٹی ٹیوٹ میں 20 اگست 2022 کو ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے اشتراک سے ایک روزہ قومی سمپوزیم 'میڈیا اور ادب' کا انعقاد ادارہ کے قادر نواز ہال میں کیا گیا۔ سمپوزیم کے پہلے دور میں محترم انوپم تیواری (ہندی اڈیٹر، ساہتیہ اکادمی) نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ مسلم انسٹی ٹیوٹ جیسے اداروں نے ملک کی تاریخ رقم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایسے ادارے میں آنا اور تقریب میں شرکت کرنا میرے لیے باعث فخر ہے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں ذرائع ابلاغ اور ادب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اردو زبان میں ان دونوں الگ شعبوں کے رشتے پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ آج اخبارات میں ادبی حصہ کم ہوتا جارہا ہے جس کی طرف توجہ دی جانی چاہیے۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی جنرل سکریٹری نثار احمد نے اپنی تقریر میں ساہتیہ اکادمی کی پوری ٹیم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اس تقریب کے لیے مسلم انسٹی ٹیوٹ کو اپنا تعاون پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد کاظم نے موضوع کے تحت کلیدی خطبہ پیش کرتے

ایک روزہ سمپوزیم 'میڈیا اور ادب'

ہوئے کہا کہ اس موضوع کے تحت سمینار منعقد کرانے کے لیے کولکاتا سے بہتر جگہ نہیں ہو سکتی کیونکہ اردو صحافت کی جائے آغاز کولکاتا ہی ہے اور یہیں قائم فورٹ ولیم کالج نے اردو ادب میں انقلاب آفریں تبدیلیاں لائیں۔ ڈاکٹر عشرت ناہید نے اپنی تقریر میں مسلم انسٹی ٹیوٹ کے ارباب حل وعقد کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایسے موضوع پر آج یہاں سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا ہے جو عصری تقاضا ہے۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے اپنے صدارتی خطبہ میں تمام مقررین کی گفتگو کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ آج میڈیا اور صحافت بازار کی شے بن چکے ہیں۔ آج ہم وہی سوچنے اور اس پر عمل کرنے پر مجبور ہیں جو میڈیا چاہتا ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر نعیم انیس نے پہلے دور کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا کہ آج کا دن مسلم انسٹی ٹیوٹ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہا ہے کہ ہمیں ملک کے اہم ادبی، لسانی و ثقافتی ادارے ساہتیہ اکادمی کے اشتراک سے 'میڈیا اور اردو' کے عنوان سے یک روزہ اردو سمپوزیم کا انعقاد کرنے میں کامیابی ملی۔ دوسرے دور کی صدارت ڈاکٹر دبیر احمد (صدر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج، کولکاتا) نے کی جب کہ کچھ مقالہ نگاروں ڈاکٹر درخشاں زریں (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا)، ڈاکٹر امتیاز وحید (صدر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی)، ڈاکٹر شمشیر عالم (اسسٹنٹ پروفیسر، ٹی ڈی بی کالج، رانی گنج)، ڈاکٹر رضی شہاب (اسسٹنٹ پروفیسر ویسٹ بنگال یونیورسٹی، باراسات)، محترمہ شیریں ظفر (لیکچرر، شعبۂ اردو، کلکتہ گرلس کالج) اور شاہد اقبال ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا نے اس دور میں اپنے مقالے پیش کیے۔ تمام مقالوں کا سیر حاصل جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر دبیر احمد نے کہا کہ میڈیا اور ادب ایسا موضوع ہے جس کے تحت ایک دور میں چھ سات مقالے پیش کرتے ہوئے تقریب منعقد کی جاسکتی ہے مگر بات مکمل نہیں ہوگی۔ میڈیا اور ادب کے رشتوں میں بڑھتی دوری پر انھوں نے نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ پرانی نسلوں کے لوگ اپنے بچوں کو اخبارات پڑھنے کی تاکید کرتے تھے تاکہ ان کی زبان درست ہو سکے، لیکن موجودہ دور کے اخبارات پڑھنے سے زبان درست ہونے کے بجائے بگڑنے کا خدشہ ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ معاصر صحافی حضرات ادب کے سنجیدہ طالب علم نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ صحافیوں کی تربیت کی جائے تاکہ میڈیا اور ادب کا رشتہ پھر سے مضبوط و مستحکم ہو سکے'' اس دور کی نظامت ڈاکٹر جاوید اختر (اعزازی لٹریری سکریٹری، دی مسلم انسٹی ٹیوٹ) نے کی جب کہ اظہار تشکر ڈاکٹر نعیم انیس نے کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اگست 2022

حسین الحق: حیات وخدمات

آسنسول: آسنسول بنواری لعل بھلوٹیاں کالج میں ریاستی اردو اکیڈمی کے اشتراک و باہمی تعاون سے 'حسین الحق: حیات و خدمات' کے عنوان سے دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح پرنسپل ڈاکٹر امیتابھ بسو نے اپنے افتتاحی کلمات سے کیا۔ کلیدی خطبہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی کے سی آئی ایل کے سابق چیئرمین ڈاکٹر انور پاشا نے پیش کیا۔ ڈاکٹر انور پاشا نے اپنی گفتگو کا آغاز وسیع تناظر میں کیا اور کہا کہ الگ الگ فنکار اور تخلیق کار کی انفرادی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ اپنے اندر کی کائنات کو اپنے اپنے انداز میں پیش کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فنکار کے آب و گل کی کائنات یکساں ہو سکتی ہے لیکن فنکار کے فن کو اس کے عہد اور زاویہ نظر کے تناظر میں ہی دیکھا جانا چاہیے۔ انھوں نے حسین الحق کو ایک حساس فنکار قرار دیا جن کے اندر قاری کو روح اور ضمیر کو زندہ رکھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس میں اپنے تاثرات رکھتے ہوئے ویرکنور سنگھ یونیورسٹی آرہ کے پروفیسر ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد نے اظہار تاسف کیا کہ اہل بہار نے حسین الحق کی خدمات کو فراموش کر دیا اور آٹھ ماہ ہو چکا ان کی رحلت کو لیکن پورے بہار میں نہ ہی کسی رسالے میں کوئی گوشہ شائع ہوا اور نہ ہی کسی اکیڈمی یا کالج یا یونیورسٹی نے ان کو خراج پیش کرنے کے لیے کوئی سمینار یا ادبی پروگرام منعقد کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے ریاستی اردو اکیڈمی (مغربی بنگال) اور آسنسول بی بی کالج (بنواری لعل بھلوٹیا کالج) میں باہمی اشتراک وتعاون سے حسین الحق حیات و خدمات پر سیمینار کا انعقاد کرنے کے لیے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر مشکور معینی کو مبارکباد پیش کی۔ افتتاحی اجلاس میں ویرکنور سنگھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر جمیل احمد مجبی نے بھی حسین الحق کی حیات و خدمات پر اپنے تاثرات رکھے۔ افتتاحی دور کے صدر ڈاکٹر دامودر مشرا وائس چانسلر ریاستی ہندی یونیورسٹی نے صدارتی خطبہ پیش کیا اور دو روزہ سمینار کے افتتاح کا اعلان کیا۔ نظامت ڈاکٹر مشکور معینی نے کی۔ بعدازاں پہلا اجلاس شروع ہوا جس کی مشترکہ صدارت پروفیسر انور پاشا، پروفیسر سید شاہ حسین احمد اور نذیر احمد یوسفی نے کی۔ نظامت کی ذمے داری ڈاکٹر جمشید احمد صدر شعبہ اردو آسنسول بدھان چندر کالج نے کی جب کہ پروفیسر

زین رامش (ونو بھاوے یونیورسٹی)، ڈاکٹر دبیر احمد، ڈاکٹر ارشاد شفیق اور ڈاکٹر تسلیم عارف وغیرہ نے مختلف عنوانات کے تحت اپنے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' بنگال، 25 اگست 2022

اردو ادب اور ہندوستانی فلم

کولکاتا: پروفیسر مشہور ڈراما نگار محمد کاظم نے برابورن کالج میں مغربی بنگال اردو اکادمی کے اشتراک سے 'اردو ادب اور ہندوستانی فلم' پر منعقدہ دو روزہ قومی سمینار کی

افتتاحی تقریب میں توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ پہلے کی فلموں میں سماجیات ہوتی تھیں، اس لیے انھیں پورا سماج دیکھتا تھا، آج بھی پرانی فلموں کے تھیم، موسیقی، مکالمے اور نغمے لوگوں کو یاد ہیں، جب کہ آج کی فلمیں نہ صرف تجارت یعنی مادیت پر مبنی ہیں بلکہ وہ اردو ادب کو مجروح کرتی ہیں۔ پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کہا کہ فلموں کا اردو سے اٹوٹ رشتہ ہے، اردو اور فلمیں لازم وملزوم ہیں۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر سیولی سرکار نے کہا کہ جب ہم ہندوستانی فلم کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہندی اور اردو کا حسین امتزاج ہے۔ اردو نے برسہا برس فلموں میں ثابت قدمی سے کردار ادا کیا ہے۔ فلمیں ادبی خزانے سے بھری رہی ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شبانہ نسرین کی کتاب 'فکرو شعور' کا اجرا پروفیسر خالد محمود سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کیا جب کہ 'اردو میں سماجی مسائل کی عکاسی' کی رسم رونمائی پروفیسر سیولی سرکار نے انجام دی۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر خالد محمود نے کی، جب کہ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے نظامت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خواجہ نسیم اختر، ڈاکٹر محمد شکیل اختر، عرفان عارف، ڈاکٹر اندرانی چودھری، ڈاکٹر شریمتی مکھر جی کے علاوہ شعبہ کے طلبہ وطالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 ستمبر 2022

اعزاز و اکرام

ساہتیہ اکادمی بال ساہتیہ پرسکار اور یووا پرسکار 2022

نئی دھلی: 24 اگست 2022: ساہتیہ اکادمی کے صدر ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں اکادمی کی ایکزیکیٹو

بورڈ کی بیٹھک ہوئی جس میں اکادمی کے ذریعہ منظور شدہ 24 زبانوں میں بال ساہتیہ پرسکار 2022 اور یووا پرسکار 2022 کی منظوری دی گئی۔ بال ساہتیہ پرسکار ادب اطفال پر بہترین کاوش کے لیے دی جاتی ہے جبکہ یووا پرسکار 35 سال سے کم عمر کے نوجوان ادیبوں کو دیا جاتا ہے۔ دونوں ایوارڈ میں بطور انعام 50 ہزار روپے، تمغہ اور توصیفی سند دیے جاتے ہیں۔ سال 2022 کے بال ساہتیہ پرسکار اردو کے مشہور ومعروف شاعر وادیب ظفر کمالی کو ان کے شعری مجموعہ 'حوصلوں کی اڑان' کے لیے دینے کا اعلان کیا گیا۔

دیگر انعام یافتگان میں دیگنت اوجا (آسامی)، جے متر (بنگالی)، دیوبار رام سیارے (بوڈو)، راجیشور سنگھ 'راجو' (ڈوگری)، عرشیہ ستار (انگریزی)، کیرتی گوسوامی (گجراتی)، چھما شرما (ہندی)، تمنا بیگارا (کنڑ)، قمر حمید اللہ (کشمیری)، جیوتی کنکلکر (کونکنی)، وریندر جھا (میتھلی)، ستیو (ایم ستیو مادھون) (ملیالم)، ناوریم لوکیشورے سنگھ (منی پوری)، سنگیتا بروے (مراٹھی)، بینا سبا (نیپالی)، نریندر پرساد داس (اڑیہ)، وشومتر دادھیچ (راجستھانی)، کلدیپ شرما (سنسکرت)، منوہر نہلانی (سندھی)، جی بینا کشی (تمل)، پٹّی پاکا موہن (تیلگو) شامل ہیں۔ اس سال پنجابی زبان میں کسی کو بھی انعام نہیں دیا جائے گا جبکہ سنتھالی ایوارڈ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

اردو میں یووا پرسکار کے لیے مقصود آفاق کو ان کے شعری مجموعہ 'گریہ' کا انتخاب کیا گیا جبکہ پردومن کمار گوگوئی (آسامی)، سمن پتاری (بنگالی)، المبار موساہاری (بوڈو)، آشو شرما (ڈوگری)، مہر وتس (انگریزی)، بھرت کھینی (گجراتی)، بھگونت انمول (ہندی)، دادی پیر جیمن (کنڑ)، شائستہ خان (کشمیری)، مائرن جیسن باریٹو (کونکنی)، نوکرشن ایبک (میتھلی)، انگھا جے. کولاتھ (ملیالم)، سونیا کھندرکپم (منی پوری)، روشن رائے 'چوٹ' (نیپالی)، دلیپ بیہرا (اڑیہ)، سندھو گگن (پنجابی)، آشیش پروہت (راجستھانی)، شروتی کنٹکر (سنسکرت)، سالگے ہانسدا (سنتھالی)، حنا آسوانی (سندھی)، پی. کالی موتھو (تمل)، پلی پٹو ناگ راجو (تیلگو) کے نام دیگر انعام یافتگان میں شامل ہیں۔ مراٹھی زبان میں ایوارڈ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

پریس ریلیز: موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 24 اگست 2022

حکیم سید احمد خان

تمل ناڈو: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس صوبہ تمل ناڈو کے پرنم بٹ شہر ویلور میں یوم آزادی کے 75 ویں امرت مہوتسو

کے موقعے پر پروگرام حکیم رضی الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ انھوں نے صدارتی خطاب میں کہا کہ طب یونانی کے فروغ میں آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کی سرگرمیاں قابل رشک ہیں۔ اس پروگرام میں دہلی سے آئے ہوئے یونانی ڈاکٹروں کی ٹیم کو اعزازیہ دیا گیا۔ ٹیم میں ڈاکٹر سید احمد خان (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر سی سی آر یو ایم و آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے سکریٹری جنرل)، حکیم عطاء الرحمٰن اجملی، حکیم آفتاب عالم اور محمد عمران قنوجی، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس صوبہ تمل ناڈو کے سرپرست اعلیٰ حکیم ناصر الدین احمد نے کہا کہ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے تحت چلائے جانے والے پروگرام قابل ستائش ہیں۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے معروف ومشہور حکیم سید احمد خان نے شرکت کی اور حاذق الامت حکیم ذکی الدین احمد ایوارڈ و حاذق طب اعزاز سے نوازا گیا۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس صوبہ تمل ناڈو کی کارکرگی اطمینان بخش ہے۔ پروگرام میں شامل اہم شخصیات میں ڈاکٹر وسیم احمد، ڈاکٹر الیس کے ایل حمید الدین، ڈاکٹر عزیز الدین، ڈاکٹر امتیاز پاشا، ڈاکٹر ابرار، ڈاکٹر عمران، مولانا امجد، اجیت کمار وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخر میں تمام شرکا کا شکریہ ڈاکٹر کے رفیع الدین نے کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اگست 2022

ڈاکٹر عمار نگرامی، ڈاکٹر مسیح الدین خان
جاوید آزاد، ساجدہ خاتون اعزاز سے سرفراز

لکھنؤ: پرکاش پربھاؤ نیوز لکھنؤ کی جانب سے رگھو پتی سہائے فراق گورکھپوری کی پیدائش کے موقع پر پرکاش پربھاؤ نیوز چینل کے صدر دفتر نزد کالی باڑی مندر لال باغ میں ایک ادبی پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں نمایاں سماجی خدمات کے لیے آل انڈیا مسلم انٹلیکچول سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عمار نگرامی، ادبی وسماجی کارکن ڈاکٹر مسیح الدین خان کو ادبی و سماجی میدان میں اہم خدمات کے لیے، تعلیمی خدمات کے لیے کریسینٹ ماٹیسری اسکول کے مینیجر جناب جاوید آزاد، اور تعلیم کے میدان میں محترمہ ساجدہ خاتون کو ان کی نمایاں خدمات کے عوض خصوصی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس سے قبل گروپ ایڈیٹر عظمت اللہ خان نے سبھی مہمانوں کا استقبال کیا۔ انھوں نے کہا کہ ٹیم پرکاش پربھاؤ نیوز وقتا فوقتا ایسی شخصیات کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اعزاز سے سرفراز کرتی رہتی ہے۔ اس موقعے پر بحیثیت مہمان خصوصی انجمن اصلاح المسلمین کے سکریٹری اطہر نبی ایڈوکیٹ نے کہا کہ فراق نے شاعری اور تنقید کے میدان میں جو سنگ میل قائم کیا اسے حاصل کرنے کے لیے ایک دور چاہیے۔ وہ بطور شاعر اور ناقد ہندی اردو

دونوں زبانوں میں یکساں مقبولیت کے حامل ہیں۔ ان کی غزل گوئی نے اردو شاعری کو ایک فرحت بخش مقام دیا ہے۔ ڈاکٹر عمار نگرامی نے پرکاش پربھاؤ نیوز کے گروپ ایڈیٹر عظمت اللہ خان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انھیں خوشی ہے کہ ان کے سماجی کاموں کو سراہا جا رہا ہے۔ جناب جاوید آزاد نے کہا کہ انھیں اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ پرکاش پربھاؤ نے تعلیمی میدان میں ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اس اعزاز نے انھیں مستقبل میں اور بھی لگن سے کام کرنے کا جذبہ عطا کیا ہے۔ اس پروگرام میں رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے ادبی و شعری امتیازات پر تفصیل سے گفتگو کی گئی۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر یاسر انصاری نے بھی شرکت کی۔ محترمہ ساجدہ خاتون نے سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: میڈیا انچارج، پرکاش پربھاؤ نیوز لکھنؤ، 30 اگست 2022

رسم اجرا

ہندوستان اردو شاعری کے حوالے سے

نئی دہلی: خسرو فاؤنڈیشن اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے اشتراک سے ڈاکٹر عمیر منظر کی مرتب کتاب 'ہندوستان اردو شاعری کے حوالے سے' کی تقریب رسم اجرا کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے شرکت کی جب کہ صدارت جشن ادب کے بانی کنور رنجیت سنگھ چوہان نے کی۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے کتاب کے بارے میں کہا کہ ہم اردو شاعری کو غزل کے حوالے سے ایک خاص تناظر میں جانتے ہیں مگر اس کتاب کے ذریعے ایسے ہندوستان کو دکھایا گیا ہے جس میں بے شمار زبانیں، بے شمار مذاہب، طرح طرح کے لوگ ہیں ان سب کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو شاعری کے حوالے سے ہندوستان کے اصل چہرے کو دیکھ سکیں۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ہم وطن سے محبت کی بات کرتے ہیں تو صرف سرزمین ہندوستان سے محبت کی بات نہیں کرتے بلکہ اس میں پائی جانے والی ملی جلی تہذیب، اور اس کے دائرے میں آنے والی تمام چیزوں سے ہم محبت کرتے ہیں۔ نظامت کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہندی زبان کی تاریخ مسلمانوں کے ناموں کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی، مثلاً رس کھان، جائسی، رحیم اور نئے زمانے میں اصغر وجاہت کو دیکھیں جسے ہندی کا سب سے بڑا سمان 'ویاس' سے سرفراز کیا گیا ہے، ان کے علاوہ شامی، پرویز، عبدل بسم اللہ ہیں اسی طرح زبان کی تاریخ ہندی ادبا، شعرا، محققین، تبصرہ نگاروں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ کنور رنجیت سنگھ چوہان نے خسرو فاؤنڈیشن اور کتاب کو مرتب کرنے والے عمیر منظر کو مبارک باد پیش کی۔ آخر میں شکریہ کی تحریک پیش کرتے ہوئے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے کہا کہ ہمارے وطن میں مختلف زبانیں اور مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں، یہ کوئی چھوٹا سا ایک ملک نہیں ہے بلکہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ اس موقعے پر رنجن مکھرجی، روہت کھیڑا، پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر شاہ عالم، خالد مبشر سمیت بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 ستمبر 2022

بارود اور کونپل

میرٹھ: عارف نقوی کے افسانے صرف افسانے نہیں بلکہ تاریخ کا حصہ ہیں۔ انسان کو سمجھنے کے لیے تاریخ نہیں ادب کی ضرورت ہے۔ عارف نقوی کے افسانوں میں اگر لکھنؤ کی گلی کا ذکر آتا ہے تو لگتا ہے قاری خود لکھنؤ کی گلیوں کی سیر کر رہا ہے۔ یہ الفاظ تھے جرمنی کے پروفیسر اسلم سید کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیراہتمام منعقد 'پروفیسر اسلم جمشید پوری کی مرتب کردہ کتاب 'بارود اور کونپل' کا اجرا کے پروگرام میں اپنی صدارتی تقریر میں آن لائن ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ عارف نقوی کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے جرمنی میں اردو ادب کی شمع جلانے کا کام کیا۔ اس ادب نما پروگرام کی سرپرستی معروف ادیب عارف نقوی، جرمنی نے فرمائی۔ جب کہ مہمان خصوصی کے بطور معروف ناقد پروفیسر شارب ردولوی، لکھنؤ اور سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر صغیر افراہیم نے آن لائن شرکت کی۔ مقررین کے بطور دہلی یونیورسٹی سے پروفیسر محمد کاظم، پاکستان سے ڈاکٹر صفدر رشید، لندن سے محترم فہیم اختر، جموں و کشمیر سے ڈاکٹر عرفان عارف اور لکھنؤ سے آیوسا کی صدر ڈاکٹر ریشما پروین شریک رہے۔ تعارف ڈاکٹر آصف علی، استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر صاحب کتاب پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو افسانے نے تقریباً 120 سال کا سفر مکمل کرلیا ہے۔ مختلف نشیب و فراز سے گزر کر اب اکیسویں صدی میں ترقی کی نئی منازل طے کر رہا ہے۔ اس صدی میں جہاں افسانے کو نئے موضوعات ملے ہیں وہیں افسانے کی ہیئت میں بھی کچھ تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ آج اردو افسانہ حقیقت پسندی، رومان پسندی، ترقی پسندی، تقسیم کا المیہ، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور اب نئی صدی میں دلت ڈسکورس اقلیتی ڈسکورس کی بنا پر پھر مقبول ہو رہا ہے۔ عارف نقوی کی پوری شخصیت پر نظر ڈالی جائے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے پوری زندگی ترقی پسندی کی نشر و اشاعت میں لگا دی اور جہاں تک آپ کے افسانوں کا تعلق ہے ان میں بھی ترقی پسند نظریہ عیاں ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 اگست 2022

رام پرکاش کے خطوط بنام اظہر نیر

دربھنگہ: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیراہتمام 7 جولائی 2022 کو ڈاکٹر عبدالحی (اسسٹنٹ پروفیسر سی ایم

کالج دربھنگہ) کی رہائش گاہ پر ڈاکٹر احسان عالم کی کتاب 'رام پرکاش کے خطوط بنام اظہر نیر' کی تقریب اجرا کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر عبدالمنان طرزی نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر منصور خوشتر نے

انجام دیے۔ کتاب پر اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے پروفیسر طرزی نے کہا کہ رام پرکاش کے خطوط معروف شاعر اور افسانہ نگار اظہر کے نام تحریر کیے گئے ہیں۔ ان سارے خطوط کو ڈاکٹر احسان عالم نے یکجا کر کے کتابی صورت عطا کی ہے۔ اس کتاب میں رام پرکاش کپور کے 105 خطوط شامل ہیں۔ زیادہ تر خطوط ادبی نوعیت کے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحی نے کتاب کے متعلق کہا کہ خطوط کی روایت اب ختم ہو رہی ہے۔ اس جگہ ای میل، وہاٹس ایپ، فیس بک اور انسٹاگرام وغیرہ نے لے لی ہے۔ اظہر نیر نے رام پرکاش کپور کے خطوط کو لمبے عرصے تک اپنے پاس جمع کر کے رکھا۔ ان تمام خطوط کو ڈاکٹر احسان عالم نے سجا سنوار کر کتابی صورت عطا کی ہے۔ کتاب کی اشاعت کے لیے ڈاکٹر احسان عالم اور بزرگ شاعر اظہر نیر صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ انور آفاقی نے خطوط نگاری کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ جو لطف خطوط میں پنہاں ہے وہ ای میل اور وہاٹس ایپ پر ارسال کیے گئے میسج میں نہیں ہے۔ اس لیے اس روایت کو زندہ رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے دیرینہ دوست اظہر نیر صاحب کو دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد پیش کی۔ سید محمود احمد کریمی نے بھی کتاب سے متعلق مختصر گفتگو پیش کی۔ ڈاکٹر منصور خوشتر نے کہا کہ خطوط کی اہمیت واقعی اپنی جگہ مسلم ہے۔ وقتاً فوقتاً کچھ ادیب خطوط کو یکجا کر کے کتابی صورت دیتے رہتے ہیں۔ اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اظہر نیر اور ڈاکٹر احسان عالم نے خطوط نگاری کے سلسلہ کو آگے بڑھانے کا کام کیا ہے۔

پریس ریلیز: دربھنگہ ٹائمز، دربھنگہ، 7 اگست 2022

سوانح خواجگان چشت

اجمیر شریف: 'سوانح خواجگان چشت' کی رسم اجرا 27 اگست کو دارالخیر بدرگاہ غریب نواز اجمیر میں واقع شاہی شاہجہانی مسجد کے صحن میں عمل میں آئی۔ رسم اجرا کی سرپرستی شاہ مشاہد اصدق نے، صدارت شاہی امام و خطیب شاہجہانی مسجد علامہ محمد توصیف احمد صدیقی میرٹھی نے جب کہ حضرت غریب نواز کے منظور نظر خادم آستانہ وکیل اشرفی بیت النور کے مسند نشیں سید مہدی میاں نے رسم اجرا کا انعقاد اور کتاب کا تعارف پیش کیا۔ رسم اجرا کی تقریب میں بحیثیت مہمان خصوصی مولانا خالد ایوب مصباحی شیرانی، وکیل اصدقی و خادم آستانہ سید محمد فائق چشتی کاظمی عرف شارق زیاں اجمیری، خادم آستانہ خلیق چشت سید فرید چشتی اجمیری، محقق دوراں مولانا محمد ظفر الدین (مدیر اعلیٰ کنزالایمان دہلی)، صدر المدرسین مولانا امجد رضا (دارالقلم دہلی) وغیرہم نے اپنی گراں قدر آرا اور اعترافی کلمات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مصنف کتاب شاہ اشتیاق ایوبی سجادہ نشیں خانقاہ چشتیہ فریدیہ اصدقیہ شہر امام نیم صدر عالمی صوفی مشن دہلی صرف مصنف ہی نہیں بلکہ بیباک صحافی اور وکیل بھی ہیں۔ ہمارے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ حضرات اولیا چشت کی منفرد و امتیازی حیات و خدمات اور تذکار و سوانح پر مشتمل کتاب کی بارگاہ غریب نواز میں تقریب رسم اجرا میں شریک ہو رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ کتاب نہ صرف وقت کی اہم ضرورت ہے بلکہ درون کتاب درج ذکر و مضامین کے حوالے سے چشتی ادب اور تذکار چشت کے باب میں ایک قابل قبول عمدہ اضافہ ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 اگست 2022

کھیل کھیل میں

نئی دہلی: دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین حاجی تاج محمد کے ہاتھوں، بچوں کی کہانیوں کی کتاب 'کھیل کھیل میں' کا اجرا عمل میں آیا، جس میں صحافی ڈاکٹر محمد بلال، ڈاکٹر اسد رضا، ڈاکٹر اقبال غوری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن، پروفیسر ایم۔اے عزیز اور ضمیر اللہ وغیرہ موجود تھے۔ اس کتاب کی مصنفہ ثنا اسد ہیں جو معروف صحافی، شاعر و ادیب ڈاکٹر اسد رضا کی چھوٹی بیٹی ہیں اور درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 اگست 2022

ایران کلچر ہاؤس کی تازہ نشریات

نئی دہلی: ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی میں 82 ویں انجمن بیدل دہلوی کا انعقاد ہوا جس میں ہند و ایران کے سرکردہ فارسی اساتذہ طلبا اور محققین نے شرکت کی۔ واضح رہے کہ مذکورہ پروگرام میں ادارے کی حالیہ نشریات کا اجرا عمل میں آیا۔ ان کتابوں کے نام اس طرح ہیں: فردوسی و شعرا کا ہندی ترجمہ فردوسی اور کویتا سنسار، مترجم محشر کمال اڈیٹر پروفیسر اخلاق آہن صاحب ستیش ول کے ہندی شعری مجموعہ کا فارسی ترجمہ: برگ ھای گم شدہ، مترجم: ڈاکٹر ابراہیم وانی 'طوطی' سعدی فاؤنڈیشن کے ذریعے اشاعت یافتہ برصغیر کے لوگوں کے لیے خصوصی طور پر آموزش زبان فارسی پر مشتمل کتاب جسے رضا صحرائی نے تالیف کیا ہے۔ واضح رہے کہ اس موقع پر ڈاکٹر علی ربانی کلچرل کاؤنسلر جمہوری اسلامی ایران، ڈاکٹر شکر اللٰہی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر بلقیس حسینی، پروفیسر قمر غفار، پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر اخلاق آہن، پروفیسر علیم اشرف خان، ڈاکٹر کلیم اصغر، ڈاکٹر محسن، ڈاکٹر زہرہ اور دیگر فارسی اسکالر موجود رہے۔ نظامت کے فرائض مہدی باقر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 ستمبر 2022

نقوش کہکشاں

مظفر نگر: عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ) کا سالانہ مجلّہ 'نقوش کہکشاں' کے اجرا کی تقریب کا انعقاد مظفر نگر کے انس نصیر انٹر کالج میں ہوا۔ تقریب میں تحسین علی اساروی مہمان خصوصی و ڈاکٹر سلیم سلمانی مہمان مکرم رہے۔ ان کے علاوہ اس موقعے پر مظفر نگر کی مشہور سماجی اور علمی شخصیات موجود رہیں۔ رسم اجرا جناب تحسین علی اساروی، گلفام احمد، پرنسپل انس خان، ڈاکٹر سلیم سلمانی، شمیم قصار، وتسیر چودھری کے ہاتھوں کیا گیا۔ اس موقعے پر عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر و اے اینڈ فارمیسی کے مینیجر جناب حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے کہا کہ یہ سلسلہ پچھلے 10 سالوں سے جاری ہے۔ انھوں نے کہا کہ تنظیم کا مقصد صحت مند سماج بنانا، تعلیمی پسماندگی دور کرنا، اردو زبان کا فروغ کرنا و غریبی ختم کرنے کے وسائل مہیا کرانا ہے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی تحسین علی اساروی نے حکیم عطاء الرحمٰن اجملی کو مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ یہ سفر یوں ہی جاری رہے گا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 4 ستمبر 2022

وفیات

پروفیسر بی شیخ علی

میسور: نابغہ روزگار، معروف مورخ اور منگلور و گوا یونیورسٹیوں کے سابق وائس چانسلر پروفیسر بی شیخ علی کا میسور کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں مختصر علالت کے بعد 4 ستمبر کو انتقال ہو گیا۔ وہ 97 سال کے تھے۔ پروفیسر علی کی نماز جنازہ سرسوتی پورم کے مسلم ہاسٹل کمپلیکس کی مسجد میں ادا کی گئی۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا، ایک بیٹی اور لواحقین، دوست احباب اور دیگر پسماندگان شامل ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر محمد سجاد کے مطابق شہر میسور

سے تعلق رکھنے والے مشہور دانشور پروفیسر شیخ علی نے 1954 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور 1960 میں لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے 1986 میں انڈین ہسٹری کانگریس کے 47 ویں اجلاس کی صدارت کی۔ مسٹر علی کرناٹک ہسٹری کانفرنس کے بانی صدر بھی تھے۔ انھوں نے سلطان شہید ایجوکیشنل ٹرسٹ، میسور کے زیراہتمام میسور کے رادھا کرشنا نگر میں سلطان شہید کے نام سے ایل کے جی سے ڈگری کالج اور ٹیچرز ٹریننگ کالج تک اداروں کا ایک سلسلہ قائم کیا، اس میں لڑکیوں کے لیے ہاسٹل اور معذور بچوں کے لیے ایک اسکول بھی شامل تھا۔ پرسارنگا، میسور یونیورسٹی کے پبلی کیشن ڈویژن نے ان کی تصنیف اور تالیف کردہ تاریخ کی کئی کتابیں شائع کیں۔ ان میں جنوبی ہند کی تاریخ بھی شامل ہے۔ عالمی تہذیب کی مختصر تاریخ، ہندوستانی ثقافت کے لوازمات، ہوئیسالہ خاندان اور تالکاڈ کی گنگا بھی ان کی کتابیں ہیں۔ 2013 میں کرناٹک اسٹیٹ گزیٹیئر نے ان کی کتاب 'ٹیپو سلطان: کروسیڈر فار چینج' شائع کی۔ یہاں تک کہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے 'ترجمان القرآن' اور شاعر علامہ اقبال کے 'جاوید نامہ' کا بھی ترجمہ کیا۔ گزشتہ کچھ برسوں میں ان کی کتابوں میں سے ایک 'سر مرزا اسماعیل۔ دیوان آف میسور' کی سوانح عمری بھی شامل ہے۔ 2013 میں نلواڑی کرشنا راجا ووڈیار کی بایوگرافی کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی، میسور نے شائع کی تھی۔ خیال رہے کہ میک ملن کمپنی نے 1978 میں ان کی کتاب 'ہسٹری: اٹز تھیوری اینڈ میتھڈ' شائع کی تھی۔ کنڑ یونیورسٹی، ہمپی، کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی، میسور، تمکور یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف میسور کی جانب سے انھیں (اعزازی طور پر) ڈی لٹ سے نوازا گیا۔ ان کی تصنیف کردہ 55 کتابوں میں سے 12 کتابیں اردو میں ہیں۔ انھیں ہیومینیٹیز میں تحقیق کے لیے میسور یونیورسٹی نے 'راجیوتسوا ایوارڈ' اور 'گولڈن جبلی ایوارڈ' سے نوازا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 ستمبر 2022

پروفیسر اصغر عباس

علی گڑھ: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد اور سابق صدر شعبہ، ماہر سرسید پروفیسر اصغر عباس کا 7 ستمبر بروز بدھ کو شام ساڑھے پانچ بجے تقریباً 80 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کا آبائی وطن گورکھپور تھا۔ ان کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں 2020 میں اردو اکادمی اتر پردیش نے انھیں مولانا آزاد ایوارڈ سے نوازا تھا۔ وہ

تقریباً 17 کتابوں کے مصنف و مولف تھے۔ گورکھپور میں 1942 میں ان کی پیدائش ہوئی اور یہیں ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ پروفیسر محمود الٰہی انھیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ریسرچ کے لیے وہ علی گڑھ آئے تو یہاں سرسید کی صحافت کے موضوع پر آل احمد سرور کی نگرانی میں اپنی پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کیا اور 2 ستمبر 1974 کو یہیں لیکچرر ہوگئے جس کے بعد وہ ریڈر اور پروفیسر ہوئے اور 16 جون 1999 کو صدر شعبہ ہوئے جن کی نگرانی میں متعدد کامیاب سمینار ہوئے۔ پروفیسر اصغر عباس کے مطالعے کا محور سرسید رہے۔ سرسید کے مطالعہ اور ان سے انہاک کی بنا پر انھیں 'ماہر سرسید' بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی کتابیں سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، سرسید کی تعزیتی تحریریں، شذرات سرسید، سرسید کی صحافت اور سرسید کا سفرنامہ مسافران لندن، سرسید، اقبال اور علی گڑھ اور ضیابار افراد کے خطوط بنام اصغر عباس کافی اہم تصور کی جاتی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 ستمبر 2022

مولانا سید جلال الدین عمری

نئی دہلی: ممتاز عالم دین و سابق امیر جماعت اسلامی ہند اور درجنوں اہم دینی کتابوں کے مصنف مولانا جلال الدین عمری کا 26 اگست کی شب طویل علالت کے بعد انتقال

ہوگیا۔ وہ گذشتہ کئی روز سے الشفا ہسپتال میں داخل تھے، 26 اگست کی شب تقریباً 8 بج کر 30 منٹ پر انھوں نے آخری سانس لی۔ ان کی نماز جنازہ صبح دس بجے مرکز جماعت اسلامی ہند، دعوت نگر ابوالفضل میں ادا کی گئی، جب کہ تدفین شاہین باغ قبرستان میں ہوئی۔ مولانا جلال الدین عمری کی ولادت 1935 میں تمل ناڈو کے ضلع شمالی آرکاٹ کے ایک گاؤں پتگرم میں ہوئی، والد کا نام سید حسین تھا، وہ 87 برس کے تھے۔ مولانا کا شمار عصر حاضر کے بڑے علما میں ہوتا تھا، فی الوقت جماعت اسلامی ہند کی شریعہ کونسل کے چیئرمین تھے۔ 50 سے زائد کتابوں کے مصنف و بہترین مقرر تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی کے اسکول میں حاصل کی۔ پھر عربی تعلیم کے لیے جامعہ دارالسلام عمرآباد میں داخلہ لے کر 1954 میں فضیلت کا کورس مکمل کیا۔ اسی دوران مدراس یونیورسٹی کے امتحانات بھی دیے اور فارسی زبان و ادب کی ڈگری 'منشی فاضل' حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے (انگلش) پرائیویٹ سے پاس کیا۔ لگاتار تین میقات جماعت اسلامی ہند کے امیر رہے۔ پہلی بار 2007 میں ان کا بطور امیر جماعت اسلامی ہند انتخاب ہوا۔ اس سے قبل نائب امیر کی ذمے داری نبھائی تھی۔ آپ کا وطنی تعلق تمل ناڈو سے تھا لیکن زندگی کا بڑا حصہ شمالی ہند میں گزرا۔ مولانا مرحوم نے جہد و عمل سے بھرپور زندگی گزاری اور زندگی بھر انسانوں کو اپنی ذات سے فیضیاب کرتے رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اگست 2022

نسیم محمد جان

دربھنگہ: معروف فکشن نگار نسیم محمد جان کا 6 ستمبر بروز منگل دن کے ایک بجے دربھنگہ کے محلّہ چک رحمت میں واقع پروفیسر ایم نہال کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ ان کی

عمر 88 برس تھی۔ وہ گذشتہ کچھ دنوں سے علیل تھے۔ بنیادی طور پر وہ موتیہاری کے رہنے والے تھے اور گذشتہ تقریباً 20 برس سے اپنی بیٹی کے یہاں دربھنگہ میں مقیم تھے۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں ہیں۔ 6 ستمبر کو ہی بعد نماز عشا ان کی تجہیز و تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ محلّہ چک رحمت مسجد کے پاس ادا کی گئی اور بھیگو کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ حافظ منصور نے پڑھائی۔ جنازہ میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی دعائے مغفرت کی۔

واضح رہے کہ نسیم محمد جان فکشن نگار تھے۔ وہ افسانے اور افسانچے لکھتے تھے۔ 'گھڑی کی سوئیاں' ان کے افسانوں اور 'پل دو پل' افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں منظر عام پر آکر پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ وہ غالب

سے متاثر تھے۔ عصر حاضر کے ادبا و شعرا میں مہندر سنگھ بیدی، وہاب اشرفی، شفیع جاوید اور علیم اللہ حالی سے ان کی قربت رہی ہے۔ وہ نیک طبیعت اور خلیق انسان تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 ستمبر 2022

رحیم الدین کمال

حیدر آباد: دکن کی معروف ادبی ملی اور ماہر اقبالیات سے موسوم شخصیت جناب ڈاکٹر رحیم الدین کمال ولد محمد

اسماعیل مرحوم کا بعمر 99 سال 21 اگست کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم ڈاکٹر رحیم الدین کمال انگریزی روزنامہ انڈین ہاریزن کے مدیر اعلیٰ تھے۔ نماز جنازہ بعد نماز عصر مسجد رحمت عالم روڈ نمبر 10 بنجارہ ہلز میں ادا کی گئی۔ تدفین قبرستان درگاہ حضرت سید احمد بادیا فرسٹ لانسر میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' حیدر آباد، 22 اگست 2022

حبیب ہاشمی

ممبئی: کلکتے سے ملنے والی اطلاع کے مطابق دورِ حاضر میں اردو مشاعروں کے مقبول و ممتاز شاعر 80 سالہ حبیب ہاشمی 26 اگست کو انتقال کر گئے۔ حبیب ہاشمی 3 مارچ 1942 کو پیدا ہوئے تھے۔ وہ کلکتے کے ایک سرکاری اسکول میں

مدرس تھے۔ موصوف ادھر ایک مدت سے علیل تھے۔ گذشتہ 14 اگست کو ان کی حالت زیادہ بگڑی تو انھیں علاج و معالجے کے لیے کلکتے کے میڈیکل کالج میں داخل کیا گیا تھا جہاں صبح انھوں نے آخری سانس لی۔ حبیب ہاشمی کو اردو مشاعروں میں وقار واحترام سے سنا جاتا تھا۔ وہ نعت گوئی میں بھی اپنا تشخص رکھتے تھے۔ ان کی نعتوں کا ایک مجموعہ 'اک نور کی لکیر' شائع ہو چکا ہے، جبکہ غزلوں کی کتاب 'آرزوؤں کی ہری شاخ' اشاعت کے مرحلے میں ہے۔

ضیائے حق فاؤنڈیشن گروپ، 28 اگست 2022

مولانا محمود حسن حسنی ندوی

لکھنؤ: دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے استاذ اور عمدہ اہل قلم مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی کا انتقال ہوگیا۔ مولانا

مرحوم لکھنؤ میں 28 جمادی الاولی 1391ھ مطابق 22 جولائی 1971 کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ندوۃ العلما کے ایک مکتب میں حاصل کی، ابتدائی عربی درجات کی تعلیم مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی میں حاصل کرنے کے بعد ثانویہ اور عالمیت کی تکمیل دار العلوم، ندوۃ العلما سے کی۔ حدیث شریف کا دو سالہ کورس 1421ھ/ 1992 میں کیا اور پھر المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی کا ایک سالہ کورس کر کے مدرسہ ضیاء العلوم سے تدریس کا آغاز کیا اور دارِ عرفات، رائے بریلی میں تصنیف و تحقیق سے وابستگی اختیار کی۔ 2001 سے معاون ایڈیٹر کے طور پر پھر کچھ عرصہ بعد نائب مدیر کے طور پر تعمیرِ حیات سے وابستہ رہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں تاریخِ اصلاح و تربیت اور کئی دینی، علمی، دعوتی اور اصلاحی شخصیات کے تذکرے شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ ماہنامہ 'رضوان' لکھنؤ کے معاون مدیر اور دارِ عرفات، رائے بریلی کے ترجمان 'پیامِ عرفات' کی مجلسِ ادارت کے رکن بھی رہے۔

قندیل ڈاٹ کام، 23 جولائی 2022

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر

دیوبند: دارالعلوم وقف دیوبند کے استاذ اور معروف مصنف و انشا پرداز مولانا سید نسیم اختر شاہ قیصر کا 13 ستمبر

شام تقریباً چھ بجے انتقال ہوگیا۔ ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف کی وجہ سے وہ پچھلے دو ماہ سے صاحبِ فراش تھے۔ ان کی عمر تقریباً 60 سال تھی۔ مولانا مرحوم کی پیدائش 25 اگست 1962 کو دیوبند میں ہوئی، ان کے والد علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کے فرزندِ اکبر سید محمد ازہر شاہ قیصر تھے۔ انھوں نے تعلیم کی ابتدا دارالعلوم دیوبند سے کی، ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے اسلامیہ ہائی اسکول، دیوبند میں داخلہ لے لیا اور دسویں کا امتحان دیے بغیر 1976 میں دوبارہ دار العلوم دیوبند میں داخلہ لے کر 1981 میں درس نظامی کی تعلیم سے فارغ التحصیل ہوئے۔ اسکولی تعلیم کے دوران 1973 سے 1975 تک انھوں نے ادیب، ادیبِ ماہر اور ادیبِ کامل کی ڈگریاں حاصل کیں اور جامعہ دینیات سے 1976 سے 1978 کے دوران عالمِ دینیات، ماہرِ دینیات اور فاضلِ دینیات کی سند حاصل کی۔ پھر 1989-90 کے دوران ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی، آگرہ (آگرہ یونیورسٹی) سے ایم اے اردو کیا۔ مولانا 1989 سے تاحال دارالعلوم وقف دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔

انشا پردازی و تصنیف و تالیف سے انھیں خصوصی شغف تھا، جو انھیں اپنے والد، ماہنامہ 'دارالعلوم' کے مدیر سید ازہر شاہ قیصر سے وراثت میں ملا تھا۔ چنانچہ ان کی مضمون نگاری کی ابتدا جنوری 1973 میں تقریباً 13 سال کی عمر میں ہی ہوگئی، 1979 سے 1985 تک پندرہ روزہ اشاعت حق، دیوبند کے نائب مدیر اور 1985 سے 1996 تک اس کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔ 1983 میں اپنے والد سید محمد ازہر شاہ قیصر کی سرپرستی میں ماہنامہ طیب، دیوبند کے سب ایڈیٹر (معاون مدیر) ہوئے؛ بالآخر 1987 میں جب ماہنامہ طیب بند ہونے لگا تو اپنے سابقہ پندرہ روزہ اشاعت پر توجہ دی۔ ایک عرصے تک ماہنامہ ندائے دارالعلوم کی مجلسِ ادارت کے رکن رہے۔ اس کے علاوہ تقریباً چالیس سال سے ملک بھر کے پچاسوں ماہانہ، پندرہ روزہ اور ہفت روزہ رسائل و جرائد اور روزناموں میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ سوانح نویسی و خاکہ نگاری ان کا پسندیدہ موضوع تھا؛ چنانچہ انھوں نے سیکڑوں علمی، ادبی، دینی و سیاسی شخصیات پر مضامین تحریر کیے جو کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے، ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً دو درجن ہے جن میں میرے عہد کے لوگ، جانے پہچانے لوگ، اپنے لوگ، خوشبو جیسے لوگ، میرے عہد کا دارالعلوم، حرفِ تابندہ، خطبات شاہی، مقبول تقریری، سیرتِ رسول اللہؐ واقعات کے آئینے میں، اکابر کا اختصاصی پہلو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پچھلے سال اکتوبر میں بہ یک وقت ان کی سات کتابوں کا اجرا ہوا تھا۔ مولانا کا اسلوب بہت شگفتہ، سلیس اور دلچسپ تھا، ذاتی زندگی میں بھی مولانا بہت شستہ رو،

ملنسار اور حسن اخلاق سے لیس تھے۔ انھوں نے دیوبند میں طلبہ کو مضمون نویسی و انشا پردازی کی تربیت دینے کے لیے 'مرکز نوائے قلم' کے نام سے ایک ادارہ بھی شروع کیا تھا، جس کے ذریعے سیکڑوں طلبہ نے تحریر و تصنیف کی تربیت حاصل کی۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام (qindeelonline.com)، 11 ستمبر 2022

انور حسین

ممبئی: ممبئی سے شائع ہونے والے روزنامہ ہندوستان سے تین دہائیوں تک وابستہ رہے انور حسین کو ناریل واڑی قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ اس موقعے پر صحافت، ادب، سماجی اور سیاسی حلقوں سے وابستہ شخصیات نے شرکت کی۔ 55 سالہ انور حسین کے پسماندگان میں دو بیویاں اور دو بیٹے اور ایک بیٹی بھی ہے۔ ہندوستان کے ایڈیٹر سرفراز آرزو نے کہا کہ مرحوم انور حسین ایک مخلص اور ملنسار انسان تھے۔ انھوں نے 1980 کے عشرے میں روزنامہ ہندوستان میں ملازمت اختیار کی اور کہنہ مشق صحافی بن گئے۔ اس عرصے میں ممبئی کے متعدد اخبارات اردو ٹائمز، صحافت، روزنامہ سہارا میں بھی جزوی طور پر کام کیا اور ہندی اخبار دو بجے دوپہر، کھیر ٹائمز کے لیے بھی لکھتے تھے۔ وہ آخری دور میں دوبارہ ہندوستان سے جڑ گئے۔ انور حسین کے انتقال پر اردو جرنلسٹس ایسوسی ایشن، پترکار وکاس فاؤنڈیشن، ممبئی پریس کلب اور دیگر صحافتی تنظیموں نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 اگست 2022

عرفان دانش سکندری

رامپور: معروف بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر عرفان دانش سکندری کا 18 اگست رامپور میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ رامپور میں رہنے کے باوجود بین الاقوامی سطح پر شاعری کی دنیا میں دارالسرور رامپور کی بہترین نمائندگی کرتے تھے۔ آپ کو شاعری پر زبردست عبور حاصل تھا۔ آپ ملنسار، طبیعت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی پروگراموں کی جان اور شان ہوا کرتے تھے۔ ان کا قیام عرصہ دراز تک امریکہ میں بھی رہا اور اس ماحول کے اثرات بھی کہیں کہیں ان کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ امریکہ میں قیام کے دوران ہی ان کا شعری مجموعہ 'رقص غبار' شائع ہوا۔ عرفان دانش کی رحلت رام پور کی ادبی فضا کو سوگوار کرگئی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اگست 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر........................ بتاریخ........................ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تشریح البدن (جلد اوّل)

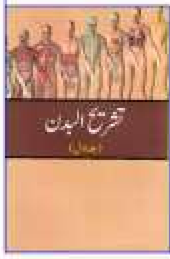

ادارہ

پہلی اشاعت:2022

صفحات:421

قیمت200روپے

تاریخ ابن خلدون (جلد سوم)

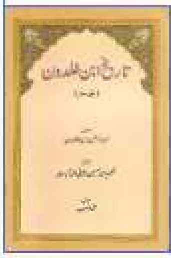

مصنف: عبدالرحمن ابن خلدون

مترجم: حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی،مرتب،محمد صہیب

پہلی اشاعت:2022

صفحات:436،قیمت:215روپے

کلیاتِ جوش (جلد چہارم)

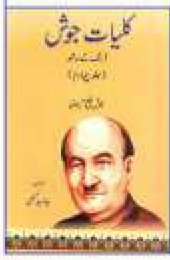

مرتب: جاوید نسیمی

پہلی اشاعت:2022

صفحات:704

قیمت:325روپے

ہندوستان میں اردو کی دستوری اور قانونی حیثیت

ترتیب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت:2022

صفحات:145

قیمت:100روپے

ولی دکنی

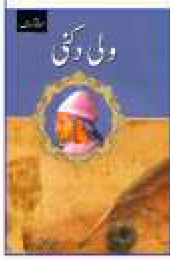

مصنف: عبدالحق

پہلی اشاعت: :2022

صفحات:148

قیمت:90روپے

تدریس جغرافیہ

مصنف: محمد ضیاء الدین علوی

تیسری طباعت:2022

صفحات:173

قیمت:105روپے

پھول بن

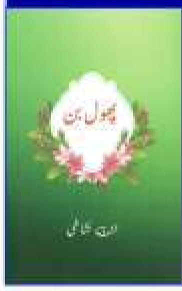

شاعر: ابن نشاطی

پہلی اشاعت:2022

صفحات:190

قیمت:115روپے

نیاز فتح پوری کی تحریریں (ایک مختصر انتخاب)

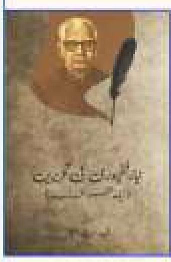

مرتب: ف س اعجاز

پہلی اشاعت:2022

صفحات:166

قیمت:100روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अक्तूबर-२०२२,वर्ष:२४, अंक:१०
URDU DUNIYA Monthly, October-2022, Vol.24, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/09/2022
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6